قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)



(2)

ضیا تسنیم بلگرامی

قصص الاولیاء

(اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور واقعات)



(2)

ضیا تسنیم بلگرامی

Compiled by

Abdul Basit

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

آگرے کا مجذوب

اشرف الاولیاء

امام ابوالعباس

جہانیاں جہاں گشت

چوتھے قیوم

حکیم الاولیاء

خلیفہ ابوالقاسم

دیو محل کا قلندر

روشن چراغ دہلی

سرخ شمشیر

سرمد شہد

سید عبداللّٰہ ولی

سیدی مولہ

شمع صوفیاں

شیخ المشائخ

شیخ سماء الدین

آگرے کا مجذوب

ضیا تسنیم بلگرامی

مدینہ منورہ سے سید سلیمان بن سید حسن الحسینی نامی ایک بزرگ ہندوستان میں داخل ہوتے اور شمالی ہندوستان میں بارہ بنکی کے ردولی نامی قصبے میں سکونت پذیر ہوگئے۔ حکومت نے انہیں انعام و اکرام اور بخشش و عطا سے اتنا نوازا کہ یہ بہت جلد صاحبِ ثروت اور اہل جائداد ہوگئے۔ یہیں ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔ ان کی آخری اولاد علاء الدین نامی ایک بچہ تھا۔ یہ ابھی پانچ چھ سال ہی کا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ علاء الدین کے دوسرے بھائی جوان یا نوجوان تھے، وہ چاہتے تو مل جل کر رہتے اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی کفالت میں لے لیتے لیکن ان کے ارادے کچھ اور تھے۔

ماں اپنے جوان بیٹوں کی باہمی سرگوشیوں اور نظروں کے تیور سے کچھ خطرات محسوس کر رہی تھیں۔ انھوں نے بیٹوں کو حکم دیا: "بچو! نماز عشا کے بعد تم سب میرے پاس آؤ، میں تمھیں چند نصیحتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

خود غرض اور لالچی بیٹے دلوں میں کھوٹ اور چہروں پر سعادت مندی کے آثار لیے عشا کی نماز کے بعد ماں کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ ماں کڑاکڑاتی سردی میں کمرے کے دروازے بند کیے لحاف میں دبکی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی گود میں علاء الدین تھا۔ بیٹے مسکین صورت بنائے سامنے کے تخت پر بیٹھ گئے۔

ماں نے انھیں بغور دیکھا اور ان کی قلبی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سب سے بڑے بیٹے نے کھنکار کر سوال کیا: "اماں! آپ نے ہمیں کس لیے یاد فرمایا ہے؟"

ماں نے نہایت پرسوز آواز میں کہا: "میرے بیٹو! تمھارا باپ مدینہ منورہ سے یہاں آیا تھا۔ تمھارا نسب حسنی الحسینی ہے۔ اس خاندان کی کچھ عظیم الشان روایات ہیں۔ ایکا اور اتحاد، اگر تم واقعاتِ کربلا پر غور کروگے تو تمھیں بھائی بہنوں اور بھانجے بھتیجوں وغیرہ کے بے مثل اتحاد اور یگانگت کی ایک ایسی مثال ملے گی جو تمھیں کہیں اور نہیں نظر آسکتی۔"

بڑے بیٹے نے اکتا کر کہا: "اماں! آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ اس طولانی تمہید سے تو ہمارے سروں میں درد ہونے لگا ہے۔"

دوسرے بھائی نے کہا: "کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم اپنی خاندانی روایات تک سے واقف نہیں؟"

ماں نے قطع کلام ہوجانے سے دکھ محسوس کیا لیکن ضبط کر گئیں۔ بولیں: "میرے بیٹو! تمھارے باپ نے کافی املاک اور نقدی چھوڑی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سب مل جل کر رہو اور اپنے چھوٹے بھائی علاء الدین کی سرپرستی قبول کرو۔ یہ تمھاری محبت اور خلوص کا بھوکا ہے اور اپنے باپ کی املاک اور نقدی میں برابر کا حصہ دار ہے۔"

بڑے بھائی نے ریاکاری سے جواب دیا: "علاء الدین ہم سب کا بھائی نہیں، بیٹا ہے۔ آخر آپ ہماری طرف سے بدگمان کیوں ہیں۔ ہم اسے اپنی آنکھ کا تارا بنا کے رکھیں گے۔ آپ ہرگز فکرمند نہ ہوں۔"

اور یہی کلمات تقریباً ہر بھائی نے باری باری ادا کیے لیکن ماں کو معلوم نہیں کیا ہوگیا تھا کہ وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئیں!

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ سفید داڑھی والا چالیس پینتالیس سالہ رسول بخش بچپنے سے اس خاندان کی خدمت کر رہا تھا، وہ علاء الدین کو گود میں لے کر ادھر ادھر نکل جاتا اور سیر و تفریح کراتا رہتا۔ ایک دن وہ علاء الدین کو امرودوں کے باغ سے لیے چلا آرہا تھا

کر راہ میں علاء الدین کا سب سے بڑا بھائی مل گیا۔ اس نے علاء الدین کو محبت سے گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ پھر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور رسول بخش کو ایک طرف لے گیا، کہنے لگا: "رسول بخش! کیا تجھے نہیں معلوم کہ امرودوں کے باغ کے آس پاس کہیں ایک بھیڑیا موجود ہے جو آبادی کے کئی بچوں کو اٹھا لے جا چکا ہے!"

"معلوم ہے۔" رسول بخش نے گردن ہلا کر جواب دیا: "لیکن میں اسے باغ کی طرف اس وقت لے جاتا ہوں جب اس کے آس پاس کے کھیتوں میں کام شروع ہو چکا ہوتا ہے اور باغ کے رکھوالے طوطوں اور دوسرے پرندوں سے باغ کی رکھوالی کر رہے ہوتے ہیں!"

بڑے بھائی نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا: "اگر تو چاہے تو تجھے دس بیگھہ زمین اور دو سو روپے فوراً مل سکتے ہیں!"

رسول بخش کی طمع سے آنکھیں کھل گئیں، پوچھا: "صاحب! اگر ایسا ہو جائے تو آپ کا یہ غلام شادی کرنے کے لائق ہو جائے گا اور زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتا رہے گا!"

علاء الدین نے تنہائی کی وجہ سے منہ بنانا شروع کر دیا اور بسورتے ہوئے رسول بخش کو آواز دی۔

بڑا بھائی غصّے میں علاء الدین کی طرف بڑھا اور دو طمانچے رسید کر دیے: "مرا کیوں جاتا ہے، باتیں بھی نہیں کرنے دیتا۔ تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا رہ، ورنہ مار مار کے کچومر نکال دوں گا۔ تیرا میں بے جا محبت کا قائل نہیں ہوں۔"

علاء الدین سہم گیا۔ بڑا بھائی رسول بخش کے پاس واپس گیا، بولا: "رسول بخش! بس تجھے یہ کرنا ہے کہ تو ایک دن صبح سورج نکلنے سے پہلے علاء الدین کو سیر و تفریح کرانے اس باغ میں لے آ۔ میں یہاں پہلے سے موجود ہوں گا۔ تو علاء الدین کو میرے حوالے کر کے 'بھیڑیا! بھیڑیا!' چیختے، خوف زدہ ہو کر بھاگ جانا اور ہر شخص سے یہی کہنا کہ علاء الدین کو بھیڑیا لے گیا!"

رسول بخش کو کچھ تامّل ہوا۔ بڑا بھائی سمجھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے۔ دھمکی آمیز لہجے میں کہا: "اگر تو نے میری تجویز پر عمل کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں تجھے دس کے بجائے بیس بیگھہ اور دو سو کے بجائے چار سو روپے دے دوں لیکن اگر تو نے میری بات بھی نہ مانی اور اس کا دوسروں پر اظہار بھی کر دیا تو یہ سمجھ لینا کہ تو قتل کر دیا جائے گا!"

رسول بخش نے بے بسی سے کہا: "صاحب! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میرے بعد علاء الدین کے ساتھ کیا سلوک کریں گے!"

بڑے بھائی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا: "میں جو کچھ کروں گا اس میں سارے بھائیوں کی مرضی شامل ہے۔ میرے پاس شیر کا پنجہ موجود ہے۔ میں انگلیوں میں شیر کا پنجہ پھنسا کے علاء الدین کا پیٹ اس طرح چاک کر دوں گا اور اس کی پشت اور سینے کو کچھ اس طرح نوچ نوچ کر زخمی کر دوں گا کہ بعد میں دیکھنے والے ہرگز یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ علاء الدین کو بھیڑیے نے نہیں ہلاک کیا!"

رسول بخش نے اپنے خوف کو نہایت ضبط اور احتیاط سے چھپائے رکھا۔ پوچھا: "لیکن صاحب! آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں۔؟"

بڑے بھائی نے قدرے ترشی سے کہا: "ہرچند تجھے اس قسم کے سوال و جواب کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی چونکہ میں نے تجھے اپنے اعتماد میں لیا ہے اس لیے میں محدود حد تک تیرے چند سوالات کے جوابات ضرور دوں گا!"

رسول بخش کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔ لیکن وہ بڑے ضبط سے سیدھے کھڑے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑے بھائی نے کہا: "ہاں تو تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ تو سن لے! باپ کے انتقال کے بعد جو جائداد، املاک اور زمین ہم سب کے حصّے میں آئی ہے اس کے حصّے بخرے میں بڑی دقت پیش آ رہی ہے۔ اگر اس میں سے علاء الدین کا حق نکال دیا جائے تو چھ بھائیوں میں بڑی آسانی سے ترکہ یا ورثہ تقسیم کیا جا سکتا ہے پھر ہم سب کو یہ شبہ بھی ہے کہ علاء الدین ہماری ماں کا بیٹا نہیں ہے ہمارے باپ نے کوئی خفیہ شادی کر رکھی تھی۔ علاء الدین اس کا بیٹا ہے پھر جب علاء الدین کی ماں کا انتقال ہو گیا تو باپ نے علاء الدین کو میری ماں کے حوالے کر دیا۔ میری شریف النفس ماں نے اپنی سوت کی اولاد کو بالکل اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا شروع کر دیا۔ یہ اصل واقعہ جس کا ہم بھائیوں اور ماں کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں!"

رسول بخش کو بڑے بھائی کے اس زبردست جھوٹ پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بچپن سے اسی گھر میں رہ رہا تھا، اسے اس گھر کی ایک ایک بات کا علم تھا۔ یہ جھوٹا واقعہ جس کا بڑے بھائی نے نہایت سنجیدگی سے اظہار کیا تھا۔ اس کے لیے قطعاً ناقابلِ یقین تھا کیونکہ وہ دائی جس نے علاء الدین کی پیدائش میں خدمت کی تھی ابھی حیات تھی اور اب بھی مختلف تہواروں اور تقریبوں کے موقعوں پر حاضری دے کر اپنا حق لے جایا کرتی تھی لیکن رسول بخش کے سامنے فرار کی کوئی راہ بھی تو نہ تھی۔

بڑے بھائی نے ترش روئی سے پوچھا: "تو میری تجویز پر کب

عمل کر رہا ہے ؟"

رسول بخش نے جواب دیا: "ایک ہفتہ بعد، کیونکہ آپ کی تجویز پر عقل مندی سے عمل کرنے کے لیے مجھے بھی بہت کچھ سوچنا پڑے گا!"

"ٹھیک ہے،" بڑے بھائی نے کہا: "آج سہ شنبہ (منگل) ہے۔ اگلے چہار شنبہ (بدھ) تک کا تجھے موقع دیا جا رہا ہے۔ پنج شنبے کو علی الصباح علاء الدین کے ساتھ اس باغ میں مجھے ملے گا!"

رسول بخش نے جواب دیا: "بہت بہتر جناب! آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہوگی لیکن یہ بھی تو بتا دیجیے کہ انعام کا روپیہ اور زمین مجھے کب ملے گی؟"

بڑے بھائی نے خوش ہو کر جواب دیا: "دو سو روپے تم مجھ سے کل ہی لے لینا، بقیہ روپے اور زمین تمھیں کام ہو جانے کے بعد ملے گی۔"

رسول بخش نے خوش ہو کر کہا: "پھر تو میں پوری طرح تیار ہوں جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا!"

بڑے بھائی نے اپنی راہ لی اور رسول بخش علاء الدین کو گود میں اٹھا کر گھر چلا گیا۔

بڑے بھائی نے حسب وعدہ دوسرے دن رسول بخش کو دو سو روپے دے دیے۔ روپے پا کر اس کے چہرے پر ایسی تازگی چھا گئی، گویا جوانی واپس آگئی ہو۔ تمام بھائی اس کی نگرانی کر رہے تھے کہ کہیں وہ اس منصوبے کو ماں پر نہ ظاہر کر دے لیکن رسول بخش کا بشاش رویّہ اور ہر دم مسکراتے رہنے کا انداز انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ رسول بخش حرص و طمع کے دام میں پھنس چکا ہے۔ جمعے کو اول پہر جب سب بھائی اِدھر اُدھر کام میں مصروف تھے اور نماز جمعہ سے پہلے پہلے ضروری کام نپٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ رسول بخش نے بڑے بھائی کے منصوبے کا ذکر ماں کے سامنے کر دیا اور کہا: "آماں! اب بہتری اسی میں ہے کہ مجھے جو دو سو روپے پیشگی ملے ہیں انھیں لے کر ہم تینوں یہاں سے چپ چاپ نکل چلیں۔ کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم اب بھی یہاں رہے تو چھوٹے میاں علاء الدین اور میں خود، کسی نہ کسی طرح ہلاک ضرور کر دیے جائیں گے!"

ماں کانپ گئیں، لرز کر بولیں: "اگر علاء الدین کے بھائی برادرانِ یوسف بن چکے ہیں تو ہمیں واقعی مجبوراً یہاں سے چلا جانا پڑے گا، ہم اپنے علاء الدین کو یوں ہرگز نہ مرنے دیں گے!"

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ لوگ جائیں تو جائیں کہاں؟ بہت غور و فکر کے بعد ماں نے اتنی دور چلے جانے کا ارادہ کر لیا جہاں ان کے بڑے بیٹوں کی رسائی بہت مشکل تھی — مدینہ منورہ واپس چلے جانے کا ارادہ — وہاں ان کا خاندان موجود ہی تھا۔

پیر کی رات کو جبکہ ان کے سارے بیٹے اپنے اپنے لحافوں میں گھسے گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ ماں نے علاء الدین کو شال میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔ رسول بخش نے تیز رفتار بیل گاڑی کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا تھا۔ تینوں اس پر سوار ہوتے۔ رسول بخش بیل کو خود ہی ہانک رہا تھا۔ یہ تینوں صبح ہوتے ہوتے جنوب مغرب میں اتنی دور جا چکے تھے کہ برادرانِ یوسف انھیں آسانی نہیں پا سکتے تھے اور اس صورت میں کہ انھیں ان تینوں کی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ان کا تعاقب کس سمت میں کرتے۔

یہ تینوں بوقت تمام سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے جدّے کے لیے روانہ ہو گئے۔ کنارے کنارے چلنے والا جہاز انھیں جدے تک لے گیا۔ جدے سے انھوں نے مکّے کا رخ کیا، خانۂ کعبہ میں حاضری دے کر ماں نے علاء الدین کے حق میں بڑی دعائیں کیں اور یہاں سے وہ مدینہ منورہ چلی گئیں۔ وہاں ان کا بہت بڑا کنبہ موجود تھا۔ اس نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ علاء الدین دیار نبیؐ میں پرورش پانے لگے۔

ننھے علاء الدین کو بھی اصل واقعات کا کسی حد تک علم ہو چکا تھا۔ دولت، املاک، روپیہ اور جائداد کیسی چیزیں ہیں جس کے لیے لوگ انسان کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں؟ اکثر تنہائی میں یہ سوال دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ یہ رسول اللہؐ کے مزار پر حاضری دیتے اور ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتے کہ "یا رسول اللہؐ! دولت اور املاک کی محبت کے ناپاک جذبے سے میرے دل کو محفوظ رکھیے، میں آپ سے اس کی پناہ مانگتا ہوں!"

دل کی گہرائیوں اور معصوم زبان سے نکلی ہوئی دعائیں باب اجابت کو پہنچیں اور علاء الدین کے دل کو دولت اور مال کی حرص و طمع کی آلائش سے محفوظ کر دیا گیا۔

علاء الدین مدینے کے اساتذہ کی خدمت میں بٹھا دیے گئے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔ زندگی سکون سے گزرنے لگی۔ ماں کو اپنی وہ اولادیں بھی یاد آتیں جن کی شقاوت سے خوف زدہ ہو کر انھوں نے ہندوستان کو خیرباد کہا تھا۔ وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے اداس ہو جاتیں، آنکھیں بھیگ جاتیں، دوپٹے کے آنچل سے انھیں پونچھتیں اور زندگی و دنیاداری میں الجھ کر سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی زندگی ایک غمکدہ تھی، ایک ایسا غمکدہ جو موت کی طرح ناقابلِ رد، اٹل اور لازمی تھا۔ علاء الدین کے لیے انھوں نے ساری اولادیں چھوڑ دیں

اگر وہ چاہتیں تو علاء الدین کو قربان کر کے وہ ساری اولادوں کی قربت حاصل کر سکتی تھیں لیکن مشیتِ ایزدی ایسا نہیں چاہتی تھی، وہ وہی چاہتی تھی جس پر انھوں نے عمل کیا۔

ابھی درس کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ماں بیمار رہنے لگیں، انھیں جو غم اندر ہی اندر کھا رہا تھا اب وہ رُوح سے جسم میں داخل ہو گیا تھا اور انھیں گھن کی طرح کھوکھلا کرنے لگا۔ ادھر رسولِ کریمؐ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ علاء الدین کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ کچھ عرصے بعد ماں بھی چل بسیں۔ علاء الدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب تک دُنیا نے انھیں دکھ ہی دکھ دیے تھے۔ دُنیا سے نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ کچھ عرصے مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ کے مزارِ اقدس پر آخری بار حاضری دی اور رخصت کی اجازت چاہی۔

مدینے سے نکل کر طلبِ علم میں ایک اُستاد سے دوسرے اُستاد تک جاتے رہے اور علم کی پیاس بجھا کر اور آگے بڑھتے بڑھتے یہاں تک کہ عرب سے نکل کر ایران میں داخل ہو گئے اور وقت کے بڑے بڑے علماء سے درس لیتے رہے۔ ایران سے ہندوستان پہنچے اور دلی میں حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دے کر چلّہ کشی میں مصروف ہو گئے۔ ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور لوگ انھیں مجذوب کہنے لگے۔ کچھ عرصے بعد حضرت بختیار کاکیؒ نے انھیں عالمِ رویا میں آگرے جانے کا حکم دیا۔ یہ تعمیلِ حکم میں آگرے چلے گئے اور جمنا کے کنارے قیام کیا۔ ان کا چرچا ان سے پہلے ہی آگرے پہنچ چکا تھا۔ یہاں لوگ انھیں گھیرنے لگے لیکن یہ ان پر کم ہی توجہ فرماتے خود بازار جاتے، سودا سلف خریدتے اور واپس آ کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے۔ اس وقت جو بھی موجود ہوتا اسے اپنے کھانے میں شریک کر لیتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ کھانے پر بہت سارے لوگ جمع ہونے لگے، یہ سب کے لیے خود ہی کھانا پکاتے اور سبھی کو کھانے میں شریک کر لیتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس مشغلے نے ان کی عبادت و ریاضت میں فتور ڈال دیا۔

ایک دن دوپہر کے کھانے پر تقریباً پچاس آدمی حاضر تھے آپ نے سب کو پکا کر کھلایا اور پانی پلا کر بچ جانے والی روٹیاں ایک کپڑے میں لپیٹ لیں، کٹیا سے باہر نکلے اور کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیوں والا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آواز بھرا گئی، گلا رُندھ گیا، باوازِ بلند فرمایا: "اے جبرئیل! تم کہاں ہو؟ ادھر آؤ میرے پاس، اے میکائیل! کیا تم تک میری آواز پہنچ رہی ہے؟ اگر پہنچ رہی ہے تو تم بھی میرے قریب آؤ، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، اور اسرافیل! کیا تم نے میری آواز سُن لی؟ تو اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ تم بھی یہاں آ جاؤ، تم تینوں مقربِ بارگاہِ ایزدی ہو، مجھ عاجز و ناتواں کا حالِ زار بارگاہِ ذوالجلال میں عرض کر دو اور کہو کہ یہ ذمہ داری جو مجھے سونپی گئی ہے کسی بہت بڑے ولی اللہ کے سپرد کر دی جائے۔ یہ عاجز اس بارِ عظیم کے اٹھانے کی خود میں سکت نہیں پاتا!"

اتنا کہہ کر زار و قطار رونے لگے اور کچھ سکوت کے بعد مزید فرمایا: "اس خدمت کی وجہ سے میں عبادت تک نہیں کر سکتا۔ دن رات لوگوں کے نان و لقمے کے لیے حیران و پریشان رہتا ہوں۔ آخر اس غلام کو کب تک خوار رکھا جائے گا؟"

اس کے بعد اُٹھ کر وضو فرمایا اور کپڑے میں بندھی ہوئی روٹیاں کھول کر سامنے رکھ لیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے ہی ڈھیر لگا لیا اور پھر جو جانور بھی سامنے آیا اسے کھلانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس فیضِ عام سے طوطے، کوّے، کبوتر اور مینا تک محروم نہ رہے۔ آخر میں چند ٹکڑے باقی بچے وہ خود کھا لیے۔

یہ ابراہیم لودھی کا عہد تھا۔ اس نے ازراہِ عقیدت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ وظیفہ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے ان کے سارے ارادت مندوں اور خادموں کا خرچ چلنے لگا۔ لوگوں نے آپ کو علاء الدین کی نسبت سے محبت میں علاول بلاول کہنا شروع کر دیا ابراہیم لودھی کے بعض امرا جنھیں آپ کی دعاؤں کا فیض نہیں حاصل ہو سکا تھا، شاہ صاحب سے ناراض رہنے لگے۔ وہ جب بھی موقع ملتا ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہتے۔ پُرانی مثل کے مطابق کہ سو پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیاں بھی جلنے لگتی ہیں، ابراہیم لودھی بھی چغل خوروں کی باتوں سے متاثر ہوا، پوچھا: "کیا تم لوگوں کو حضرت علاول بلاول کی بزرگی میں کسی قسم کا شبہ ہے؟"

ایک حاسد امیر نے جواب دیا: "جہاں پناہ! شیخ کی بات کرتے ہیں اس ناچیز کی رائے میں تو وہ نِرا دُنیادار اور لالچی انسان ہے، حضور کی خوش اعتقادی سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے!"

بادشاہ نے کہا: "کیا ہم اس کا وظیفہ بند کر دیں؟"

"نہیں حضورِ والا!" ایک حاسد امیر نے جواب دیا: "حضورِ والا کی ذات بے شک جود و سخا ہے، یک لخت پورا وظیفہ بند کر دینا حضورِ والا کی شانِ کریمی کے خلاف ہے، ہاں اس میں تخفیف ضرور کی جا سکتی ہے!"

بادشاہ نے فی الفور حکم صادر کر دیا: علاول کے وظیفے

میں دو تہائی کی کمی کر دی جائے!"

جب یہ کُل وظیفے کی ایک تہائی رقم لے کر شاہی خدمت گار آپ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو اس کمی کا علم ہوا تو ہنس کر فرمایا "بابا! تو ایسا کہاں کا رازق ہے تو تو درمیان کا واسطہ ہے، ہمارا حق مار کے تو بددیانتی اور خیانت کا مرتکب ہوا، اب یہ خائن زیادہ دن حکومت نہیں کرے گا۔ ہم کوئی دوسرا بندوبست کرتے ہیں!"

اس کے بعد شاہی خدمت گاروں سے فرمایا: "اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دو ہم نے اس کی مدتِ سلطنت میں دو تہائی کی کمی کر دی اور اس کی جگہ کابل سے دوسرے امانت دار کو طلب کر لیا ہے!"

خدمت گار نے مارے ڈر کے شاہ صاحب کا یہ پیغام بادشاہ تک نہیں پہنچایا۔

کچھ ہی عرصے بعد آگرے میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ کابل کے فرمانروا کا خانہ بدوش فرماں روا ظہیر الدین بابر قسمت آزمائی کی غرض سے ہندوستان کی طرف چل پڑا ہے اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا، آندھی طوفان کی طرح بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

ابراہیم لودھی اپنی عظیم الشان فوج لے کر پانی پت پہنچ گیا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس مغل قسمت آزما کو پانی پت سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

اسی دوران حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلسلۂ چشت کا ایک گوہر آبدار حاضر ہوا اور نیاز مندانہ انداز میں حضرت علاء ول باؤلی کی بزرگی اور عظمت کا اعتراف کیا۔ آپ نے اسے نظر بھر کے دیکھا اور فرمایا: "سلیم چشتی! ہم نے سیکری کے پہاڑ کو تمہارے لیے سونے کا کر دیا، فرماں روایانِ وقت تیرے در پر حاضری دیں گے، ہم تجھے سیکری کی حکومت دیتے ہیں!"

سلیم چشتی اسی وقت سیکری چلے گئے۔

پانی پت میں ابراہیم لودھی اور بابر کی افواج میں خوفناک مقابلہ ہوا جس میں ابراہیم لودھی نے شکست فاش کھائی اور بابر دہلی سے گزرتا ہوا آگرے میں داخل ہو گیا۔ نئے بادشاہ نے شاہ صاحب کی بڑی عزت کی اور ان کی رضا جوئی اور خوشنودی کو عین خوش قسمتی سمجھنے لگا۔

ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی اور فاتح ظہیر الدین بابر بسترِ علالت پر دراز موت اور زندگی کی کشاکش میں مبتلا تھا۔ اطبا اور حکما عاجز آ چکے تھے۔ کسی مصاحب نے دبی آواز میں عرض کیا: "صاحبان!

نے ملائے دربار سے سوال کیا: "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ تو منبر کی آخری سیڑھی پر چڑھ کر خطبہ دیا کرتے تھے، پھر ابوبکرؓ آئے تو وہ ایک سیڑھی نیچے آگئے۔ پھر فاروق اعظمؓ نے دو سیڑھیاں چھوڑ دیں اور جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو آپ پھر اوپر رسول اللہؐ کی سیڑھی سے خطبہ دینے لگے۔ آخر ایسا کیوں؟"

کسی مسخرے نے جواب دیا: "جناب والا! اگر ہر خلیفہ ایک زینہ چھوڑتا رہتا تو آج آپ کو کنواں کھود کر نیچے چلا جانا پڑتا اور اس وقت آپ وہیں سے اپنا خطبہ سُنا رہے ہوتے۔"

جمنا کے کنارے ایک کٹیا میں علاء الدین نامی ایک خدا شناس ٹھہرا ہوا ہے، ہم سب کو اس سے مِل کر دُعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ ممکن ہے خدا ان کی دُعا سُن لے۔"

مصاحب کے مشورے پر عمل کیا گیا اور ایک چھ نفری وفد حضرت علاء الدین کی کٹیا کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر داخلے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اندر سے تلاوت قرآن پاک کی آواز آ رہی تھی۔

وفد کے سربراہ نے کہا: "حضرت شاہ صاحب! چند نیاز مند آپ کی قدم بوسی کی تمنا میں حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔"

اندر سے جواب ملا: "واپس جاؤ، چھوٹا بادشاہ بڑے بادشاہ سے ملاقات کر کے رہے گا۔"

وفد مایوسی کے یہ کلمات سُن کر اُلٹے قدموں واپس گیا اور ولی عہد ہمایوں کو شاہ علاء الدین کا جواب سُنا دیا۔

ہمایوں نے کہا: "آپ لوگ ایک بار پھر اس بزرگ کی خدمت میں واپس جائیں۔ ان اللہ والوں کو اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر یہ چاہیں تو کسی اور کی عمر کم کرا کے قریب المرگ شخص کو زندگی بخش سکتے ہیں۔"

ولی عہد کی ہدایت پر وفد پھر شاہ علاء الدین کی کٹیا پہنچ گیا، لیکن اب کٹیا خالی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ شاہی وفد ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھیل گیا، دُور دُور ان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وفد ان کی تلاش میں ناکام رہ کر ولی عہد کے پاس پہنچا اور اس کے رُوبرو اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا۔

ہمایوں نے کرب سے کہا: "تم لوگوں نے انھیں آس پاس ہی سے نہیں تلاش کیا، ورنہ وہ مل ضرور جاتے۔"

وفد کے سربراہ نے اپنی رائے دی۔ کہا: "حضور والا! خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو ہم ہمت ہارنے والے نہیں تھے، ان سے ملنے اور ایک ہی مسئلے پر سوال و جواب کرنے میں ایک ڈر باقی رہتا ہے وہ یہ کہ کہیں ان کی زبان سے کوئی ایسا ویسا کلمہ نہ نکل جائے جس سے نصیبِ دشمناں مغلیہ سلطنت ہی......"

ہمایوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہا: "اچھا، خاموش رہو اور اس موضوع پر اب کوئی بات نہ کی جائے۔"

تھوڑی دیر بعد کول (علی گڑھ) سے ایک سوار آگرے میں داخل ہوا۔ وہ بادشاہ کی مزاج پُرسی کے لیے آیا تھا اور علاء الدینؒ کے ارادت مندوں میں داخل تھا۔ جب اس کے سامنے علاء الدینؒ کی خدمت میں دوبارہ جانے کا ذکر آیا تو اس نے کہا: "وہ آگرے میں ہیں کہاں؟ انھیں تو میں کول میں حضرت جمال العارفینؒ کے پاس حوض کے کنارے چھوڑے آ رہا ہوں اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں آگرے جا رہا ہوں تو انھوں نے بادشاہ کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ بادشاہ سے کہو اس کی جس شہنشاہ سے ملاقات ہونے والی ہے اس میں وقت کی ردو بدل نہیں ہوتی، جو وقت طے پا گیا ہے اس پر حاضری ضروری ہے۔"

بابر کا انتقال ہو گیا اور ہمایوں نے اقتدار سنبھالا۔ علاء الدینؒ ابھی تک کول ہی میں تشریف فرما تھے۔ ہمایوں نے ان سے آگرے واپس آنے کی درخواست کی لیکن وہ نہیں آئے۔ آخر کار ہمایوں نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر حضرت شاہ صاحب یوں تشریف نہیں لاتے تو بادشاہ خود حاضر ہو گا اور انھیں اپنے ساتھ واپس لانے کی ہر کوشش کر گزرے گا۔ ہمایوں کی منت سماجت کام کر گئی اور حضرت علاء الدینؒ آگرے واپس آگئے۔ لوگوں کا ہجوم انھیں پھر گھیرنے لگا۔

ایک دن ابراہیم لودھی کا وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر آدھی رات کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا: "حضور! کچھ میرے حق میں بھی دُعا ہو جائے۔"

آپ نے یہ نذرانہ قبول نہیں کیا۔ فوراً خفگی سے حکم دیا۔

"اسے واپس لے جا، میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

سابق وزیر نے کہا: "حضرت! پھر میں کہاں جاؤں؟ آپ خود ہی سوچیے جس نے وزارت کی ہو، وہ ننگا اور بے کار پھرے اس کے دل پر کیا بیتتی ہو گی؟"

آپ نے غصے میں فرمایا: "لوگوں کے رزق پر ڈاکے ڈال اور وظیفے کی رقموں میں کمی کر، پھر دیکھ خدا تجھے کیسی مکافات میں مبتلا کرتا

ہے، تو یہ اشرفیاں واپس لے جا!"

لودھی وزیر دل برداشتہ ہو کر اشرفیاں واپس لے گیا۔ اس کے چلے جانے کے تقریباً پون گھنٹہ بعد چار آدمی آپ کے پاس پہنچے اور اپنی چمچماتی چھریاں ہوا میں لہرا کر بولے: "او پاگل انسان! تو نے اشرفیوں کا طباق کیوں واپس کر دیا؟"

آپ نے جواب دیا: "وہ اشرفیاں کب تھیں، آگ تھی، انہیں جو بھی چھوئے گا، جل مرے گا!" پھر پوچھا: "تم کون ہو اور کیا لینے آئے ہو؟"

چاروں میں سے سب سے زیادہ دبنگ اور متحرک شخص نے غصے سے آنکھیں نکال کر جواب دیا: "ہم لٹیرے ہیں اور آج ہمیں ہر جگہ ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا!"

"اچھا!" آپ نے مطمئن لہجے میں کہا: "اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا: "ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہ اشرفیوں والا طباق دوبارہ منگا لیں اور اسے ہم ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہماری یہ چمچماتی چھریاں ہیں اور آپ ہیں، بے رُو رعایت پیٹ میں گھونپ دیں گے۔"

"اچھا ذرا صبح ہونے کا انتظار کرو۔" آپ نے جواب دیا۔ "ہم وہ اشرفیاں دوبارہ منگوا دیں گے۔"

اس رات لودھی وزیر نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ملا اول بلاول فرما رہے ہیں: "بیٹے! وہ اشرفیوں والا طباق لے کر فوراً حاضر ہو جاؤ!"

صبح فجر کے فوراً بعد لودھی وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر حاضر ہو گیا۔ آپ نے تھوڑی دیر بعد یہ اشرفیاں چاروں لٹیروں کے حوالے کر دیں اور ایک بار پھر فرمایا: "تم سب خوب اچھی طرح سن لو، ان اشرفیوں میں آگ ہے انہیں جو چھوئے گا جھلس جائے گا۔"

لٹیروں نے شاہ صاحب کی باتیں لاپروائی سے سنیں اور اشرفیاں لے کر شراب خانے چلے گئے اور وہاں خوب ڈٹ کے شراب پی۔ جب نشے میں دھت مے خانے سے باہر نکلے تو انہیں اچانک اشرفیوں کی تقسیم کا خیال آ گیا۔ ان کے سرغنہ نے کہا: "اب ہمیں یہ اشرفیاں بحصۂ مساوی آپس میں تقسیم کر لینی چاہئیں۔"

ایک نے جھومتے ہوئے کہا: "بے شک لیکن اس بات کا بطورِ خاص خیال رہے کہ یہ راز میں نے بتایا تھا۔ اس لیے زیادہ حصے کا بھی میں ہی حق دار ہوں!"

دوسرے نے اس خیال کی مخالفت کی، بولا: "تو نہیں، زیادہ حصے کا حق دار میں ہوں کیونکہ شاہ صاحب کو چھری دکھانے میں میں سب سے آگے تھا اور یہ میری چھری ہی کا کرشمہ ہے جو شاہ صاحب نے خوفزدہ ہو کر اشرفیاں دوبارہ منگوا دیں!"

تیسرے نے ان دونوں کو ڈانٹ دیا، کہنے لگا: "تم دونوں زیادہ پی گئے ہو اور نشے میں دھت بہک رہے ہو، کیا تمھیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ ہمیشہ حصے بخرے میں کرتا رہا ہوں اور تم سب میری دیانت کے پیش نظر حصے سے کچھ زیادہ ہی دیتے رہے ہو!"

چوتھا ہنسا اور نہایت حکمانہ لہجے میں کہا: "میں تمھارا سردار ہوں، کیا نشے میں تم مجھے پہچان بھی نہیں رہے؟ اپنے سردار کے ہوتے ہوئے ایسی بے سروپا اور فضول باتیں کر رہے ہو، سردار کا حصہ ہمیشہ زیادہ ہوا کرتا ہے!"

سردار کی بات پر تینوں چھریاں کھینچ کر اس پر پل پڑے اور ذرا سی دیر میں اس کے ٹکڑے اڑا دیے۔ اس کے بعد یہ تینوں آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگے اور آخر تینوں ہی زخمی ہو کر سسکنے لگے۔ جب شہر کوتوال موقعۂ واردات پر پہنچا تو ان قریب المرگ میں سے ایک نے اپنا نزاعی بیان دے کر ساری کیفیت شہر کوتوال کے گوش گزار کر دی اور مر گیا۔

کوتوال اشرفیاں لے کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا قصہ سنا کر اشرفیاں پیش کرنے لگا۔ آپ نے جواب دیا "انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ ان میں آگ چھپی ہے جو چھوئے گا جل جائے گا۔"

کوتوال نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور گھر چلا آیا۔ کئی دن بعد شہر کوتوال کے گھر پہ ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور شہر کوتوال کو اس کے پورے کنبے کے ساتھ قتل کر دیا۔

مغل فرماں روا ہمایوں اپنے چند امرا کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ اس وقت آپ شاہِ ولایت کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔ آپ نے ایک نگاہِ غلط انداز ہمایوں پر ڈالی اور حکم دیا: "بادشاہ! اپنے وطن واپس چلے جاؤ!"

ہمایوں مطلب نہیں سمجھا۔ حیرت سے پوچھا: "حضرت کیا فرما رہے ہیں؟ کچھ وضاحت سے فرما دیں!"

آپ نے ترشی سے کہا: "میری صاف بات کا بھی مطلب نہیں سمجھا، میں کہہ رہا ہوں کہ تو یہاں سے اپنے وطن چلا جا۔ خدا ایک تجھ سے زیادہ لائق انسان کو چند سال حکمرانی کا موقع دینا چاہتا

ہے۔"

ہمایوں گھبرا گیا۔ آپ نے ہمایوں کو بالواسطہ خبردار کیا: "بادشاہ سے کہہ دو، شیر کو پچھاڑنے والا آرہا ہے، وہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔"

ادھر یہ مکالمے ادا ہو رہے تھے، دوسری طرف شیر خان سوری بہار سے مغرب میں بڑھتا چلا آرہا تھا۔ مقابلے پر جانے سے پہلے امراء نے کہا: "ایک بار حضرت ولایت شاہ کی بارگاہ میں پھر حاضری دینی چاہیے اور ان سے اس مقابلے کے لیے واضح حکم حاصل کرنا چاہیے۔"

بیرم خان کی سرکردگی میں ایک وفد شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا احوال سنا کے ان کی رائے طلب کی۔

آپ نے ناراضی سے فرمایا: "میں دو مہینے سے یہ کہہ رہا ہوں کہ بادشاہ سے کہو اپنے وطن واپس جائے۔"

بیرم خان نے کہا: "لیکن حضور والا! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارا بادشاہ چند لٹیروں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے؟"

آپ نے فرمایا: "احمق سردار! جب تو خود ہی کوئی فیصلہ کر چکا ہے تو پھر مجھ سے رائے لینے کیوں آیا تھا، جو تیرے جی میں آئے کر، میں خاموش رہوں گا۔"

بیرم خان ڈر گیا، بولا: "حضرت! یہ غلام تو آپ کا تابعدار ہے۔ بھلا یہ میری مجال کہ آپ کے حکم کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔"

آپ نے کہا: "تب پھر ہمارا فیصلہ ہی سچا اور اچھا ہے۔ اپنے بادشاہ سے کہو وہ یہاں سے پہلے ہی چلا جائے۔ اس سے یہ بھی کہو کہ وہ مایوس نہ ہو، ہم اسے دوبارہ بلالیں گے۔"

"کتنے عرصے بعد؟" بیرم خان نے سوال کیا۔

آپ نے ترشی سے کہا: "یہ مت پوچھو، جب جی میں آئے گا بلالیں گے۔"

اس کے بعد آپ خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن پاک کو گلے میں لٹکا کر آگرہ سے کہیں اور چلے گئے۔

ہمایوں کو جب آپ کے ارشادات کا علم ہوا تو بہت بددل ہوا۔ امراء نے کہا: "حضور والا! یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب شہر اور حکومت پر کوئی برا وقت پڑنے والا ہوتا ہے تو حضرت ولایت شاہ ترکِ سکونت اختیار کرتے ہیں، ان کا آگرے سے چلا جانا اچھی بات نہیں ہے۔"

ہمایوں نے منور بیگ نامی ایک امیر کو حکم دیا: "تم حضرت ولایت شاہ کے خادموں کو چالیس روپے اور اونٹ دے کر مجبور کرو

9 ایک بُرا اور بدنام زمانہ شخص علم و دانش کی باتیں کر رہا تھا۔ لوگوں نے اس کا مذاق اُڑایا، بولے: "بھلا اس کی باتیں کوئی کیوں سُنے! یہ تو ایک نہایت بُرا اور بدنام انسان ہے!"

وہیں سقراط بھی موجود تھا۔ اس نے کہا: "لوگو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو! یہ شخص جو قیمتی باتیں کر رہا ہے انہیں غور سے سنو اور ذہن نشین کرلو، کیونکہ اس شخص کی حیثیت غوطہ خور جیسی ہے، غوطہ خور کے ذلیل ہونے سے موتی کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

کسی بھی طرح انھیں آگرے واپس لائیں۔"

ہمایوں یہ حکم دے کر قنوج روانہ ہوگیا کیونکہ شیر خان کی فوجیں وہاں سے آگرے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہی تھیں۔

لوگ حضرت ولایت شاہ کو تلاش کرتے ہوئے وہیں پہنچ گئے، جہاں وہ قیام فرما تھے۔ مریدوں نے عاجزی سے عرض کیا: "حضرت شاہ صاحب! آگرے میں آپ کی جدائی کے غم میں ملائکہ اور شاہ پریاں بہت ملول ہیں اور رو رو کر برا حال کیے لے رہی ہیں۔ براہ کرم واپس تشریف لے چلیے۔"

حضرت ولایت شاہ صوفیا اور صلحا کو ملائکہ کہتے تھے اور پردہ نشین عبادت گزار خواتین کو شاہ پریاں کا خطاب دے رکھا تھا مریدین بمشکل انھیں آگرے واپس لاتے۔

آدھی رات گزر چکی تھی، مریدوں نے دیکھا، حضرت ولایت شاہ چونک کر اُٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانے لگے۔ کسی مرید نے دریافت کیا: "حضرت! یہ روٹیاں کس کے لیے پکا رہے ہیں؟"

غصے میں جواب دیا: "بادشاہ کے لیے۔ ہزار مرتبہ کہہ دیا تو اپنے وطن واپس جا، لیکن نہیں مانتا، اپنی سی کیے جاتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر زادِ راہ تیار کیے دیتا ہوں، اب بھی نہیں مانے گا تو بہت پچھتائے گا۔"

تھوڑی ہی دیر بعد چند گھڑسوار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پہنچے، گھوڑے سے اُتر کر آپ کی خدمت میں دو زانو ہوگئے۔ آپ نے ان میں سے ایک پر نظریں جمائیں اور ترشی سے کہا: کیا

"تمہیں میرا یہ پیغام نہیں ملا تھا کہ اب تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ؟"

نووارد نے جواب دیا: "حضرت آپ کا پیغام مل تو گیا تھا لیکن خدا کے آخری فیصلے کے انتظار میں مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا۔"

آپ نے پوچھا: "پھر کیا ہوا؟"

نووارد نے جواب دیا: "ہمیں شکست فاش ہو چکی اور شیر شاہی لشکر بہت جلد آگرے میں داخل ہونے والا ہے۔"

جو روٹیاں پک چکی تھیں۔ حضرت ولایت شاہ نے وہ نووارد کے حوالے کر دیں اور حکم دیا: "تو اسی وقت ایران چلا جا اور ان روٹیوں کو زادِ راہ سمجھ۔"

نووارد نے توے پر پڑی ہوئی روٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "کیا اس میں میرا کوئی حصہ نہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "یہ بھی تمہاری ہی ہے لیکن یہ اس وقت ملے گی جب تم ایران سے دوبارہ واپس آؤ گے۔"

مریدوں نے اس نووارد عقیدت مند کو پہچان لیا۔ یہ ہمایوں تھا جو شیر خان سے شکست اٹھا کر حضرت ولایت شاہ کا حکم سننے آیا تھا۔

ہمایوں نے التجا آمیز لہجے میں کہا: "حضرت! اس وقت زمین اور آسمان دونوں ہی ہمارے دشمن ہو رہے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم بخیریت تمام ایران پہنچ جائیں؟"

آپ نے جواب دیا: "بک بک کیا کرتا ہے، اپنا راستہ لے۔ کیا ہم نے یونہی تجھے زادِ راہ دی ہے؟"

ہمایوں اسی وقت آگرے سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔



شیر خان، شیر شاہ ہو گیا، اس نے اپنی عسکری قوت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ مشہور دارونہ توپ خانہ رومی خان کو حکم دیا گیا کہ توپیں ڈھالی جائیں اور اس حکم پر تیزی سے عمل درآمد ہونے لگا۔ حضرت ولایت شاہ بازار سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے رومی خان آ گیا۔ وہ نیاز مندانہ آپ کے سامنے جھک گیا۔ آپ نے لاپروائی سے اس پر نظر ڈالی۔ رومی خاں نے ادب سے عرض کیا: "حضرت! اگر ذرا سی تکلیف گوارا فرمائیں تو یہ ناچیز آپ کو اپنا کارنامہ دکھانے کی سعادت حاصل کرے۔"

آپ نے دریافت فرمایا: "کیسا کارنامہ؟"

رومی خان نے جواب دیا: "میں بادشاہ کے حکم پر توپیں ڈھلوا رہا ہوں، اب تک جو کام ہو چکا ہے اس کا مشاہدہ کرانا چاہتا ہوں۔"

آپ خاموشی سے رومی خان کے ساتھ ہو لیے۔ رومی خان نے انہیں توپیں ڈھلنے کے کارخانے میں پہنچا دیا۔ وہاں ہر طرف بھٹیاں جل رہی تھیں۔ لوہا گلایا پگھلایا جا رہا تھا۔ بہت سی توپیں تیار کھڑی تھیں۔ کچھ ناقص حالت میں تھیں۔ ایک طرف تانبے کا ذخیرہ تھا، جسے توپ میں لگایا جا رہا تھا۔ تقریباً ایک ہزار مزدور اور کاریگر کام میں لگے ہوئے تھے۔

حضرت ولایت شاہ نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ کر بولے: "اللہ اکبر! رومی خان تو آدمی ہے یا موت کا فرشتہ؟ تو انسانوں کی ہلاکت کا سامان کتنے اہتمام سے کر رہا ہے۔ توبہ توبہ۔" پھر ان توپوں کی طرف عجیب انداز سے اشارہ کیا اور پھر ادھر ادھر موجود لوگوں سے کہا۔

"دیکھتے کیا ہو، آگے بڑھو اور انہیں توڑ پھوڑ کر بیچ کھاؤ۔"

آپ کے ان کلمات کا شیر شاہ سوری کے عہد میں اس طرح عمل ہوا کہ جب پورا شہر افراتفری اور ہنگاموں کا شکار تھا بلوائیوں نے توپ خانے پر حملہ کر دیا۔ انہیں توڑا پھوڑا اور توپوں کے لوہے اور تانبے کو بازار میں بیچ بیچ کر کھانے پینے کا سامان خرید لیا۔



شیر شاہ کالنجر پر فوج کشی کرنے جا رہا تھا۔ اس نے بابا فرید گنج شکرؒ کے گھرانے کے ایک بزرگ حضرت شیخ کبیرؒ سے درخواست کی: "حضرت! ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے کہ آپ ہماری طرف سے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دیں۔ انہیں ہماری طرف سے کچھ اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کریں اور کہیں کہ ہم کالنجر کی تسخیر کو جا رہے ہیں، آپ اس سلسلے میں خدا سے دعا فرمائیں۔"

شیخ کبیرؒ نے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دی اور اشرفیوں کو کاغذ میں لپیٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دیا۔

آپ نے دریافت کیا: "اس کاغذ میں کیا ہے؟"

شیخ کبیر نے جواب دیا: "اشرفیاں حضرت۔ سوری بادشاہ کالنجر جہاد کرنے جا رہا ہے اور وہ آپ سے دعائیہ استمداد کا خواہش مند ہے۔"

آپ نے اشرفیوں کو ٹھوکر مار دی اور ہنس کر فرمایا۔

"سبحان اللہ۔ کیا خوب! آگ لگ رہی ہے آگ۔ ادھر آ، میری آنکھوں سے دیکھ، پتھر اور پہاڑ قہر کی آگ میں جل رہے ہیں اور رہا تیرا بادشاہ، آگ تو اس کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ کالنجر قلعے کی تسخیر کے لیے کب جا رہا ہے وہ تو آگ میں جلنے جا رہا ہے۔ شیخ کبیر! تم وہاں ہرگز نہ جانا، پھر اشرفیاں اٹھائیں اور شیخ کبیر کے سر پر مار دیں۔ جلال میں بولے "کیا تم مجھے بادشاہ کی نظر میں شرمندہ کرنا چاہتے ہو، خبردار جو شیر خان کے ساتھ گئے تو اس کے ساتھ ہی تم بھی جل مروگے۔"

شیخ کبیر نے واپس جا کر شیر شاہ کو من و عن سنا دیا۔ شیر شاہ کچھ دیر ساکت رہا، کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد کہا: "شاہ ولایت تو ایک مجذوب انسان ہیں، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ان کلمات میں کون سا بھید چھپا ہے۔"

جب شیر شاہ فوج لے کر کالنجر چلا گیا تو آپ نے دامن جھاڑتے ہوئے افسوس سے فرمایا: "افسوس کہ آگ لگ رہی ہے، افسوس کہ آگ لگ رہی ہے۔"

عین حالت جنگ میں شیر شاہ کے بارودی ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ جھلس کر انتقال کر گیا۔

شیر شاہ کی ناگہانی موت سے ملک میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اسلام شاہ جو بعد میں سلیم شاہ سوری کہلایا، اپنے بڑے بھائی کی عدم موجودگی میں تخت نشین ہو گیا۔ درباری امرا اس کی مخالفت میں لگ گئے، سلیم شاہ بھی ان سے خوف زدہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر دولہ خان سے کہا۔
"اس عالم انتشار اور سراسیمگی میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

دولہ خان نے جواب دیا: "حضور! ولایت شاہ مجذوب کے پاس تشریف لے چلیں، وہ جو کچھ کہیں گے وہی حضور کا مستقبل ہوگا۔"

اتفاق کی بات کہ جب سلیم شاہ اپنے وزیر کے ساتھ حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پہنچا۔ باغی امرا بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بادشاہ اور وزیر کو دیکھ کر ایک طرف چھپ گئے۔ بادشاہ حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کئی دوسرے نذرانوں کے علاوہ پچاس بیڑے بھی لایا تھا۔ یہ بیڑے ایک رومال میں بندھے تھے۔ جب وہ بیڑے والا رومال حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا تو دل میں یہ شگون لیے ہوئے تھا کہ اگر حضرت ولایت شاہ اسے ان بیڑوں میں سے چار واپس کر دیں گے تو وہ اس سے یہ شگون لے گا کہ وہ مخالف اور باغی امرا پر غالب آ جائے گا۔

حضرت ولایت شاہ تھوڑی دیر پہلے کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے، قرآن پاک کو نہایت ادب سے رحل پر رکھ دیا اور بادشاہ کے بیڑوں میں سے چھیالیس خود لے کر چار اُسے واپس کر دیے اور فرمایا "انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالعدل" (بلاشبہ ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ (نائب) بنا دیا ہے۔ پس تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کر) پھر خود سے فرمایا: "سبحان اللہ! غریب کو ذرا سا تو ملک ملا ہے اس میں بھی حاسد اور بدخواہ حصہ لگانا چاہتے ہیں۔" پھر دولہ خاں کو حکم دیا۔ "دولہ خاں! تم چند روز جمعیتِ خاطر کے ساتھ اپنے بادشاہ کی خدمت میں زیادہ حاضری دو خدا محافظ ہے۔"

دولہ خان نے بادشاہ کے کان میں کہا: "حضور! اب ہمیں فوراً چلا جانا چاہیے کیوں کہ اگر کچھ دیر اور ٹھیرے اور حضرت ولایت شاہ کی زبان سے کچھ اور نکل گیا تو بہت بُرا ہوگا۔"

اسی وقت ایک مُرید نے دولہ خان سے سرگوشی میں کہا۔
"حضور! باغی امرا ابھی اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے حاضر ہوئے ہیں آپ ابھی واپس نہ جائیں اور کسی طرح چھپ کر ان کی قسمتوں کا فیصلہ بھی سُنتے جائیں۔"

سلیم شاہ سُوری اور دولہ خاں باہر نکل کر شاہ ولایت کے ایک مُرید کی مدد سے ایسی جگہ روپوش ہو گئے جہاں سے باغی سرداروں کی باتیں صاف سُنی جا سکتی تھیں۔

جلال خاں نامی باغی سردار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں ادب سے جُھک گیا اور اس کے ساتھیوں کے بقول اس نے اپنے دل میں نیت کی کہ اگر شاہ ولایت اسے ہندوستان پر حکمرانی کی خوش خبری سُنائیں گے تو وہ پرگنہ آگرہ نذرانے میں آپ کو پیش کر دے گا۔

آپ نے جلال خاں کو دیکھتے ہی منھ پھیر لیا، بولے "جلال خاں! خدا سے شرم کرو! تم نے شیر شاہ کا نمک کھایا ہے، اب اُس کے بیٹے سے نمک حرامی نہ کرو۔ سلیم شاہ خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر ہوا ہے، اس لیے ہم بھی اس کی طرفداری کریں گے۔ جاؤ اس کے دوست بن جاؤ، ورنہ وہ تمھیں قتل کرا دے یا چھوڑ دے، اس پر اُسے پوری قدرت عطا ہوتی ہے۔"

جلال خاں فوراً پیچھے ہٹا اور خواص خان اور سعید خان نامی سردار آگے بڑھے۔ انھیں دیکھتے ہی آپ نے فرمایا: "بے وقوفو تمھارے

سر تمہارے کاندھوں سے کہاں چلے گئے؟ وہ تو میدان میں لُڑھکتے پھر رہے ہیں، جن کا سر کٹ چکا ہو وہ بادشاہ سے جنگ کس طرح کریں گے!"

باغی سردار اپنے نوشتۂ تقدیر پڑھ چکنے کے بعد بھی سلیم شاہ کے مقابلے میں اتر پڑے اور اُسے حکم دیا کہ "حکومت ہمارے حوالے کر کے گوشہ نشینی یا اطاعت اختیار کرلو۔"

سلیم شاہ نے دولہ خان کو ایک بار پھر ولایت شاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور پوچھا کہ "ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

آپ اس وقت مٹی کی دیوار کھڑی کر رہے تھے، دولہ خاں کو دیکھتے ہی فرمایا۔ "تو ناحق آیا، ہم تو پہلے ہی سے اس کا پشتیبان تعمیر کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر گیلی مٹی دیوار پر کھینچ ماری جو چپک گئی۔ دولہ خاں سے اس چھوبرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سلیم شاہ کا اقتدار جم چکا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یہ مٹی چپک گئی ہے!"

باغی سرداروں سے زور کا معرکہ کارزار گرم ہوا اور ان میں سے بعض سردار شکست کھا کر قتل ہوئے اور بعضوں نے بھاگ کر دُور دراز پہاڑیوں میں رُوپوشی اختیار کی۔



آپ کی زبان سے جو بھی نکلا، ظاہر ہو کر رہا، احکام ارشاد کی صورت میں صادر ہوتے تھے اور اس کا مفہوم حقیقی اُس وقت سمجھ میں آتا تھا جب آپ کا حکم واقعے کی شکل میں ظاہر ہوجاتا تھا۔

ایک صاحب آپ کے حجرے کے باہر سے اندر کی طرف جھانکنے لگے۔ آپ نے بھی اُسے دیکھ لیا، فرمایا۔ "اندر کیا دیکھتا ہے، اپنے سر پر دیکھ لے۔"

اس نے گھبرا کر اپنا سر ٹٹولا، اور کہنے لگا۔ "سر پر تو کچھ بھی نہیں حضرت شاہ صاحب!"

آپ نے حقارت سے فرمایا۔ "خوب، اپنے سر کا کوا تجھے نظر نہیں آتا!"

وہ شخص خوش خوش وہاں سے ہٹ آیا اور لوگوں سے فخریہ کہنے لگا۔ "آج تو شاہ صاحب نے میرے لیے بھی کچھ ارشاد فرمادیا۔"

لوگوں نے پوچھا۔ "شاہ صاحب نے کیا فرمایا؟"

اس نے جواب دیا۔ "آپ نے میرے سر پر کوے کی موجودگی کی بشارت دی ہے۔"

اور اس بشارت کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ کچھ عرصہ بعد اسی شخص کو سُولی پر چڑھا دیا گیا اور جب وہ مر گیا تو اُس کی لٹکی ہوئی لاش کے سر پر کوّے۔ بیٹھتے اور کائیں کائیں کر کے شور مچاتے رہے۔

اسی طرح ایک سیدزادے گڑ اور چنے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان چنوں میں سے چار مٹھیاں سیدزادے کے حوالے کر دیں اور فرمایا۔ "ہم کیا کریں تیری قسمت۔ یہی چار مٹھیاں تیری قسمت میں ہیں۔"

سیدزادہ ان کلمات پر غور کرتا گھر پہنچا تو معلوم ہوا، سرکاری دیوان کا ہرکارہ آیا تھا، وہ کہتا تھا کہ تنخواہیں تقسیم ہو رہی ہیں حاضر ہو کر اپنی تنخواہ وصول کرلو۔"

سیدزادہ چار سال سے پریشان تھا اور اسے تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ سیدزادے نے کہا۔ "میں تو سرکاری ملازمت ہی سے بیزار ہوں۔ مجھے نہیں چاہیے تنخواہ ونخواہ۔ چار سال سے تو ملی نہیں اب کیا ملے گی۔"

دیوان کا آدمی پھر آیا اور سیدزادے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں دیکھا ایک ہجوم اکٹھا ہے اور لوگ اپنی تنخواہیں وصول کر رہے ہیں، انھیں تین تین ماہ کی تنخواہیں دی جا رہی تھیں۔ سید زادے کو دیکھتے ہی دیوان نے منشی کو حکم دیا۔ "ان کا سارا حساب بے باق کر دیا جائے۔"

منشی نے ناگواری سے کہا۔ "سب کو تو تین تین ماہ کی تنخواہ دی جارہی ہے انھیں پورا حساب کس طرح دیا جائے! ہاں ان کے ساتھ اتنی رعایت ضرور کرسکتا ہوں کہ بجائے تین ماہ کے چار ماہ کی تنخواہ دے دوں۔"

دیوان نے کہا۔ "اچھا چار ہی ماہ کی تنخواہ دے دو بقیہ کا حساب کتاب ہوتا رہے گا!"

چنانچہ سیدزادے کو چار ماہ کی تنخواہ دے دی گئی اور بقیہ کا حساب انھیں زندگی بھر نہ مل سکا۔

یہ عظیم ہستی نوّے سال زندہ رہی اور مرجع خاص و عام رہی، بڑے بڑے بادشاہ یہاں معمولی آدمیوں کی طرح اپنے مستقبل کا فیصلہ سُننے آیا کرتے تھے اور بڑے بڑے سرکش جب اس چوکھٹ میں داخل ہوتے تھے تو اُن کی حیثیت حضرت ولایت شاہ کی نظر میں روباہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔



سب رنگ

Scanned with CamScanner

اشرف الاولیا

ضیا تسنیم بلگرامی



سفر چاہے زندگی کے دنوں کے شمار کا ہو یا اعمال کی ادائیگی کے معیار کا... گزر ہی جاتا ہے... نتائج اور مرتبوں کی باری تو سب سے آخر میں آتی ہے اور ان مرتبوں کی تقسیم کا اختیار صرف اور صرف اس قادرِ مطلق کو ہے جو اس کل کائنات کا تنہا مالک و مختار ہے... اور جس نے اپنے اس مالک کو پہچان لیا گویا اپنی آخرت کو سنوار لیا... کچھ دیدہ ور ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف اپنی ذات اور آخرت کو بچا لیا بلکہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو بھی اندھیری غاروں سے نکال لیا... ایسے بزرگانِ دین کے ذریعے ہی اس کائنات میں بھلائی کا سلسلہ چلتا رہا ہے... کہ آخر اُس مالکِ کل کو اپنی اس مخلوق سے حد درجہ پیار ہے... اسی لیے ان کی رہنمائی کے لیے کبھی بھی اور کہیں بھی اپنے ولیوں کو ظاہر کر دیتا ہے... انہی ولیوں میں سے ایک ولی کی عبرت اثر روداد

دورِ جدید جیسے صاف گریبانہ کے حامل اولیائے کرام کا سبق آموز سلسلہ

عراق کے علاقہ سمنان پر جو حاکم برسرِ اقتدار تھا، اس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام محمد اشرف تھا، دوسرے کا محمد سلطان۔ یہ سادات گھرانا تھا۔ باپ کی اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ تھی۔ ان میں محمد اشرف غیر معمولی ذہین تھا۔ ذہانت کے ساتھ بردباری، تحمل اور حلم بھی اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس میں ہر بات غیر معمولی تھی۔ ابھی سات سال کا تھا کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ کچھ اور عمر بڑھی تو منقولات اور معقولات سے بھی فارغ ہو گیا۔ والدین بہت خوش تھے۔ باپ

اس لیے خوش تھا کہ اس کے بعد اس بیٹے کو سمنان کی حکومت سنبھالنا تھی۔ ماں اس لیے کہ بیٹے میں اپنی ماں کا احترام غیر معمولی تھا اور وہ اپنی خواہش اور مرضی پر اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کو ترجیح دیتا تھا۔

حاکم باپ اپنے دونوں بیٹوں کا وقتاً فوقتاً امتحان لیتا رہتا۔ ایک دن وہ دربار سے اٹھ کر محل کے اندر پہنچا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ ایک ایسا مقدمہ اس کے سامنے پیش ہوا تھا جس کا ایک فریق نہایت بااثر اور چالاک شخص تھا۔ اس کے حاکم سے ذاتی تعلقات بھی تھے اور دوسرا فریق ایک گمنام اور معمولی شخص تھا۔ اس کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ گمنامی کے علاوہ اس میں ایک اور کمزوری بھی پائی جاتی تھی۔ وہ کم گو بھی تھا، زیادہ باتیں نہیں بنا سکتا تھا۔ چالاک شخص نے اس کی زمین پر قبضہ کرلیا تھا اور دلیلوں اور جعلی ثبوتوں سے اس پر اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا جبکہ کمزور شخص اپنا حق ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ حاکم یہ محسوس تو کررہا تھا کہ کم گو اور گمنام شخص سچا ہے مگر وہ دلائل اور فرضی ثبوت اس کی تردید کررہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا فیصلہ کرے، لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ کمزور اور کم گو فریق کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ تذبذب اور فکرمند دربار سے اٹھ کر محل کے اندر پہنچا تو اس کے سامنے پہلا شخص جو آیا وہ اس کا بیٹا محمد اشرف تھا۔ بیٹے نے فکر اور پریشانی کے آثار اپنے باپ کے چہرے پر دیکھے تو سوال کیا۔ ”باواجان! خیریت تو ہے؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

حاکم باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے اشرف! تو میری پریشانیوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ تو خود حکومت نہ سنبھال لے۔ حکومت اپنی جگہ ایک دردسری ہے۔“

بیٹے نے سن کر عرض کیا۔ ”باواجان! اگر یہ بات ہے تو اس دردسری سے پیچھا چھڑائیے۔“

حاکم باپ نے جواب دیا۔ ”لیکن اس دردسری میں ایک مزہ بھی ہے۔ حکومت اور اختیار، بادشاہت اور اقتدار بڑے مزے کی چیز ہے۔ اس مزے پر دردسری قربان، یہ احساس کہ میں اپنی سلطنت اور حدود سلطنت کا سب سے بڑا اور سب سے باعزت شخص ہوں مجھے ایک نشہ اور سرور بخشتا ہے۔ اس نشے اور سرور پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔“

بیٹے نے باپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، کہا۔ ”باواجان! میری یہ مجال نہیں کہ آپ سے اختلاف کروں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اقتدار اور اختیار کا نشہ کیسا اور کیا ہوتا ہے، لیکن اپنی ناقص عقل سے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نشہ کوئی سا بھی ہو حرام ہے کیونکہ ہر قسم کا نشہ عقل وخرد اور تمیز اور شعور پر حاوی آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ زہد وورع کا نشہ بھی، ابلیس کا نشہ ہی تو تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے روک دیا۔ نشہ میں تکبر اور غرور کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی چیز اس کو حرام قرار دیتی ہے۔“

باپ بیٹے کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”اشرف! مجھے تیری باتوں نے بہت متاثر کیا، لیکن تجربے نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اقتدار اور اختیار سے اس کے نشہ اور سرور کو دور کردیا جائے تو حاکم بادشاہ نہیں رہ جاتا، درویش بن جاتا ہے۔ حکومت رعب اور دبدبے کا تقاضا کرتی ہے۔ بادشاہت اور حشم وشکوہ لازم وملزوم ہیں۔“

بیٹا بھی باپ سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ جواب دیا۔ ”سادگی، فروتنی، عدل اور حق پر قائم رہنے کا عزم اور ارادہ وہ ان سے زیادہ رعب اور دبدبہ کس بات میں ہوسکتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا جلال کن باتوں سے قائم ہوا تھا۔ وہاں رعب وشکوہ اور دبدبہ کن ستونوں پر کھڑا ہوا تھا۔ رعب اور دبدبہ، جو حشم وعزم اور شان وشکوہ کے ستونوں پر قائم کیا جائے، مضبوط اور پائیدار نہیں ہوتا۔ اپنے شاندار اور سچے کردار کا شکوہ اور دبدبہ ہی ایسی چیز ہے جو جھوٹ اور تکبر کو پاس نہیں آنے دیتا۔“

باپ کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہوگئی جو کسی قیمتی شے کے پالینے سے پیدا ہوتی ہے، بیٹے سے پوچھا۔ ”تو تو خاصا عالم، عاقل اور دلائل وبراہین کا خزینہ نظر آتا ہے، ذرا یہ تو بتا حکومت کی بنیاد کن چیزوں پر قائم ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”عدل وانصاف پر، لوگوں کا خیال ہے کہ عدل کی آنکھیں نہیں ہوتیں اس لیے یہ کسی سے مرعوب یا متاثر نہیں ہوتا۔ جو بھی اس کی زد میں آجاتا ہے، عدل کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔“

باپ نے شوخی اور فخر کے ملے جلے جذبے سے پوچھا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ عدل وانصاف کی آنکھیں نہیں ہوتیں مگر تو کیا کہتا ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”میں کہتا ہوں کہ عدل وانصاف کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ تیز اور باطن میں اتر جانے والی نظریں جو سچ اور جھوٹ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ عدل وانصاف کا کوئی کنبہ نہیں ہوتا، کوئی خاندان نہیں ہوتا اس لیے جو بھی اس کی زد میں آجاتا ہے اس کے لطف وفیض سے محروم نہیں رہتا۔ اس کی دسترس سے باہر نہیں ہوتا، اس کے

سامنے حق دار شاداں و فرحاں اور غاصب لرزاں و ترساں رہتا ہے۔''

باپ نے اپنے بیٹے کے سامنے اپنا مقدمہ رکھ دیا۔ وہ مقدمہ جس کا ایک فریق چالاک اور باتونی ہے اور دوسرا فریق کمزور، گمنام اور کم گو۔ ساری تفصیل بیٹے کے گوش گزار کر دی اور آخر میں پوچھا۔ ''بیٹے تو ہی بتا کہ مجھے اس مقدمہ میں کیا کرنا چاہیے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وہ قول ہمیشہ یاد رکھیں، جو آپ نے خلافت سنبھالتے ہی ارشاد فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ امیر المومنین ہو جانے کے بعد ان کی نظر میں طاقتور کمزور ہے اور کمزور طاقتور۔ طاقت ور معاشرے میں کتنا ہی اونچا اور شاندار مقام کیوں نہ رکھتا ہو، اگر وہ حق پر نہیں ہے تو میری نظر میں کمزور ہے۔ معاشرے کا وہ شخص جو نادار، غریب، کمزور اور گمنام ہے مگر ساتھ ہی حق کی طاقت رکھتا ہے تو وہ میری نظر میں طاقتور ہے۔ حضرت صدیقؓ کے اس قول میں اقتدار و اختیار اور عدل و انصاف کا ابدی اور دائمی منشور موجود ہے۔ اَنمٹ اور ناقابل تسخیر، آپ بھی اس کو مشعل راہ بنائیے، کبھی دھوکے یا خسارے میں نہیں رہیں گے۔''

باپ نے خوشی میں بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ ''تو شاندار بیٹا ہے، میں تجھ پر فخر کرتا ہوں، میں تیرا باپ ہوں لیکن تیری باتوں نے مجھے بتایا کہ میں تیری رہنمائی میں شاندار حکومت کر سکتا ہوں۔''

بیٹے نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''باوا جان! میری رہنمائی میں نہیں، یہ فرمائیے کہ میرے صلاح و مشوروں سے۔ آپ کے سابقہ تجربے ہیں جبکہ میں ان سے محروم ہوں۔ ایک بادشاہ کو اپنے عدل و انصاف کے لیے اور بہت سی چیزیں بھی درکار ہوتی ہیں اور ان کا حاصل ہونا تجربوں کا رہین منت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آپ وسیع تجربات کے حامل اور مالک ہیں۔''

باپ نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تو شاندار حکومت کرے گا، مثالی اور قابل تقلید۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! حکومت دردسری ہے اور میں اس دردسری سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔''

باپ نے کہا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے، تو تو میرا ولی عہد ہے اور میرے بعد تجھی کو اقتدار سنبھالنا ہے، کل سے تو میرے ساتھ رہے گا اور کاروبار سلطنت میں میری مدد کرے گا۔''

بیٹے نے عرض کیا۔ ''میں حاضر ہوں اور یہ میری مجال نہیں کہ آپ سے اختلاف کروں لیکن اندر سے میرا دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''جب تو عملاً میرا شریک کار ہو جائے گا تو تیرا دل بھی لگنے لگے گا۔''

اس کے بعد دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر دونوں کے دل الگ الگ خوشیوں، خیالوں، فکروں اور اندیشوں سے معمور تھے۔ حاکم باپ خوش تھا کہ اس کا ولی عہد نہایت لائق و فائق اور دانا و بینا نوجوان ہے اور بیٹا فکر مند اور اندیشوں و وسوسوں میں گھر گیا تھا۔ وہ حکومت اور اقتدار کو ایک مصیبت اور عذاب سمجھ رہا تھا جو اس کی طمانیت اور سکون کو برباد کرنے کے درپے تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کس طرح پیچھا چھڑائے؟ کس طرح نجات حاصل کرے؟

☆☆☆

دوسرے ہی دن باپ نے بیٹے کو اپنے پاس بٹھا لیا، معاملات حکومت اور امور سلطنت میں بیٹے کے مشورے شامل ہو گئے۔ بیٹے محمد اشرف کو پہلے ہی دن یہ محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر رکھ دیا گیا ہے اور وہ اس بوجھ میں دبا چلا جا رہا ہے، اس بوجھ نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف کر دی تھی اور اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کسی اور طرف دیکھ سکتا۔ وہ اوراد و وظائف اور ذکر و فکر جن سے دل و دماغ کو ایک خاص قسم کی روشنی عطا ہوئی تھی، عدیم الفرصتی کی نذر ہو گئے، اشرف نے اپنے اس کرب کو کئی دن تک چھپائے رکھا اور اس دکھ کو جھیلتا رہا لیکن جب یہ محسوس کیا کہ آنے والے دنوں میں روشنی اور ہدایت کے ان ماخذوں سے مستقل ہی محروم ہو جانا پڑے گا تو ایک دن باپ سے عرض کیا۔ ''باوا جان! ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں، اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں!''

باپ نے خوشی خوشی جواب دیا۔ ''کہو کہو، میں ناراض نہیں ہوں گا، تیرے جیسے عقل مند اور سعادت مند بیٹے سے کون ناراض ہو سکتا ہے؟''

بیٹے نے عرض کیا۔ ''باوا جان! سچی بات تو یہ ہے کہ میں کاروبار سلطنت کے بکھیڑوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں کیا یہ

مناسب نہیں ہے کہ آپ اپنے ساتھ بھائی سلطان کو بٹھائیں اور مجھے... اوراد و وظائف اور ذکر وفکر میں مشغول رہنے دیں۔"
باپ نے جواب دیا۔ "بیٹے! میں ذکر وفکر اور اوراد و وظائف کی مخالفت نہیں کروں گا لیکن ولی عہد تو ہے، اس لیے یہ حکومت تجھی کو سنبھالنا ہے، سلطان تیرے بعد ہے، اور اوراد و وظائف اتنے ضروری نہیں ہیں جتنی حکومت۔"
بیٹے نے عرض کیا۔ "باوا جان! یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو مجھے آپ سے دور اور مختلف رکھتا ہے۔ میں آپ کی بات کو یوں دہراؤں گا کہ حکومت اتنی ضروری نہیں ہے جتنے اوراد و وظائف اور ذکر وفکر، فرق اپنے اپنے نقطۂ نظر اور انداز فکر کا ہے۔ یہ حکومت یا اقتدار کوئی چیز نہیں۔ انہیں روشنی اور شعور کہاں سے ملتا ہے؟ اس تخرج اور منبع کو زیادہ اہمیت حاصل ہے حکومت اور اقتدار کے مقابلے میں۔"
باپ فکر مند ہوگیا۔ سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہا۔ "میں تجھ سے اختلاف نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ بیٹے، بادشاہی اور درویشی دو الگ الگ چیزیں ہیں، یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔"
بیٹے نے جواب دیا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن میرا اپنا کچھ اور ہی خیال ہے درویشی میں شاہی تو سما سکتی ہے مگر شاہی میں درویشی نہیں سما سکتی۔"
باپ نے بیٹے سے زیادہ بحث نہیں کی، لیکن بیٹے کے فطری اور طبعی رجحان نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔
اب باپ نے دوسرا ہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ بیٹے کو زیادہ تر اپنے ہی پاس رکھتے تاکہ اس پر جاہ و مرتبے اور حکومت کا رنگ چڑھ جائے اور وہ اقتدار اور اختیار کے نشے میں مبتلا ہوجائے۔ اشرف نے دلچسپی بھی خوب لی اور بڑی محنت، دیانتداری اور لگن سے باپ کا ہاتھ بٹایا لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ان کا اپنا رنگ مستقل اور گہرا تھا جس پر اور کوئی رنگ نہیں چڑھ رہا تھا۔
باپ کا انتقال ہوگیا۔ سمنان کی حکومت محمد اشرف کے حصے میں آئی۔ انہوں نے کاروبارِ سلطنت پر پوری توجہ دینے کی کوشش کی لیکن دل بار بار اچاٹ ہوجاتا۔ آخر اپنے چھوٹے بھائی محمد سلطان کو بھی کاروبارِ سلطنت میں شریک کرلیا اور اس سے کہا۔ "سلطان! تو پوری آزادی اور توجہ سے میرا ہاتھ بٹا کیونکہ بہت ممکن ہے کہ آخرکار میرے حصے کا کام بھی تجھی کو انجام دینا پڑے۔"
چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے حکم پر عمل کیا اور حکومت کے کاموں میں منہمک ہوگیا۔ اشرف نے ایک بار پھر خود کو ذکر وفکر اور اوراد و وظائف میں مشغول کرلیا۔ پورے سمنان میں ایک بات مشہور تھی وہ یہ کہ ہر طرف امن وامان اور عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔ طاقتور خوفزدہ تھے اور ان میں اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ طاقت کے نشہ میں کسی کمزور پر ہاتھ ڈال دیں، کمزور خوش اور اکڑے پھر رہے تھے کہ وہ ظالموں اور سرکشوں سے محفوظ تھے۔
ایک رات وہ سوئے تو گہری نیند نے غلبہ کرلیا۔ فجر کی اذان سے ذرا پہلے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی سفید پوش جس کی شکل نظر نہیں آرہی تھی ان کے پاس کھڑا کہہ رہا ہے۔ "اشرف اٹھ! سمنان کو چھوڑ دے!"
انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ "سمنان کو کیوں چھوڑ دوں؟ یہاں میری حکومت ہے، یہ کام کس پر چھوڑوں؟"
سفید پوش نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، یہ میرا حکم نہیں ہے، حکم ربی ہے۔ سمنان کی حکومت کو لات مار دے اور ہندوستان چلا جا۔ وہاں تیرا انتظار کیا جارہا ہے۔"
انہوں نے پوچھا۔ "ہندوستان میں کہاں؟ اور وہاں کون میرا انتظار کررہا ہے؟"
سفید پوش نے تنبیہہ کی۔ "جب یہ کہہ دیا گیا کہ یہ حکم ربی ہے تو تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ تو یہ پوچھے کہ ہندوستان میں میرا کون انتظار کررہا ہے؟"
یہ ڈر گئے، بولے۔ "اے شخص میں تجھ کو نہیں پہچانتا لیکن اب سوال جواب کا سلسلہ بند، تو میرے رب سے کہہ دے کہ اس کا حکم میں نے سن لیا اس پر کل ہی عمل درآمد ہوگا۔"
سفید پوش نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر جواب کا انتظار کرکے جب انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور سفید پوش کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پورے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگے۔ اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ کمرے میں ہر طرف سناٹا تھا، خاموشی تھی لیکن

پورے کمرے میں خس کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ اشرف نے زور زور سے سانس کھینچی اور خوشبو سونگھنے لگے۔ کچھ دیر تو یہ خوشبو رہی اس کے بعد آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی۔

انہوں نے اٹھ کر فجر کی نماز ادا کی اور سیدھے ماں کے پاس پہنچ گئے۔ ماں کو سلام کر کے عرض کیا۔ ''مادر محترم! میں سمنان کی حکومت سلطان کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اجازت مطلوب ہے۔''

ماں نے حیرت سے سر سے پاؤں تک اشرف کو دیکھا اور پوچھا۔ ''بیٹے! کسی تمہید کے بغیر تو نے اتنی بڑی بات کہہ دی، خیریت تو ہے؟''

اشرف نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت تک رکا رہوں گا جب تک کہ آپ مجھے اجازت نہ دے دیں گی کیونکہ میں کوئی کام بھی آپ کی اجازت اور منظوری کے بغیر نہیں کر سکتا۔''

ماں نے پوچھا۔ ''اچھا پہلے یہ بتا کہ یہ ایک دم ہجرت کا خیال کیونکر آ گیا تیرے دل میں؟''

اشرف نے جواب دیا۔ ''مادر محترم! یہ میرا خیال نہیں ہے، حکم ربی ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس کو ٹال جاؤں۔''

ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ دیر بیٹے کی صورت دیکھتی رہیں پوچھا۔ ''کیا تجھے اس بات کا یقین ہے کہ تجھے جو حکم ملا ہے وہ حکم ربی ہی ہے؟''

اشرف نے جواب دیا۔ ''مادر محترم! مجھے جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل میں شر اور فساد مضمر نہیں ہیں۔ بس اس بات نے یہ باور کرا دیا ہے کہ یہ واقعی حکم ربی ہی ہے۔''

ماں کو بے حد افسوس تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا۔ لیکن حکم ربی کے خلاف کچھ بول بھی نہ سکتی تھیں، جواب دیا۔ ''جب خدا کی مرضی یہی ہے کہ تاج و تخت سے دستبردار ہو جائے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں، الحکم اللہ (اللہ کے حکم کے سوا کوئی حکم نہیں) تجھے جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کر۔''

اشرف نے اپنے چھوٹے بھائی محمد سلطان کو سمنان کی حکومت سونپی اور ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ ماں نے اشک آلود آنکھوں اور جگر سوختہ کیفیت میں اشرف کو مخاطب کیا۔ ''بیٹے! اب کہاں ملاقات ہوگی؟ قیامت میں یا اسی دنیا میں دوبارہ بھی؟''

اشرف نے جواب دیا۔ ''مادر محترم! مجھے کچھ پتا نہیں لیکن دلوں کی قربت ہمیں ہمیشہ قریب رکھے گی۔''

ماں نے شدتِ غم سے منہ پھیر لیا۔ اشرف نے ہندوستان کے بجائے ماوراء النہر کا رخ کیا۔ وہاں سے بخارا گئے پھر سمرقند پہنچ گئے۔ وہ ان مقامات میں موجود بزرگوں سے ملے اور مزارات مقدسہ پر حاضری دی۔ سمرقند سے ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اور اوچھ (ملتان) میں قیام کیا، یہاں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سید اشرف کو خوش آمدید کہا اور چند دن ان کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ پھر دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور اپنے رب کے حکم پر بہار روانہ ہو گئے۔ بہار کے قصبے منیر میں قیام کیا۔ یہاں مشہور بزرگ شرف الدین یحییٰ منیری کا جنازہ ان کے انتظار میں تھا، آپ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی اور ان کے مزار پر مراقبہ فرمانے لگے۔ اس کے بعد بنگال کا رخ کیا۔

آپ جہاں بھی رکے، لوگوں پر اپنے اثرات چھوڑے اور انہیں اپنا گرویدہ کر لیا۔

ان دنوں بنگال میں مشہور چشتی بزرگ شیخ علاؤالدین علاء الحق تشریف فرما تھے۔ یہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس میں بھی لوگ حکومت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے، شیخ علاء الدین علاؤ الحق علمی حیثیت سے اتنے بڑے آدمی تھے کہ بڑے سے بڑا منصب حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیا کو حقارت کی نظروں سے دیکھا اور ٹھکرا دیا۔ ان کی ثروت کا یہ عالم تھا کہ ان کی خانقاہ سے ہزاروں آدمی روزانہ اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

شیخ علاؤالدین کے مریدوں میں ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے اپنے شیخ کی زیارت اور خلافت حاصل ہو لیکن آپ خاموش رہتے اور اگر اس کا ذکر بھی ہوتا تو سکوت اختیار فرماتے۔

ایک مرید زہد و ریاضت میں سب پر فضیلت رکھتا تھا اس لیے اس کو زعم ہو گیا تھا کہ اس کو اپنے شیخ کی جانشینی کا شرف

حاصل ہوگا لیکن جب اپنے پیرومرشد کے رویے پر غور کرتا تو مایوس ہو جاتا۔ اس نے سوچا یوں تو پیرومرشد خاموش ہیں اور اپنی خلافت اور نیابت کے سلسلے میں اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں کہتے اس لیے اگر بات کر کے کریدا جائے اور ان سے وضاحتیں حاصل کر لی جائیں تو کیا ہرج ہے۔ چنانچہ وہ ساری رات کی بے چینی، کرب اور اضطراب کے بعد اپنے پیر کی خدمت میں جا کھڑا ہوا۔ شیخ علاؤالدین نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

مرید کچھ دیر کھڑے رہ کر اپنے پیرومرشد کی توجہ کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا، اپنے مرشد کے قدموں میں بیٹھ گیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ کی توجہ کے انتظار میں کھڑا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''توجہ کے انتظار میں کھڑے رہنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ روشن ضمیر ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ توجہ سے میری مراد کیا ہے؟''

علاؤالدین نے جواب دیا۔ ''میں نے تجھ پر کب توجہ نہیں دی؟''

مرید نے اصرار کیا۔ ''حضرت! وہ توجہ جس کا میں طالب ہوں، ابھی تک نہیں ملی اور نہ ہی آپ کی طرف سے کوئی ایسا اشارہ ملا جس سے میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھ پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہیں جتنے کا میں امیدوار ہوں۔''

آپ نے افسوس سے کہا۔ ''اے شخص! افسوس کہ تو جس شے کا طالب ہے وہ طلب کرنے سے نہیں ملتی۔ اگر تجھے اپنی عبادات اور ریاضت پر کچھ زعم ہے اور اس کی وجہ سے تو یہ سمجھنے لگا ہے کہ تو تصوف میں کسی بلند مرتبے کا مستحق ہو گیا ہے تو یہ تیری بھول ہے کیونکہ تیرا یہ زعم مرتبہ و مقام کے حق میں زہر ہے۔ اس قسم کا زعم تھا جس نے معلم الملکوت کو ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار کر دیا۔ جو کچھ ملنا ہے مل جائے گا۔ مطالبہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تو اس کو اپنا حق سمجھ کر زبردستی حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

مرید نے شرمندگی سے عرض کیا۔ ''یہ میرا اپنا ہی خیال نہیں ہے، میرے جملہ مرید بھائیوں کا یہی خیال ہے کہ آپ کی نیابت اور خلافت کا مجھ سے بہتر کوئی دوسرا امیدوار نہیں ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مشیت ایزدی تیری یا تیرے مرید بھائیوں کی تابع تو نہیں، حکم ربی کیا ہے اور کس کے لیے ہے کوئی نہیں جانتا اور جس بات کا انسان کو علم نہ ہو اس میں خاموشی اور تسلیم و رضا بہتر ہے۔''

مرید بہت دل برداشتہ ہوا کیونکہ اپنی باتوں سے پیرومرشد نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ اپنے اس مرید کو اپنی خلافت اور نیابت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ دل برداشتہ ہو کر عرض کیا۔ ''تب پھر اسے پیرومرشد میں یہ سمجھ لوں کہ میں آپ کی خلافت اور نیابت کا مستحق نہیں ہوں؟''

پیرمرشد نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ بات تو نہیں کہی۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت آپ نے واضح طور پر تو یہ بات نہیں کہی لیکن گفتگو سے مترشح یہی ہوتا ہے۔''

مرشد نے جواب دیا۔ ''انتظار کر، انتظار کر۔ مجھے جس شخص کا انتظار ہے وہ بس آیا ہی چاہتا ہے۔''

مرید کو یہ بات ناگوار گزری۔ ''کیا کوئی شخص باہر سے آ رہا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ہاں بہت دور سے، عراق سے، وہ ماوراء النہر، بخارا، سمرقند، ملتان، دہلی، بہار کے قصبے منیر سے گزر کر ہمارے پاس آ رہا ہے، خدا عالم الغیب ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون کس مرتبے کا ہے اور کس کا کون سا منصب ہے؟''

اب تو مرید بالکل ہی مایوس ہو گیا، آہستہ سے بولا۔ ''تب پھر تو میری ساری عبادات اور ریاضت بیکار گئی۔''

مرشد نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''اگر شب و روز عبادات اور ریاضت کے بعد بھی میں آپ کی خلافت اور نیابت حاصل نہ کر سکا تو میں اس کے سوا اور کیا سمجھوں گا کہ میری ساری عبادات اور ریاضت بیکار گئی۔''

مرشد علاؤالدین ناراض ہو گئے، جواب دیا۔ ''اگر تیرے اپنی عبادات اور ریاضت کے بارے میں یہ احساسات اور خیالات ہیں تو فضول اور بے بنیاد ہیں اور میں بھی یہی کہوں گا کہ تیری ساری عبادات اور ریاضت بیکار گئی۔''

مرید دل برداشتہ ہو کر چلا گیا۔ باہر دوسرے مریدوں کو جب اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ آخر وہ کون شخص ہے جو عراق سے چل کر ان کے پیرومرشد کی نیابت اور خلافت سنبھالنے آ رہا ہے۔

ایک دن صبح سویرے علاؤ الدین ہشاش بشاش اپنے حجرے سے نکلے اور مریدوں کو اپنے آس پاس جمع کر لیا، ان میں وہ مرید بھی تھا جس کو اپنے زہد و ورع پر بڑا ناز تھا۔

شیخ علاؤ الدین نے ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور آنکھیں بند کر کے نہایت انہماک سے کچھ سوچتے رہے پھر مریدوں سے پوچھا۔ ''لوگو! ذرا غور تو کرو، ہوا میں سونگھو اور بتاؤ کہ تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' جملہ مریدوں نے پورے انہماک اور یکسوئی سے ہوا میں سونگھا اور غور کرنا شروع کر دیا اور جب وہ کچھ بھی محسوس نہ کر سکے تو اعلان کیا۔ ''پیرومرشد! ہمیں تو کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔''

مرشد نے اپنے...... اس مرید کو مخاطب کیا، جو خلافت و نیابت کا امیدوار تھا۔ ''تو کیا کہتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مجھے بھی کچھ محسوس نہیں ہو رہا!''

مرشد نے مسکرا کر کہا۔ ''ارے بھائی! مجھے تو ہواؤں میں بوئے دوست محسوس ہو رہی ہے۔ میرا دوست، میرا خلیفہ، میرا نائب، میرا جانشین آ رہا ہے، تیزی سے بڑھا چلا آ رہا ہے، آؤ ہم سب اس کے استقبال کو چلیں۔''

مریدوں نے حیرت اور تعجب سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنا شروع کیا۔

انہوں نے کہا۔ ''ایک دوسرے کی شکلیں نہ دیکھو، میرے ساتھ چلو، اس کی سواری شہر کے قریب آ چکی ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ شہر میں داخلے سے پہلے ہی اس کے استقبال کو پہنچ جائیں۔''

مریدوں کو اپنے پیرومرشد کے حکم کی تعمیل میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا، فوراً ساتھ ہو لیے لیکن مریدِ خاص بے دلی اور بے رغبتی سے سب کے پیچھے رہا۔

شہر سے نکلتے ہی انہوں نے مغرب سے اٹھنے والے گرد و غبار کو دیکھا۔ علاؤ الدین نے اپنے مریدوں کے ساتھ آم اور نیم کے درختوں کے سائے میں قیام کیا اور گرد و غبار پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ یہ گرد و غبار جو صبح کی سنہری دھوپ کو دھند سے آلودہ کر رہا تھا، آہستہ آہستہ کم...... ہونے لگا اور اس میں سے اکادکا آدمی، مویشی اور گھوڑوں پر سوار مسافر نمودار ہونے لگے۔ آپ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میرا دوست اس قافلے میں شامل مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔''

مریدوں کا اشتیاق بڑھا اور قافلے کے استقبال کو آگے بڑھے پھر ایک مرید نے واپس آ کے پوچھا۔ ''پیرومرشد! آپ جس کے استقبال کو نکلے ہیں اس کا نام کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس کا نام معلوم کر کے کیا کرو گے؟''

مرید نے عرض کیا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ اس کے آنے سے پہلے ہم اس قافلے میں پہنچ جائیں اور اس سے مل کر یہ خوشخبری پہنچا دیں کہ تو وہ خوش قسمت شخص ہے جس کے استقبال اور پیشوائی کو حضرت پیرومرشد تشریف لا رہے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس سے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے اس کا نام شیخ محمد اشرف سمنانی ہے اور عراق کے علاقہ سمنان پر اس کے آبا ؤ اجداد حکومت کرتے رہے وہ خود حکومت کو لات مار کر ہمارے پاس آ رہا ہے۔''

ایک مرید نے عرض کیا۔ ''کیا نام بتایا؟ شیخ محمد اشرف سمنانی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں اس کا یہی نام ہے۔''

مریدوں میں سے ایک نے پوچھا۔ ''اور یہ بھی درست ہے کہ اس نے اپنی حکومت کو لات مار دی ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس نے اپنی آبائی حکومت کو لات مار دی اور رشد و ہدایت کی خاطر ہندوستان چلا آیا۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''تب پھر میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو اس شاندار اور قابلِ تعظیم شخص کا استقبال سب سے پہلے کرے گا۔''

آپ نے خوشی کا اظہار کیا، فرمایا۔ ''خدا جس کو توفیق دے، وہ سرخرو اور کامران ہوتا ہے۔''

مرید تیزی سے آتے ہوئے قافلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ قافلے تک پہنچنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

قافلے میں داخل ہوتے ہی اس نے بہ آواز بلند دریافت کیا۔ ''میں اشرف سمنانی کے استقبال کے لیے حاضر ہوا ہوں نا صورت آشنا ہونے کے سبب میں ان کے پاس خود سے نہیں پہنچ سکتا، اس لیے میری رہنمائی کی جائے۔''

مرید نے قافلے میں اس سرے سے اس سرے تک بار بار یہی آواز بلند کی تو اشرف سمنانی نے اسے اپنے پاس بلایا اور

عاجزی سے عرض کیا۔ ''اے شخص! تجھ کو جس کی تلاش ہے وہ میں ہوں، لیکن یہ تو بتا کہ میری آمد کا علم تجھ کو کس طرح ہوا؟ میرا غائبانہ تعارف کس نے کرایا؟''

مرید نے آپ سے مصافحہ کیا اور دونوں ہاتھوں کو پیشانی سے لگا کر چوم لیا، عرض کیا۔ ''حضرت! میں شیخ علاؤالدین چشتی کا ایک حقیر سا مرید ہوں، میرے پیرو مرشد نے اپنے تمام مریدوں کو مطلع کیا کہ ان کا ایک دوست آ رہا ہے تو ہم سب آپ کے مشتاق ہو گئے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تمہارے پیرو مرشد نے تمہیں کیا بتایا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''انہوں نے بتایا کہ ہوا میں بوئے دوست شامل ہے، ایک دوست سمنان سے چل کر ماوراء النہر، بخارا، سمرقند، ملتان اور منیر ہوتا ہوا ان کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سب چلو تاکہ اس کا استقبال کیا جائے۔''

سید اشرف بہت متاثر ہوئے، بے چینی سے پوچھا۔ ''پھر؟ پھر کیا ہوا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''پھر وہ اپنے مریدوں کے ساتھ شہر کے باہر آ گئے۔ میں نے سوچا کہ استقبال تو سب ہی کریں گے، میں اس سعادت میں فضیلت کیوں نہ حاصل کروں، چنانچہ سب کو منتظر چھوڑ کر آپ کے پاس آ گیا، اب میں خوش ہوں کہ میرا مقصد مجھے حاصل ہو گیا اور میں ہی وہ پہلا شخص کہلاؤں گا جس نے شرف ملاقات حاصل کرنے میں پہل کی اور سبقت لے گیا۔''

سید اشرف نے فرمایا۔ ''خدا تجھے ہمیشہ سرخرو رکھے، میں خوش ہوں کہ میں جس شخص کی تلاش میں ایک عرصہ سے سرگرداں اور پریشان ہوں، بالآخر اس کے پاس پہنچ گیا۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''اس میں کیا شک۔''

اس کے بعد یہ دونوں ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے شہر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ مرید نے دور ہی سے شیخ علاء الدین چشتی اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''حضرت! وہ رہے اپنے پیرو مرشد، مریدوں کے نرغے میں، دیکھیے کتنی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

سید اشرف نے شیخ علاؤالدین کو دور سے دیکھا تو سواری چھوڑ دی اور نیچے آ گئے، مرید اور سید اشرف پیادہ پا شیخ علاء الدین چشتی کی خدمت میں روانہ ہو گئے، دوسری طرف سے پیرو مرشد اپنے سب مریدوں کو لے کر ان کی طرف بڑھے اور ایک جگہ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے، دونوں ایک دوسرے کو پرشوق نظروں سے کچھ دیر دیکھتے رہے اس کے بعد شیخ نے اپنے مہمان کو سینے سے لگا لیا۔ فرمایا۔ ''سید اشرف تو بہت تھک گیا ہو گا، گھوڑے کو کہاں چھوڑ دیا اس پر سوار ہو جا۔''

سید اشرف نے جواب دیا۔ ''پیرو مرشد! آپ کو دیکھتے ہی میری ساری تکان دور ہو گئی، میں تو آپ کے ساتھ پیدل ہی چلوں گا اور اس سے اپنی تکان دور کر دوں گا۔''

شیخ چشتی نے فرمایا۔ ''سید اشرف تکلف نہ کر، میں تیرے ساتھ ہی چلوں گا تو اپنے گھوڑے پر سوار ہو جا۔''

لیکن سید اشرف نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور شیخ چشتی کے ساتھ پیدل ہی چل کر تکان دور کرنے لگے۔

☆☆☆

اس دن خانقاہ میں بڑا جشن رہا، ہر طرف سے خوشی ہی خوشی ابل رہی تھی، ہر کوئی خوش تھا لیکن وہ مرید جس کو اپنی سبقت پر ناز تھا افسردہ اور ملول سا وہاں سے چلا گیا۔

شیخ چشتی نے سید اشرف کو غسل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد صاف ستھرے کپڑے پیش کیے اور ہلکا سا کھانا کھلانے کے بعد فرمایا۔ ''آج آرام کرو۔''

سید اشرف نے فرمایا۔ ''حضرت! میں یہاں آرام کرنے نہیں آیا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جنہیں خدا اپنے کسی خاص کام کے لیے مقرر فرما دیتا ہے انہیں چھٹی نہیں دیتا۔''

شیخ علاؤالدین بہت خوش ہوئے اور سید اشرف کو اسی وقت سے ریاضت اور مجاہدے میں مشغول کر دیا۔

سید اشرف کو جو سکون اور طمانیت شیخ علاؤالدین سے حاصل ہوئی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں بارہ سال گزار دیے۔ اس دوران شیخ چشتی نے انہیں جہانگیر کا لقب دیا اور یہ سید اشرف جہانگیر کہلانے لگے۔

گے۔ اپنے پیر و مرشد کے حکم پر سید اشرف جونپور کے نواح میں چلے گئے اور اعظم گوٹھ کے قصبے محمد آباد میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کے لوگوں نے آپ کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضری دی۔ ان میں عام لوگوں کے علاوہ وہاں کے نامی گرامی علما بھی شامل تھے۔ محمد آباد سے ظفر آباد چلے گئے۔ آپ کی باتوں میں ایک سحر تھا۔ اس سحر میں وہ لوگ بھی مبتلا ہو جاتے جو علمیت اور دولت میں نمایاں مقام رکھتے تھے، چنانچہ ظفر آباد کے شیخ کبیر سرور پوری بھی آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ جبکہ شیخ کبیر اپنی دولت مندی اور علمی فضیلت میں کوئی جواب نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے سید اشرف کی خدمت میں رہ کر وہ مقام حاصل کیا کہ بعد میں ان کے خلیفہ قرار پائے۔

ظفر آباد میں کچھ دن قیام کر کے جونپور واپس چلے گئے اور وہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ یہاں ان کی ملاقات اس عہد کے جید عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے ہوگئی، یہ ملاقات گہرے تعلقات میں تبدیل ہوگئی۔ یہ غزنی کا رہنے والا عالم مدتوں دولت آباد دکن میں رہنے کی وجہ سے دولت آبادی مشہور ہوگیا تھا۔ دولت آباد سے دہلی چلا گیا اور جب تیمور کے حملے سے افراتفری مچی تو یہ شخص جونپور کے حاکم ابراہیم شرقی کے پاس چلا آیا۔ ابراہیم شرقی نے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا۔ قاضی شہاب الدین جن کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں ان میں شرح کافیہ، بدیع البیان، ارشاد در نحو اور قرآن پاک کی فارسی تفسیر بحر المواج بہت مشہور ہیں۔

سید اشرف اپنے دوست قاضی شہاب الدین کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے، وہ اکثر ان کے ساتھ رہنے لگے۔ سید اشرف نے انہیں روحانی مدارج کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ بعد میں سید اشرف نے انہیں خرقۂ خلافت عطا کیا اور ملک العلما کا خطاب بھی دیا۔

ایک دن قاضی شہاب الدین آپ کی خدمت میں اداسی اور فکر مندی سے داخل ہوئے۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیوں قاضی کیا بات ہے، چہرے پر اداسی اور فکر مندی کیوں؟''

قاضی نے جواب دیا۔ ''حضرت! سلطان ابراہیم شرقی آپ کی خدمت میں آنے کے لیے بے چین ہے۔ خادم نے سوچا کہ چلو آج میں آپ سے ملاقات کر لوں، اور کل جب سلطان ابراہیم شرقی آئے گا تو میں اس کے ساتھ بھی حاضری دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کیا تو نہیں جانتا کہ میری نظر میں تو زیادہ اہم اور مرتبے والا ہے۔ سلطان تجھ سے بہتر نہیں ہے اگر بادشاہ آتا ہے تو آتا رہے اس کو کسی نے منع تو نہیں کیا۔''

اس دن قاضی نے آپ کی صحبت میں بہت وقت گزارا اور ہنسی خوشی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن باادب باملاحظہ کی آوازیں گونجنے لگیں اور حاکم شہر اپنے حشم و خدم کے ساتھ آپ کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے ساتھ قاضی شہاب الدین بھی آئے۔

بادشاہ نے قاضی سے کہا۔ ''آپ اندر جا کر پیر و مرشد کو مطلع فرما دیں کہ خطا کار حاکم جونپور اذنِ باریابی چاہتا ہے۔''

جب قاضی نے یہ پیغام آپ تک پہنچایا تو آپ جز بز ہوئے۔ سید اشرف نے جواب دیا۔ ''اے قاضی شہاب الدین! میں بادشاہ کو تو اذنِ باریابی دے سکتا ہوں لیکن مجھے یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کے ساتھ آنے والوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ میں ان سب کو قریب آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

قاضی شہاب الدین باہر نکلے اور حاکم شرقی سے کہا۔ ''حضور والا! اندر چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ مجھ سے مشورہ لیں تو میں کچھ عرض کروں۔''

حاکم شرقی نے کہا۔ ''فرمائیے، میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔''

قاضی نے جواب دیا۔ ''حضور والا! جہاں آپ تشریف لے جا رہے ہیں وہ فقیر کی کٹیا ہے۔ آپ اگر اس کٹیا میں اپنے حشم و خدم کے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو یہ فعل پیر و مرشد کو گراں گزرے گا لیکن اگر آپ اندر تنہا تشریف لے جائیں گے تو پیر و مرشد کو بڑی خوشی ہوگی۔''

حاکم شرقی نے جواب دیا۔ ''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہوں۔ حشم و خدم اندر نہیں جائیں گے۔''

اس کے بعد حاکم شرقی اپنے گھوڑے سے نیچے آ گیا اور قاضی کے ساتھ اندر آپ کے پاس چلا گیا۔ اس نے سید اشرف

کی خدمت میں پہنچ کر جس ادب اور احترام کا ثبوت دیا اس سے سید اشرف بہت متاثر ہوئے۔ حاکم شرقی نے گزارش کی۔
''حضور! کچھ عرصہ پہلے میں نے قلعہ جناوہ کی تسخیر کے لیے ایک لشکر روانہ کیا تھا، وہ ابھی تک واپس نہیں آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر ملی۔ آپ خدا سے دعا کیجیے کہ میں کوئی منحوس خبر نہ سنوں۔''
سید اشرف نے جواب دیا۔''ابراہیم تو فکر مند نہ ہو، اللہ نے چاہا، تو تو عنقریب خوش خبری سنے گا۔''
حاکم شرقی خوشی سے پھولا نہ سمایا، بولا۔''حضرت میں نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی حکومت کی حدود میں شرعی نظام نافذ کردوں گا گو کہ یہ کام بہت دشوار ہے۔''
سید اشرف نے فرمایا۔''اگر تو اپنے عہد میں سچا ہے تو میں بھی تجھ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ تو الجھنوں سے نکل جائے گا اور فتح وکامرانی سے شادکام ہوگا۔''
آپ کی دعائیں لے کر حاکم شرقی واپس چلا گیا۔ ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ بھیجے ہوئے لشکر کی طرف سے فتح ونصرت کا پیغام آ گیا۔ بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوش خبری کے دوسرے دن وہ ایک بار پھر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا اور دروازے پر کھڑا ہو کر اذن باریابی طلب کیا۔ قاضی شہاب الدین بادشاہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔
قاضی نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا۔''حضرت بادشاہ شرفِ ملاقات کا خواہش مند ہے۔ حاضری کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''
آپ نے پوچھا۔''ابھی تین دن پہلے تو وہ آچکا ہے۔ اس وقت حاضری کا کوئی خاص سبب؟''
قاضی نے جواب دیا۔''بادشاہ کے بھیجے ہوئے لشکر نے کامیابی حاصل کرلی ہے۔ بادشاہ کا عقیدہ ہے کہ یہ فتح ونصرت آپ کی دعاؤں سے ملی ہے۔ بادشاہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہے۔''
آپ نے فرمایا۔''بادشاہ سے کہہ دو شکریہ کس بات کا؟ اور کس کا شکریہ...... میرا؟ شکریہ اپنے رب کا کرے اور مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس پر عمل کرے۔''
قاضی نے عرض کیا۔''حضرت! بادشاہ آپ سے ملے بغیر واپس نہیں جائے گا۔''
آپ نے زور دے کر کہا۔''قاضی شہاب الدین، بادشاہ کے پاس جاؤ اور فتح ونصرت پر میری طرف سے مبارک دو۔ اسے کہو کہ وہ بند دروازے کھول دے، بار بار کی ملاقات کا حاصل؟''
قاضی چپ چاپ باہر چلا گیا اور آپ کا پیغام بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔
بادشاہ نے پوچھا۔''یہ بند دروازے کھول دینے کا کیا مطلب ہوا؟''
قاضی نے جواب دیا۔''مطلب صاف اور واضح ہے یعنی نظام شریعت کے نفاذ کا در کھول دیا جائے۔''
بادشاہ وارفتہ وآشفتہ آگے بڑھا اور آپ کے حجرے میں داخل ہوگیا۔ آپ بادشاہ کو دیکھ کر لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور بادشاہ کو اپنی پائنتی بٹھالیا۔
بادشاہ نے والہانہ عقیدت مندانہ عرض کیا۔''حضرت! میں آپ کی کرم فرمائی اور نوازش کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟ غلام تو آپ کا مرید تھا ہی، اب غلام زادے بھی شرف بیعت سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''
آپ نے فرمایا۔''نظام شریعت کا نفاذ، ارکان اسلام پر خلوص دل سے عمل، بس میری تو یہی سب سے بڑی آرزو ہے اگر پوری ہوجائے تو کیا کہنے۔''
بادشاہ نے جواب دیا۔''آپ کی یہ خواہش ضرور ری پوری ہوگی۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔''
اس کے بعد بادشاہ نے آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی تھیلیاں بطور نذرانہ پیش کیں، لیکن آپ نے لینے سے انکار کردیا اور فرمایا۔''میں ان اشرفیوں کا کیا کروں گا۔''
بادشاہ نے درخواست کی۔''میری خواہش ہے کہ آپ انہیں قبول فرمالیں، میری خوشی ہوجائے گی۔''
آپ نے فرمایا۔''میری خوشی اس میں ہے کہ تم انہیں واپس لے جاؤ۔''
جب بے حد اصرار کے بعد بھی آپ نے اشرفیاں نہیں لیں تو بادشاہ نے انہیں واپس رکھ لیا۔

ایک ہندو جوگی کو آپ کے ذکر سے چڑ ہوتی تھی۔ جب وہ یہ دیکھتا کہ سید اشرف جہانگیر نامی ایک مسلمان درویش ہندوؤں کو متاثر کر کے مسلمان کر رہا ہے تو تلملا کر رہ جاتا۔ وہ آپ کے پاس گیا اور کسی مرید سے آپ کو مطلع کیا کہ "اپنے پیر سے کہہ دو کو بھدونڈ جوگی آپ سے ملنے آیا ہے۔"
جب آپ کو یہ اطلاع پہنچائی گئی تو فرمایا۔ "اس سے کہو اپنے شعبدے دکھاتا رہے، ہم درویشوں سے اس کا کیا کام؟"
جوگی نے جواب میں کہلایا۔ "میں سارے سوال جواب انہی سے کروں گا۔ ملاقات کی اجازت دی جائے۔"
آپ نے جوگی کو اندر بلا لیا اور دیکھتے ہی فرمایا۔ "شریمان جی تم اپنا کام کیے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں اس میں پریشانی کس بات کی۔"
جوگی نے جواب دیا۔ "میں کہنے آیا ہوں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے باز آ جاؤ، یہ رام اور لچھمن کی سرزمین ہے، یہ کرشن بھگوان کا علاقہ ہے تم یہاں کے لوگوں کا دھرم خراب کر رہے ہو ہم اسے نہیں برداشت کر سکتے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "کرشن بھگوان کون؟ اگر بھگوان کا مطلب خالق اور مالک سے ہے تو ایک انسان، انسانوں کا خالق و مالک نہیں ہو سکتا۔ میں اس گمراہی سے نجات دلانے آیا ہوں۔"
جوگی جھنجلا کر بولا۔ "تم میں کیا بات زیادہ ہے؟ تم کس بات میں فضیلت رکھتے ہو؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اے گمراہ انسان! تو پڑھا لکھا شخص ہے خوب جانتا ہے کہ کیا برا ہے کیا اچھا ہے، تیرے کرشن نے عمل کی یہ تعریف کی تھی کہ جب انسان سوچنا شروع کرتا ہے تو اس کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب تو نے میری بابت یہ سوچنا شروع کیا کہ مجھ میں کیا زیادہ ہے اور تجھ میں کیا کمی ہے یا یہ کہ اسلام کس بات میں فضیلت رکھتا ہے اور کفر کس بات میں اس سے کمتر ہے تو گویا تجھے اسلام اور کفر کی برتری اور کمزوری کا احساس ہو گیا۔ اب خوامخواہ وقت ضائع کرنے سے حاصل۔ مسلمان ہو جا اور دنیاوی بڑائی اور اخروی نجات حاصل کر۔"
جوگی شرمندہ ہو کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ "تم نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں نے اسلام کو برتر اور اپنے دھرم کو کمتر سمجھ لیا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ تو اپنے دھرم کے مستقبل سے مایوس ہو گیا ہے اور اس مایوسی نے تجھ کو میرے پاس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں نے تو تجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے چہرے پر تجھ کو جو طمانیت اور سکون ملے گا، تیرا چہرہ اس سے محروم ہے۔"
جوگی پریشان ہو گیا۔ باتوں میں تو اس کو مات ہو گئی تھی، کہنے لگا۔ "بابا جی، ذرا اپنا کوئی کمال تو دکھاؤ۔"
آپ نے جواب دیا۔ "میرے پاس اس کے سوا کوئی کمال نہیں کہ میں لاتعداد خداؤں سے نجات دلا کر ایک خدا کے در پر جھکا دیتا ہوں۔"
جوگی نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو کوئی کمال نہیں، آؤ، میں تمہیں اپنا کمال دکھاؤں۔"
آپ نے گہری نظروں سے جوگی کی طرف دیکھا جوگی نے بڑی کوشش کی کہ کوئی کمال دکھائے، کسی فوق العقل شعبدے کا مظاہرہ کرے لیکن ناکام رہا، آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ "حکم ربی کے بغیر کوئی بھی کام ممکن نہیں۔"
جوگی بہت پریشان اور دل برداشتہ نظر آیا۔ آپ نے تسلی دی۔ "اے شخص! تو یہاں خود سے نہیں آیا، میں نے تجھ کو بلایا تھا، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو اسلام قبول کرلے گا اور میرے ساتھ اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام کرے گا۔"
جوگی کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔
آپ نے فرمایا۔ "کیا سوچ رہا ہے آگے بڑھ اور کلمہ پڑھ، اللہ کو تجھ سے کام لینے ہیں۔"
جوگی آپ کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ آپ نے اس کو تسلی دی اور مسلمان کر لیا۔ نہ صرف وہ مسلمان ہوا بلکہ اس کے ساتھ اس کے چیلوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اس نے جوگی بابا کمال پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔
☆☆☆
اب آپ نے ادھر ادھر کا دورہ شروع کر دیا اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کرتے رہے، ردولی، جائس بنارس اور ان سے متعلقہ قصبات اور دیہات میں آپ نے وہ کام کیا جو آج تک یادگار ہے۔

بنارس میں آپ کو ہندوؤں نے بحث ومباحثہ اور مناظرے پر مجبور کیا۔ آپ نے اس میں بھی کامیابی حاصل کی اور ہندوؤں کو مسلمان کیا۔

جونپور کے حاکم ابراہیم شرقی نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا اس پر پورا پورا عمل کیا، علما کی کوشش سے قاضی شہاب الدین کی نگرانی میں فتاویٰ ابراہیم شاہی کی ترتیب عمل میں آئی اور پورے علاقہ میں شرعی قوانین نافذ کردیے گئے۔

آپ نے بڑے بڑے عالموں کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرلیا۔

چونکہ آپ نے سمنان پر حکومت کی تھی اور باپ کے ساتھ بھی حکومت میں شامل رہے تھے۔ اس لیے آپ نے بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے ایک ہدایت نامہ تیار کیا جس میں وضاحت سے بتایا کہ ایک بادشاہ یا حکمران کو کیا کیا کرنا چاہیے، آپ نے ہدایت کی۔

''بادشاہ اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیں، صبح کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں اس کے بعد علما اور صلحا کی صحبت میں رہیں اور پھر چاشت کے وقت تک علما سے ان آیات کی تشریح اور تفسیر معلوم کریں جو عدل وانصاف پر نازل ہوئی ہیں۔ یہاں ندیموں اور وزیروں کو بھی بلالیں ان سے ملکی اور فوجی معاملات پر باتیں کریں اور احکامات...... وہیں جب دربار عام منعقد ہو اس میں رعایا اور مسلمانوں کے مقدمات پیش ہوں اور ان کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جائے..... قیلولہ کے وقت آرام کریں، پھر نماز پڑھیں۔ ظہر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کی جائے۔

پوری زندگی اس کا خیال رکھا جائے کہ کوئی کام شریعت کے خلاف نہ انجام دیا جائے۔ عدل وانصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے زندگی اور حکومت دونوں ہی میں اختلال پیدا ہوجاتا ہے۔''

اس طرح آپ نے ارکان دولت اور اعوان مملکت کو بھی ہدایات اور نصیحتیں کیں۔

اب آپ نے مستقل سکونت روح آباد میں اختیار کرلی تھی یہی روح آباد بعد میں کچھو...شریف کہلایا اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ آپ اپنے کام اور اس کے نتائج سے مطمئن ہوکر حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد نجف اشرف، کربلائے معلا اور روم گئے، اس کے بعد دمشق میں فخر الدین عراقی کے مزار پر حاضری دی، یہاں سے مکۂ معظمہ چلے گئے۔ یہاں سے بغداد چلے گئے اور بغداد سے سمنان چلے گئے۔ سمنان میں انہیں اپنا ماضی یاد آیا۔ یہاں کی ایک ایک چیز آپ کی شناسا تھی اور ایسا لگتا تھا گویا آپ کو اشتیاق سے دیکھ رہی ہے، یہاں ان کی اپنی بہن سے ملاقات ہوئی۔ بہن بھائی کے شانے سے لگ کر روتی رہی۔

یہاں سے مشہد علی رضا کے مزار پر گئے اور اعتکاف کیا۔ یہیں تیمور گورگانی سے ملاقات ہوئی اور اسی نے آپ سے نصیحتیں حاصل کیں۔

ماوراء النہر میں شیخ علاؤ الدین نقشبندی کی صحبت میں کچھ عرصہ گزارا اور ہندوستان واپس آگئے۔ اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دے کر گلبرگہ میں خواجہ گیسو دراز کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور یہاں سے کچھو... واپس چلے گئے۔

اس کے بعد ایک بار پھر سیاحت کو نکلے اور کافی عرصہ باہر رہ کر کچھو۔ شریف واپس تشریف لے گئے۔

آپ زندگی کے آخری دنوں میں فکر کی حالت میں رہنے لگے تھے، کسی کسی وقت ہوش آجاتا، وفات سے پہلے ہی اپنے مریدِ خاص سید عبدالرزاق جنہیں آپ نے نور عین کا لقب عطا فرمایا تھا، انہیں اپنا جانشین بنادیا اور بزرگانِ چشت کے جملہ تبرکات ان کے حوالے کردیے۔

آخر 27 محرم 808 ہجری کو یہ آفتاب رشد وہدایت اور مہر علم وفضل غروب ہوگیا۔ آپ کا مقام علمی لحاظ سے بھی بہت بلند تھا۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص اس وقت تک ولیِ کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ ظاہراً، باطناً، فعلاً، اعتقاداً اور حالاً شرح کا پابند نہ ہو۔

ماخذ

سفینتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔
خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

"بھائی! تمہارا مسئلہ بھی تو ایسا ہے جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا۔" بابر علی نے بتایا۔

"چلو ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔"

بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے ایک دیگ غریبوں میں تقسیم کردی۔ دو چار نے تو بہت دل کھول کر دعائیں دی تھیں جن سے یہ امید ہوگئی تھی کہ شاید میرا کام بن جائے گا۔ وہ ظالم مہربان ہو جائے گی۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ ظالم مہربان ہونے کے بجائے اور بھی سخت ہوتی چلی گئی۔ خوامخواہ بابا کے مزار پر جا کر میں خوار ہوتا رہا' یا تو فلموں وغیرہ میں سب جھوٹ دکھاتے ہیں یا پھر کوئی اور بات ہوگی۔

اس لڑکی کا اس ٹیوٹر کے ساتھ چکر چلتا رہا۔ دونوں کو خود میں نے کئی بار ایک ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس پر قربان ہوئے جارہی تھی۔ بابر علی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ "بھائی' میرا مشورہ ہے کہ تم اب اسے بھول جاؤ۔ تم محبت کے معاملے میں زبردستی تو نہیں... کرسکتے۔"

"لیکن میں بابا کے مزار پر جا کر شکوہ ضرور کروں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ اتنی خوشامدوں کے باوجود مجھے کچھ نہ ملے۔"

"تمہاری مرضی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں خلوص شامل نہ رہا ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ میری دعا میں سوائے خلوص کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔"

بابر علی نے مجھے منع بھی کیا تھا لیکن میں پھر دوسرے دن مزار پر پہنچ ہی گیا۔ میں صبح کے وقت گیا تھا' اس وقت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ مزار پر سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ مزار کے مجاور اور نگراں حضرات بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بہ آوازِ بلند بولنا شروع کردیا۔ "بابا! بہت پریشان اور مایوس ہو کر یہ شکوہ کر رہا ہوں۔ بابا! آپ لوگ تو اللہ کے بہت پیارے بندے تھے اسی لیے آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے میں نے آپ کے پاس صفیہ نام کی ایک لڑکی کے لیے دعا کی تھی جس کے باپ کا نام غیاث الدین ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اس لڑکی سے میری محبت کا بندوبست کروادیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"بابا! میں نے ہزاروں فلموں میں ایسی صورت حال دیکھی ہے کہ دعا ختم نہیں ہوتی کہ محبوب سامنے آجاتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہورہا؟ ایک بات اور بتادوں... کہ وہ لڑکی اپنے ٹیوٹر سے محبت کرنے لگی ہے جو اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ دعا میں نے مانگی اور فائدہ کسی اور کو ہوجائے۔"

اور اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی ٹیوٹر میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "تم!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم آؤ میرے ساتھ۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

وہ مجھے قبر والے کمرے سے باہر لے آیا۔ احاطے میں اور بھی کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ وہ بڑی نفاست سے سجا ہوا کمرا تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا' مجھے حیرت ہورہی تھی۔ "میں نے تمہارا شکوہ تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر سن لیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"لیکن تم کیا اسی کمرے میں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' یہ میرا کمرا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور اس مزار کے جو نگراں اور متولی ہیں میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"لیکن تم تو ٹیوٹر ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک متولی کا بیٹا ٹیوٹر نہیں ہوسکتا!" اس نے کہا۔ "میں نے تمہارا شکوہ سن لیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ صفیہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"ظاہر ہے صاحب مزار سے تمہاری رشتے داری جو نکل آئی ہے۔ وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو کس کا ساتھ دیں گے؟"

"یہ بات نہیں ہے بے وقوف۔ خود اندازہ کرلو، جب میں دن رات یہاں رہتا ہوں تو میں نے اس محبت کے لیے بہت پہلے سے دعا مانگی ہوگی۔ میری درخواست صاحبِ مزار کے پاس بہت پہلے پہنچی ہوگی۔"

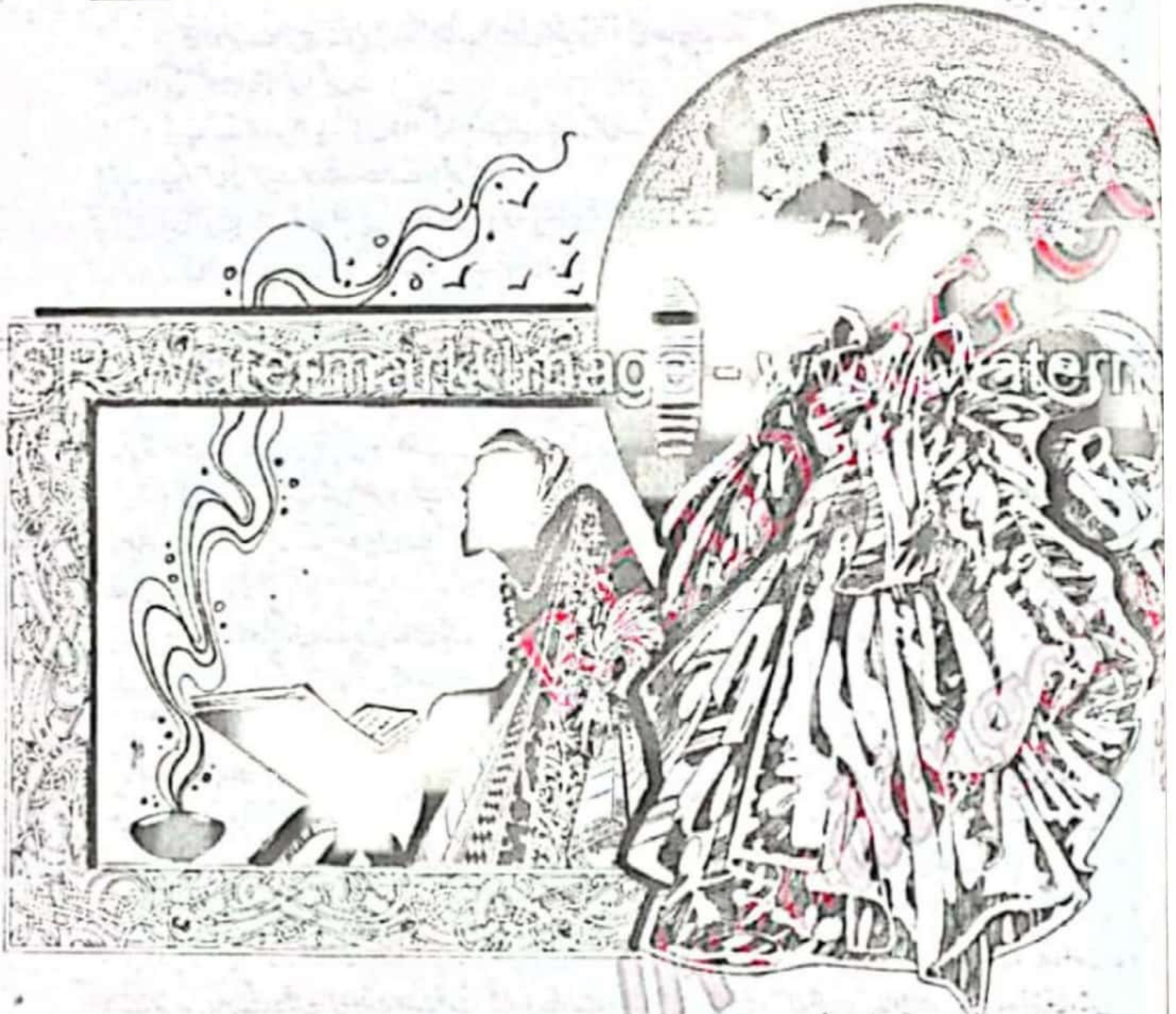
اس کی یہ بات ایک لمحے میں سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہر جگہ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول چلتا ہے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، میں اٹھا اور دوسری سمت قدم بڑھا دیے...... اسی لیے شاید اللہ نے اس کائنات میں چاروں جانب رستے ہی رستے بنائے ہیں۔ چاہے جس جانب نکل جاؤ۔

امام ابو العباس

ضیا تسنیم بلگرامی

زبانوں میں تاثیر اور دعاؤں میں اثر بلا جواز نہیں... اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے... اور جو لوگ ان ریاضتوں کو اپناتے ہیں گویا اپنا آرام تیج کر آزمائشوں سے بھرے رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی انہی اولیائے کرام میں ہوتا ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور جن کی رضا سے اللہ رب العزت خوش ہوتا ہے۔

راہ حق کی صعوبتوں اور کرامتوں کا قصہ



مصر کے مشہورِ زمانہ صوفی شیخ ابوالحسن شاذلی علم کا سمندر تھے۔ ان کے مریدوں اور ارادت مندوں میں ابوالعباس واحد وہ شخص تھے جنہیں شاذلی کے علم کا وارث قرار دیا گیا۔ شاذلی نے کوئی کتاب بھی نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیمات محفوظ ہیں اور حفاظت کا یہ کام احمد ابوالعباس مرسی نے انجام دیا اور بعد میں انہیں سیدی امام احمد ابوالعباس کہا جانے لگا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی سے کسی نے سوال کیا۔

''حضرت! آپ زندگی بھر جو کچھ فرماتے رہے یا تعلیم دیتے رہے، اسے اگر تحریر بھی فرما جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''کون کہتا ہے کہ میں نے اپنے پیچھے کتابیں نہیں چھوڑیں؟''

سوال کرنے والے نے عرض کیا۔ ''اگر آپ نے کتابیں تصنیف کی ہیں تو ان کا مجھے علم نہیں ہے اور میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں۔ براہِ کرم اپنی تصانیف سے مطلع فرمایئے تا کہ ان سے مسلسل اور مستقل فیض حاصل کیا جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں احمد ابو العباس میری مستقل، جامع اور مشرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جا سکیں گی۔''

شاذلی کی وفات کے بعد کسی مرید نے ابو العباس سے پوچھا۔ ''ابو العباس! پیر و مرشد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ اس طرح رہتا ہے جس طرح شیرنی کا بچہ شیرنی کی گود میں۔ آخر اس کا مفہوم کیا ہے؟''

ابو العباس نے جواب دیا۔ ''اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ طمانیت اور سکون سے رہتا ہے۔ اس کو حرص و طمع، شہرت و نمود اور دوسرے نفسانی مسائل ورغلاتے رہتے ہیں مگر اللہ اس ولی کی حفاظت کرتا ہے جس سے وہ ولی، اشرار دنیا سے محفوظ رہتا ہے بالکل شیرنی کی طرح جو اپنے بچے کو کسی بھی ورغلانے یا پھسلانے والے کے حوالے نہیں کرتی۔''

کسی دوسرے مرید نے پوچھا۔ ''جناب رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خود کو پہچانا، اس کا واضح مفہوم ارشاد فرمائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اس کی خواری اور عاجزی کے ساتھ پہچانا، اس نے اپنے رب کو اس کی عزت اور قدرت کے ساتھ پہچانا۔''

ان تشریحات نے حاضرین کو وجد میں مبتلا کر دیا اور ہر طرف سے سبحان اللہ، جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

کسی اور نے سوال کیا۔ ''حضرت! ایک سوال اور۔ حضرت شاذلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کسی ولی کی حقیقت کھول دی جائے تو وہ پوجا جانے لگتا ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا ولی کی پرستش جائز ہے یا یہ کلمۂ کفر ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہاں پوجے جانے سے مراد پرستش کی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے لاتتبع والشیطان (شیطان کو مت پوجو) اس کا واضح مطلب ہے کہ شیطان تمہیں جس چیز کا حکم دے وہ تم نہ مانو، یہی شیطان کی اطاعت یا عدم اطاعت ہے۔ ولی کی پرستش کا مطلب ہے اس کی پیروی کرنا، اس کی اتباع کرنا۔''

انہی سوال و جواب میں عصر کا وقت آ گیا۔ نماز کی صفیں قائم ہوئیں اور ابو العباس کو امامت کے لیے کھڑا کیا گیا۔ جب وہ نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے مقتدیوں نے کسی ارادے کے بغیر ہی دیکھا کہ ابو العباس کا جسم نور سے بھر گیا اور ان پر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔

نماز کے بعد لوگوں نے دبی زبان میں استفسار کیا۔ ''حضرت! یہ نور کیسا تھا جس میں آپ کا وجود چھپ گیا تھا اور وہ بارش کیسی تھی جو آپ پر ہو رہی تھی...... بالکل پھوار کی طرح؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تم لوگ اپنے سوال کا جواب چاہتے ہو تو سنو، وہ نور جس میں، میں چھپ گیا تھا اور وہ بارش جو پھوار کی طرح مجھ پر ہو رہی تھی، شرح و تفسیر اور معانی و مطالب کی تھی۔ اگر ان کی تجسیم کی جائے تو میرے عزیزو! ان کی شکل یا تو نور کی طرح ہو گی یا پھر بارش یا پھوار کی طرح۔''

لوگوں نے متفقہ طور پر شاذلی کے اس قول کی تائید کی کہ میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں ابو العباس میری مستقل، جامع اور مشرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے سمجھی جا سکیں گی۔

ایک دن فجر کے بعد لوگوں نے آپ کے آس پاس ہجوم کیا اور سوالات کی بھرمار کر دی۔ آپ ان کے سوالات کے جواب دیتے دیتے نڈھال ہو گئے۔ عین اس وقت جب آپ اٹھنے والے تھے، ایک شخص ہانپتا کانپتا مجلس میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ''ذرا اس شخص کو تو بلاؤ۔''

ایک مرید نے اس شخص کو شانے سے پکڑ لیا اور عرض کیا۔ ''بھائی! تجھے ابو العباس یاد فرماتے ہیں، ذرا زحمت کر۔''

وہ شخص آپ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ آپ نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ''اے شخص بتا، میں تیرا راز اپنا راز سمجھوں گا۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔ آج تو نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس میں زنا کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ آخر کیا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ کو مکاشفے میں کیا نظر آیا؟ حالانکہ میں اتنی سی بات کا گناہ گار ہوں کہ آج جب میں دربارِ شاہی سے آرہا تھا تو میں نے ایک موڑ پر بڑی حسین عورت دیکھی۔ اس کا گدرایا ہوا شباب اور جسم اور لباس سے اُبلتے ہوئے جوش اور مستی مجھے دعوتِ عصیاں دے رہے تھے۔ اس عالم میں، میں نے بے اختیار خواہش کی اے کاش یہ مجھے مل جاتی اور میں اس کو تصرف میں لاسکتا۔ پیر و مرشد! اگر آپ اس کو بدکاری تصور فرماتے ہیں تو میں واقعی گناہ گار ہوں۔''

ابوالعباس نے تنبیہہ کی۔ ''اول تو اپنی نظریں نیچی رکھا کر اور جب تجھ کو اپنے آپ پر اتنا اختیار ہوجائے کہ خیالات اور تصورات بھی تیرے تابع ہوجائیں، اس وقت سر اٹھا کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔''

کسی مرید نے آپ کو یوں سرگوشی میں باتیں کرتے جو دیکھا تو دوسرے سے کہا۔ ''معلوم نہیں ابوالعباس اس شخص کو کیا سمجھا رہے ہیں۔ اگر کوئی اچھی بات بتا رہے ہیں تو اس اچھی بات سے دوسروں کو بھی آشنا کرنا چاہیے اور اگر کوئی بری بات کر رہے ہیں تو بری بات ان کو زیب نہیں دیتی۔''

آپ نے اس مرید کو آواز دی۔ ''اے معترض! ذرا میرے پاس تو آ۔''

وہ شخص آپ کے قریب چلا گیا۔ آپ نے کہا۔ ''اے شخص! خدا جستجو پسند نہیں کرتا۔ اگر میں دوسروں کے راز کھولنا شروع کردوں تو اس مجلس کے کتنے ہی چہرے شرم اور ندامت سے جھک جائیں گے اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ خدا ستارالعیوب ہے۔ خدا نے اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی رکھ دی ہے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''پیر و مرشد! میں اپنی بات پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کردیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں کیا معاف کروں گا، معاف کرنے والا تو اللہ ہے، اس سے معافی مانگ۔''

اس شخص کے ہاتھ میں بڑی سی پوٹلی تھی۔ اسے آپ کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ''حضرت! اس وقت میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو چند مزے مزے کی چیزیں کھلاؤں۔ آپ اسے قبول فرمائیں اور میرا دل رکھنے کے لیے میرے سامنے ہی اس کو تناول فرمالیں۔''

آپ نے پوٹلی کھلوائی تو اس میں سے کباب، گوشت، روٹیاں اور کھجوریں نکلیں۔ آپ نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قریب موجود لوگوں نے ایک عجیب و غریب تماشا دیکھا۔ ابوالعباس کی پانچوں انگلیاں پھڑکنے لگیں۔ بالکل ایسا لگا گویا انگلیوں کی ساری رگیں متحرک ہوگئی ہیں۔

آپ نے کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس شخص سے پوچھا۔ ''میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا اور کھانے سے پہلے میں تجھ سے چند سوال کروں گا۔ تو ان کے صحیح صحیح جواب دے گا کیونکہ صحیح جوابوں میں ہی تیری نجات ہے ورنہ میں تجھ سے دست کشی اختیار کرلوں گا۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! میری یہ مجال کہ میں آپ سے غلط بیانی کروں۔ میں اگر جھوٹ بول بھی دوں گا تو آپ اس جھوٹ کا اپنے کشف سے پتا چلالیں گے۔ اس لیے جھوٹ کا فائدہ؟ آپ جو چاہیں پوچھیں، اللہ نے چاہا تو میں سچ ہی بولوں گا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''سچ بتا، کیا یہ کھانا تیرے گھر کا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! سچ بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے میری دعوت کی تھی۔ میں دعوت میں گیا لیکن کھانا نہیں کھایا اور وہ کھانا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اب آپ تناول فرمائیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! اپنا یہ کھانا واپس لے جا کیونکہ درویش مشتبہ کھانا نہیں کھا سکتے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''حضرت! مشتبہ کھانا کیسا؟ یہ بالکل صحیح ہے۔ میں آپ کو کھانے کی پاکیزگی کا یقین کس طرح دلاؤں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر تو اس پر مصر ہے کہ میں تیرے میزبان کی قلعی کھول دوں تو سن، تیرا میزبان شراب کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کاروبار کی کمائی مجھ پر اور میرے بیٹوں پر حرام ہے لیکن تم پوچھ سکتے ہو کہ میرے بیٹے کہاں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے سعادت مند اور صالح مرید ہی میری اولاد ہیں۔''

اس شخص نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''حضرت! مجھے تو بس یہ بات بتائیے کہ آپ نے یہ کس طرح معلوم کرلیا کہ یہ کھانا مشتبہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جب میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو تو نے میرے ہاتھ اور انگلیوں میں کوئی تبدیلی محسوس کی تھی؟''

مرید نے کہا۔ ''جی ہاں، میں نے آپ کے ہاتھ، انگلیاں اور ان کے اعصابی نظام کو درہم برہم اور کانپتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تجھ کو معلوم نہیں کہ مشہور صوفی حضرت محاسبی کی کسی انگلی میں ایک ایسی رگ تھی جو انہیں مشتبہ کھانے سے پھڑک کر باز رکھا کرتی تھی لیکن میری انگلیوں میں ساٹھ ایسی رگیں ہیں جو مشتبہ کھانے کو اپنے قریب دیکھ کر بے اختیار پھڑکنے لگتی ہیں۔''

وہ شخص اتنا خوف زدہ ہوا کہ کانپنے لگا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''حضرت! مجھ کو معاف فرمادیں کیونکہ میں نے یہ مشتبہ کھانا قصداً آپ کے سامنے رکھا تھا۔ اس طرح میں آپ کی بزرگی اور روحانیت کا امتحان لے رہا تھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سبحان اللہ، جس کی خدا خود حفاظت کررہا ہو، اس کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور خبردار جو تو نے کسی دل جلے کا امتحان لیا کیونکہ اگر اس نے تجھ کو آزمائش اور امتحان میں ڈال دیا تو معلوم نہیں تیرا کیا حشر ہوگا۔''

اس کے بعد آپ نے وفور جوش میں اپنی ڈاڑھی پکڑلی اور فرمایا۔ ''اگر علمائے عراق اور شام کو یہ معلوم ہوجائے کہ ان بالوں کے پیچھے موجود شخص میں عظمت اور بزرگی کا کتنا بڑا پہاڑ چھپا ہوا ہے تو وہ میری زیارت کو حاضر ہوں اور یہ حاضری بھی منہ کے بل دی جائے۔''

آپ کا قیام قاہرہ میں ہی تھا لیکن لوگوں نے آپ کو اکثر اسکندریہ میں دیکھا، اسکندریہ میں ان کے پیر ابوالحسن شاذلی رہتے تھے۔ ان کی مجلس میں شریک ہوتے، وعظ سنتے اور ختم وعظ پر قاہرہ واپس چلے جاتے۔ شاذلی کی وفات کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے آپ کے اس کمال کا دوسروں سے ذکر کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد جب یہ شہرہ ہوا کہ آپ مکاشفے سے دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کرلیتے ہیں تو آپ کے ایک منکر کو بہت ہنسی آئی۔

اس نے کہا۔ ''یہ شعبدہ باز بھی کتنے غضب کے ہوتے ہیں، کیسے کیسے کرشمے دکھا کر ایک زمانے کو اپنا قائل اور معتقد بنا لیتے ہیں لیکن مجھ کو آج تک کوئی بھی متاثر نہیں کرسکا۔'' اس نے اسکندریہ کے امیر کو مشورہ دیا کہ وہ ابوالعباس کو قاہرہ سے طلب کرے اور ان سے کرامتوں کا مطالبہ کرے۔

امیر نے اسی وقت ایک فرمان جاری کردیا اور حکم دیا۔ ''ابوالعباس! تم میرا فرمان وصول کرتے ہی اسکندریہ آجاؤ، ورنہ میں تمہیں زبردستی بھی بلوا سکتا ہوں۔''

آپ نے یہ مختصر فرمان پڑھا اور نامہ بر کو زبانی جواب دے دیا۔ ''امیر سے کہہ دینا کہ ابوالعباس کہتا ہے تو، تو صرف اسکندریہ کا امیر ہے اور میں جس امیر کا تابع ہوں، وہاں اسکندریہ کا امیر میرے امیر کے دربانوں میں بھی نظر نہیں آتا۔ اس لیے افسوس! میں اسکندریہ نہیں آؤں گا۔''

حاکم اسکندریہ کو جب یہ جواب ملا تو وہ بہت تلملایا لیکن موقع و مصلحت دیکھ کر اس نے فوراً ہی ایک دوسرا خط لکھ دیا۔ یہ خط نرم زبان میں لکھا گیا تھا اور پورے خط کا انداز فدویانہ اور عاجزانہ تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

''پیرومرشد! مجھے احساس ہے کہ میری جانب سے آپ کو جو پہلا خط روانہ ہوا تھا، اس کا لب ولہجہ سخت تھا لیکن اب میں شرمندہ ہوں اور آپ سے اپنی پچھلی تقصیر کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسکندریہ تشریف لے آئیں یہاں آپ کی زیارت کرلوں گا اور آپ میرا ہاتھ پکڑلیں گے۔ میں نے آپ کو غائبانہ اپنا پیر مان لیا ہے، اب آپ بھی مجھ کو اپنے مریدوں میں شامل کرلیں۔''

آپ نے خط پڑھا اور نامہ بر سے کہا۔ ''اگر تیرا حافظہ درست ہے تو میرا جواب امیر تک پہنچا دینا۔ یونان کا بادشاہ جب مصر آیا تھا تو موجودہ شہر اسکندریہ میں اترا تھا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام اسکندریہ پڑ گیا۔ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ سکندر نے اپنے ہم عصر بے غرض اور قانع فلسفی دیوجانس سے ایک بار کہا تھا کہ دیوجانس! میرا فیض عام ہے اور میں نے بخشش اور انعام سے لوگوں کو مالا مال کردیا ہے اگر تو بھی کبھی آجائے اور اپنی خواہش کا اظہار کرے تو میں تجھ کو مالا کردوں گا۔

سکندر کی پوری بات سن کر دیوجانس نے جواب دیا تھا۔ ''سکندر! میرا ایک غلام ہے، میں نے اس کو محکوم کرلیا ہے لیکن اسی غلام نے تجھ کو اپنا غلام بنالیا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کچھ کیا مانگوں، مجھ کو مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔''

''چنانچہ اے قاصد! اپنے امیر سے کہہ دینا کہ حرص وطمع اور شہوت کو میں نے اپنا غلام بنالیا ہے لیکن اس غلام نے اسکندریہ کے امیر کو اپنا غلام بنا رکھا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں تعلق پیدا کروں اور اس کے پاس کیوں پہنچوں۔ اور اپنے امیر سے سختی سے کہہ دینا کہ مجھ جیسے آدمی سے دل لگی نہیں کیا کرتے۔ ہم دونوں کبھی بھی یک جان نہ ہوں گے۔''

نامہ بر زبانی جواب لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد امیر نے بڑی کوشش کی کہ خود قاہرہ جائے اور آپ سے ملاقات کرے لیکن وہ ناکام رہا اور ملاقات کی خواہش لیے ہوئے اس دنیا ہی سے کوچ کرگیا۔

امیر کے دوست نے اس پورے واقعے سے عبرت پکڑی مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی یہ شبہ بیٹھا ہوا تھا کہ اباس بنتے زیادہ ہیں، اتنے ہیں نہیں جتنا ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے انہیں مشہور کر رکھا ہے۔ اس کے دل میں آپ دیکھنے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ وہ اسکندریہ سے قاہرہ پہنچا اور آپ کی مجلس میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آپ وعظ فرماتے رہے۔ آپ نے دوران وعظ فرمایا۔

''لوگو! سوظنی اچھی بات نہیں ہے۔ جب تک تم خود کسی شخص کے بارے میں ذاتی طور پر تصدیق یا تردید نہ کر لو اس کے متعلق غلط مت سوچو۔''

اس اجنبی کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، اس کے لیے اور اس کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ آپ فرما رہے تھے۔

''اتفاق سے اس مجلس میں وہ شخص بھی موجود ہے جس نے اسکندریہ کے امیر کو ورغلا کر مجھ سے لڑا دینا چاہا تھا۔ جو میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ فقراء کے منصب میں امرا کی دربارداری شامل نہیں ہے لیکن اس شخص نے امیر اسکندریہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مجھ پر بہ جبر اپنے دربار میں طلب کر کے میرا امتحان لے۔ میں کچھ ہوں یا نہیں اس سے اس شخص یا اسکندریہ کے امیر کو نہ تو کوئی فائدہ پہنچتا اور نہ نقصان مگر یہ دونوں پھر بھی درپے آزار تھے۔''

اب یہ شخص خاموش نہ رہ سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ اپنی تقریر میں جس شخص کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ میں ہی ہوں۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔'' پھر حاضرین مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''لوگو! میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ شخص تو خدائی دریا ہے اور جو کچھ بھی کہتا ہے ربانی مدد کے فیض سے کہتا ہے۔ آج میں توبہ کر کے آپ کی مجلس میں شامل ہو رہا ہوں اور اس طرح شامل ہو رہا ہوں کہ اب یہاں سے کہیں اور جانے کا میں خیال تک نہ لاؤں گا۔''

آپ کسی ضرورت سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں اسکندریہ سے پہلے جس شہر میں قیام کیا، اس کے امیر نے آپ سے ملنے کی خواہش کی۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں امراء سے نہیں ملتا۔

امیر نے کہلوایا۔ ''جناب! میں آپ کا مداح ہوں اور آپ سے ملاقات کی دیرینہ خواہش رکھتا ہوں۔''

آپ نے جواب میں کہلوا بھیجا۔ ''وہ میرا مداح ہے لیکن میں اس کا مداح نہیں ہوں۔ پھر وہ کیسا مداح ہے کہ خود تو قاہرہ میرے پاس پہنچا نہیں اور میں اس کے شہر سے گزرنے لگا تو میرا مداح بن گیا اور ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا۔''

امیر کے قاصد نے کہا۔ ''حضرت! صبح فجر کے بعد امیر نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''آئے لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کروں گا کیونکہ فقراء کو امراء کی صحبتیں راس نہیں آتیں۔''

قاصد چلا گیا اور صبح امیر اپنے مصاحبین کے ساتھ جب آپ سے ملنے پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ فجر سے پہلے ہی اسکندریہ چلے گئے۔ امیر بہت مایوس ہوا اور مصاحبین سے کہا۔ ''یہ فقراء بھی عجیب لوگ ہیں جو امراء سے خوامخواہ بدظن رہتے ہیں۔''

☆☆☆

ایک دن آپ نے پرہیزگاری، ہمت اور استغنا پر تقریر کی۔ پوری مجلس وجد میں آ گئی اور لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ وعظ کے بعد آپ کو اپنے ایک ارادت مند کے پاس جانا پڑ گیا۔ ارادت مند نے آپ کی دعوت کی تھی ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی طرف سے ایک کتا آ نکلا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ کو اس پر رحم آ گیا۔ آپ نے صاحب خانہ سے کہا۔ ''ایک روٹی لاؤ تاکہ میں اس کتے کو بھی دعوت میں شریک کر لوں۔''

صاحب خانہ نے آپ کے سامنے کئی روٹیاں لا کر رکھ دیں۔ آپ نے اس میں سے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی۔ کتے نے روٹی کی طرف دیکھا بھی نہیں، یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آپ یہ سمجھے کہ شاید کتے کی نظر روٹی پر پڑی نہیں ہے ورنہ ضرور کھاتا۔ روٹی کو اٹھا کر کتے کے منہ کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے روٹی پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

آپ نے کتے سے کہا۔ ''یہ روٹی میں نے تیرے لیے ڈالی ہے، کھاتا کیوں نہیں؟''

کتے نے آپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے روٹی اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی اور کہا۔ ''یہ روٹی میں اپنے ہاتھ سے تجھ کو کھلا رہا ہوں، میری خواہش ہے کہ تو شکم سیر ہو کر کھا لے تاکہ میں تیری شکم سیری سے مسرت حاصل کر سکوں۔''

کتے نے روٹی کی طرف دیکھا اور کھائے بغیر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔
آپ کو کتے کی حرکت ناگوار گزری اور کہا۔ ''کیوں کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ خدا نے تجھے رزق بھیجا ہے تو اس کو کھالے۔ تیرے انکار کی وجہ میری سمجھ میں تو آئی نہیں۔''
ابھی ان کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ انہوں نے محسوس کیا گویا کوئی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ ''اے ابوالعباس! تو نے آج جس پرہیز گاری، ہمت اور استغنا پر گھنٹوں وعظ کیا ہے افسوس کہ جب تیرے سامنے اس کی کوئی عملی شکل آئی تو تو محض نابلد نظر آنے لگتا ہے۔''
آپ کے منہ سے چیخ نکل گئی اور بے اختیار زبان سے نکلا۔ ''اے ابوالعباس! لعنت ہے تجھ پر کہ کتا تجھ سے زیادہ پرہیز گار نکلا۔''
اس کے بعد آپ بے ہوش ہو گئے۔
ہوش میں آنے کے بعد آپ نے خلوت نشینی اختیار کی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ لوگ آتے اور گھنٹوں بیٹھ کر چلے جاتے۔ انہیں پریشانی تھی کہ آخر ابوالعباس کو ہو کیا گیا ہے کہ ملنا جلنا اور بولنا ہی ترک کر دیا ہے۔
آخر ایک مرید نے آپ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ آپ نے اس کو اندر بلا لیا۔ اس نے اندر پہنچ کر یہ محسوس کیا کہ آپ ذرا دیر پہلے شاید رو رہے تھے۔ مرید نے پوچھا۔
''حضرت! آپ کے مزاج تو بخیر ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''بحمد للہ، ٹھیک ہوں۔''
مرید نے کہا۔ ''حضرت! کیا ابھی ابھی اس ناچیز کی آمد سے پہلے آپ غمگین تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں تو، یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟''
مرید نے عرض کیا۔ ''میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ آنکھوں کے نیچے غمگینی کے سیاہ حلقے اور نمی کو بہ آسانی دیکھ اور محسوس کر لیتا۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''اس دنیا میں خوش کون ہے؟ صرف وہ شخص جو اچھے برے کی تمیز نہیں کر سکتا۔''
مرید نے عرض کیا۔ ''حضور! آپ نے چند دنوں سے جو روش اختیار کر رکھی ہے، اس سے مریدوں کو بڑی فکر لاحق ہو گئی ہے اور وہ اس تبدیلی کا سبب جاننے کے لیے بے چین ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ لن ترانیوں سے باز آ جاؤں گا کیونکہ خاموشی میں عظمت ہے۔''
مرید نے کہا۔ ''آپ کس چیز کو لن ترانی فرما رہے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''وہ سب لن ترانی میں شمار ہوگا جو زبان سے تو نکل جائے مگر خود اس کے معیار پر پورا نہ اترے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں نے جن باتوں کی تلقین کی ہے، میں خود ان پر پورا نہیں اترتا تھا۔''
مرید نے کہا۔ ''یہ آج آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو ایک بات جانتا ہوں، وہ یہ کہ آپ اگر یوں خلوت نشین رہے اور اپنے عاشقوں اور ارادت مندوں کو اپنے دیدار اور کلام سے محروم رکھا تو وہ پاگل ہو جائیں گے اور آپ کی خلوت میں زبردستی داخل ہو جانے کی گستاخی کر بیٹھیں گے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''تو باہر جا کر شائقین سے کہہ دے کہ میں نے اپنے رب کے ایما پر خلوت نشینی اور سکوت اختیار کیا ہے۔ اب جب وہی یہ حکم دے گا کہ میں باہر نکلوں اور لوگوں سے کلام کروں تو باہر آ جاؤں گا۔''
مرید نے ضد سے کام لیا۔ ''حضرت! بحث و تکرار سے آپ کی سمع خراشی تو ضرور ہوگی لیکن میں اپنے اور اپنے جیسے دوسروں کے اطمینان کے لیے یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کو اپنے رب کے ایما کا علم کیونکر ہوا؟''
آپ نے کتے والا واقعہ سنا کر فرمایا۔ ''اس دن میں نے پرہیز گاری، ہمت اور استغنا پر جو کچھ کہا تھا، بعد میں مجھ کو یہ بتایا گیا کہ میں اپنے وعظ میں جو لاف گزاف مارتا رہا ہوں اور جو لن ترانیاں ہانکی ہیں، ان کے اصل مفہوم سے ایک کتا مجھ سے زیادہ واقف ہے، مجھ کو اس سے سبق لینا چاہیے۔ چنانچہ اب میں اتنا خوف زدہ ہو چکا ہوں کہ باہر نکلنے اور بات کرنے کی ہمت ہی جواب دے گئی ہے۔''
مرید نے عرض کیا۔ ''لیکن آپ کے مرید آپ کی یہ باتیں نہیں مانیں گے اور آپ کو اس حجرے سے باہر نکلنا اور لوگوں سے کلام کرنا پڑے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنے رب کے حکم پر ہی نکلوں گا اور کلام کروں گا تم لوگ میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ مجھ کو معاف کردے اور مجھ کو میرے کلام کے مطابق بنا دے۔''

مرید باہر آ گیا اور اپنی گفتگو سے سب کو مطلع کر دیا۔ لوگ بہت آزردہ ہوئے اور بہتوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ آپ باہر نکل کر شرف کلامی نہیں بخشیں گے۔

اس بات کو ہفتوں گزر گئے۔ آپ اپنے حجرے میں معتکف رہے۔ لوگوں کو یہ انتظار تھا کہ آخر یہ تعطل دور کس طرح ہوگا۔ آخر ایک دن حجرے میں آپ نے ایک روشنی سی محسوس کی۔ آپ پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور غشی کے عالم میں آپ نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے۔

''اے ابوالعباس! تجھ کو اس بات کا اتنا اثر نہیں لینا چاہیے تھا۔''

انہوں نے کہا۔ ''میں شرمندہ اور نادم ہوں اے میرے رب! مجھ کو باہر نکلتے اور لوگوں سے کلام کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گا اور لوگوں کو تعلیم و تلقین کس طرح کروں گا؟''

آواز آئی۔ ''تجھ کو جو علم دیا گیا ہے اور جو طاقتیں ملی ہیں، ان کی نشر و اشاعت بھی تجھ کو سونپی گئی ہے۔ تو حجرے سے باہر نکل اور حسب سابق اپنا کام شروع کر دے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے میرے رب! میں اس حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری استدعا ہے کہ مجھ کو میرے کلام کے مطابق اعمال رکھنے کی توفیق بھی مرحمت ہو اور آئندہ کی پشیمانیوں سے محفوظ رکھ۔''

اس بار انہیں سختی سے حکم دیا گیا۔ ''اے ابوالعباس! اب زیادہ قیل و قال نہ کر اور باہر نکل کر تشنگانِ علم کی پیاس بجھا ورنہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے تجھے جو کچھ دیا گیا ہے اس کو چھین لیا جائے کیونکہ جو تجھ کو بخشا جا سکتا ہے وہ سلب بھی کیا جا سکتا ہے۔''

آپ کو ایک جھٹکا سا لگا اور آپ ہوش میں آ گئے۔ اسی وقت حجرے سے باہر نکلے اور لوگوں سے کہا۔ ''لوگو! میں تم میں دوبارہ آ گیا ہوں اور اسی طرح تم میں اٹھوں بیٹھوں گا اور کلام کرتا رہوں گا جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں کیونکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔''

لوگوں نے خوشی میں نعرے لگائے اور احتراماً کھڑے ہو گئے، ہر ایک کے چہرے سے یہی محسوس ہو رہا تھا گویا یہ روز عید ہے اور وہ سب مل جل کر عید کی خوشیاں منا رہے ہیں۔

☆☆☆

آپ کے پاس ایک اجنبی شخص آیا۔ آپ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور نہایت دلچسپی اور محبت سے کہا۔ ''آ بھائی بیٹھ جا بول، کیسے آنا ہوا؟''

اس شخص نے کہا۔ ''بعض خیالات مجھ کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں ایک پیر کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ذرا دیر بیٹھ جا۔ ابھی تیری بات سنتے ہیں۔ مجھ میں اتنا یارا کہاں تھا کہ صبر کر کے بیٹھ جاتا، چنانچہ میں آپ کے پاس آ گیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''حضرت! میں نے کچھ لوگوں کو مظاہر میں گم دیکھا ہے اور ان کے برعکس کچھ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کیے خدا میں گم ہیں، میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان میں بزرگ اور برتر کون ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! جو ظہور کو دوست رکھتا ہے وہ ظہور کا بندہ ہے اور جو خدا کو دوست رکھتا ہے، وہ خدا کا بندہ ہے لیکن جو خدا کا بندہ ہے اس کے لیے ظہور اور خدا دونوں ہی برابر ہیں۔''

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ''حضرت! مجھ کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اس ڈر کو اپنے دل سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! تو یہ بات اچھی طرح اپنے دل میں بٹھا لے کہ جس کی اللہ سے دوستی ہوگی، وہ موت سے ہرگز نہیں ڈرے گا لیکن جو جتنا دور ہوگا، وہ موت سے اتنا ہی خوف زدہ ہوگا چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص بھی خدا سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہو، اس کو چاہیے کہ پہلے اس طرح خود کو کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، پتا چل جائے گا کہ اپنے دعوے میں وہ کتنا سچا ہے یا کتنا جھوٹا ہے۔''

وہ شخص مطمئن اور آسودہ سا ہو گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔ ''اب میں اس در کا ہو گیا کیونکہ آسودگی اسی در سے ملتی ہے۔''

جب وہ چلا گیا تو ایک مرید نے کہا۔ ''حضرت! یوں تو ہر روز آپ کے پاس کوئی نہ کوئی اجنبی آتے جاتے ہیں لیکن آپ ان پر

اتنی جلدی توجہ نہیں فرماتے جس طرح آج اس شخص پر فرمائی ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، اس کا ایک خاص سبب تھا، یہ شخص پہلے ایک دوسرے پیر کے پاس گیا تھا۔ اس پیر نے اس سے کہہ دیا کہ چند گھنٹے انتظار کر، اس کے بعد تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔ یہ شخص جس کرب اور بے چینی کا شکار تھا، اس میں چند گھنٹے انتظار کا یارا نہیں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا اور مجھ کو اس کی طرف فوراً ہی متوجہ ہو جانا پڑا۔"

ایک شخص نے دبی آواز میں کہا۔ "حضرت! اس طرح تو اس پہلے پیر کی مذمت ہو گئی جس کے پاس یہ اجنبی شخص آیا تھا اور اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ دوسروں سے افضل اور برتر ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے بلکہ میں نے جو بات کہی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو طمانیت اور آسودگی جہاں سے بھی ملے، حاصل کر لے۔ تم لوگ میری صحبت میں ہو اور یہیں رہو لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر تمہیں کوئی اور میٹھے پانی کا چشمہ میسر آجائے تو وہاں نہ جاؤ۔ تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

ایک دن ایک مرید آپ کے لیے کھانا لایا۔ وہ کھانے کو اس طرح چھپا کر لایا تھا کہ دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکی۔

کافی رات گئے جب لوگ چلے گئے تو یہ بیٹھا رہ گیا۔ آپ نے پوچھا۔ "تیرا کوئی کام ہے مجھ سے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، میں تو اس لیے رکا ہوا تھا کہ آپ کے لیے جو کچھ لایا ہوں، لوگوں کے چلے جانے کے بعد آپ کی خدمت میں ادب سے پیش کروں۔"

آپ نے پوچھا۔ "تو کیا لایا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کچھ کھانا ہے جو میں آپ کو کھلا کر واپس جاؤں گا۔"

آپ نے ناگواری سے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتا کہ تو کھانا چھپا کر کیوں لایا؟"

اس نے جواب دیا۔ "بس یونہی، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس میں دوسرے بھی شریک ہوں۔"

آپ نے افسوس کیا۔ "تو نے بہت برا کیا۔ تیرے خیالات فاسدانہ ہیں اور میں ایسا کھانا کسی حال میں نہیں کھاؤں گا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو۔"

اس شخص نے بڑی کوشش کی کہ آپ کھانا کھا لیں لیکن آپ نے نہیں کھایا، کھانا واپس کر دیا۔

چند دنوں بعد ایک دوسرے شخص نے سب کے سامنے اعلان کیا۔ "حضرت کے لیے آج میں کھانا لاؤں گا۔"

آپ نے اس شخص کو منع فرمایا۔ "تو یہ کیسا مہمل اور بے ہودہ اعلان کر رہا ہے۔"

اعلان کرنے والے نے کہا۔ "حضرت! اس میں بے ہودگی کیسی؟ میں واقعی کھانا لاؤں گا، میں جھوٹا اعلان نہیں کر رہا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "جس طرح میں وہ کھانا نہیں کھاتا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو، اسی طرح میں وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا جس کا اس طرح اعلان کیا گیا ہو۔"

اس شخص نے بڑی منت سماجت کی لیکن آپ نہیں مانے اور وہ کھانا نہیں کھایا۔

☆☆☆

ایک ایسا شخص آپ کے پاس آیا جس کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اس کی آمد کا ایسا شہرہ ہوا کہ آپ کے مریدوں میں بس یہی چرچا ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئیں گے لیکن وہ شخص آیا اور آپ کے انتظار میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کچھ لوگوں نے خبر دی اور کہا۔ "حضرت! یہ پرہیزگار شخص آپ سے ملاقات کا متمنی ہے لیکن آپ اس سے معلوم نہیں مل کیوں نہیں رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں مل لوں گا، جلدی کس بات کی ہے؟"

کسی نے کہا۔ "وہ شخص واپس جانا چاہتا ہے۔"

آپ اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی لیکن دوسروں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی کہ آپ اس عالم اور زاہد سے تپاک اور جوش سے نہیں مل رہے ہیں۔ گفتگو کا یہ عالم تھا کہ وہ شخص اگر کوئی بات کرتا تھا تو آپ اس کا مختصر جواب دے دیتے تھے، اپنی طرف سے کوئی بات بھی نہ کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عالم چلا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ "افسوس کہ اگر اس شخص کے دل میں اپنے علم اور زہد و تقویٰ کا غرور نہ ہوتا تو میں اس سے اس طرح ملتا کہ اس

کی دوسری کوئی مثال نہ ملتی مگر اس کے مغرور دل نے مجھ کو اس سے دور ہی دور رکھا۔"

مریدوں کو جو اس کا علم ہوا تو اس عالم کے پاس گئے کہ اس کا تاثر معلوم کریں۔ اس عالم نے آپ کے مریدوں کو دیکھتے ہی ان کا مذاق اڑایا، کہا۔ "افسوس کہ میں نے تو ابو العباس کا بڑا نام سنا تھا لیکن جب ان سے ملا تو مجھے اپنی برتری اور ان کی کمتری کا لمحوں ہی میں انکشاف ہو گیا۔ بفضلِ خدا میں ان سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہوں۔"

چند دنوں بعد ایک ایسا شخص آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا جو اپنے برے افعال کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس نے آپ کے مریدوں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بھائیو! میں حضرت ابو العباس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ مجھے شرفِ باریابی بخشیں گے؟"

ایک مرید نے آپ سے اس کے لیے اجازتِ ملاقات چاہی تو ابو العباس کو اس آنے والے پر بہت پیار آیا، بولے۔ "اس کو فوراً بلاؤ۔ میں اس سے ابھی اسی وقت ملوں گا۔"

اس آنے والے کو فوراً ہی آپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ آپ نے اس کو بڑے تپاک سے لیا۔ "ہاں بھائی کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! خیریت سے تو ہوں۔ بس آپ کے پاس آتے ہوئے ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے آیا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "کیوں، یہاں آتے ہوئے خوف کیوں محسوس ہوتا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ میں ایک گناہ گار انسان، آپ خاصۂ خاصان، معلوم نہیں شرفِ باریابی ملے یا یوں ہی ناکام واپس آنا پڑے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا امیر کا قصر نہیں، درویش کی کٹیا ہے اور وہ لوگ جنہیں اپنے گناہوں کا احساس ہے اور اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں، ان کے لیے تو میری کٹیا کا در ہر وقت کھلا رہتا ہے۔"

آنے والا آپ کی باتیں سن کر رونے لگا، بولا۔ "حضرت! آپ میرے حق میں دعا کیجیے کہ میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید گناہوں سے محفوظ رہوں اور خدا میری توبہ قبول کر لے۔"

آپ نے فرمایا۔ "خدا تیری ندامت اور پشیمانی دیکھ رہا ہے، اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔"

آپ اس کو بڑی دیر تک نصیحتیں کرتے رہے اور اس کی ہمت افزائی کرتے رہے اور آخر میں کہا۔ "اور جب تو یہ محسوس کر لے کہ خدا نے تیری توبہ قبول کر لی ہے اور خدا کی توفیق سے تو نے سیدھی راہ اختیار کر لی ہے تو یہیں سے تو گویا ایک پلِ صراط پر کھڑا ہو جائے گا کیونکہ تقویٰ اور پرہیز گاری کے پہلو میں، اس سے متصل شیطان بھی آن موجود ہوتا ہے اور وہ ہر وقت تقویٰ اور پرہیز گاری پر فخر اور غرور کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سارا کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے اور آدمی ایک ایسی دلدل میں اتر جاتا ہے کہ بس اس دلدل سے خدا ہی نکالے تو انسان نکل سکتا ہے ورنہ ہر راہ بند ہو چکی ہوتی ہے۔"

اس نے روتے ہوئے کہا۔ "حضرت! میں تو آپ کے قدموں میں ہی رہنا چاہتا ہوں اور ہر قدم پر آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں کیونکہ کسی راہنمائی کے بغیر یہ کام مشکل ہے۔"

اس کے بعد وہ شخص آپ ہی کے پاس رہ گیا۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کرتا اور شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس شخص میں بزرگی اور عظمت کے آثار محسوس کیے جانے لگے۔ اس میں عاجزی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت لغزشوں اور گناہوں سے خوف زدہ رہتا تھا اور احتیاط اور عاجزی کا دامن ہر وقت پکڑے رہتا۔

☆☆☆

شہر میں ایک ایسے شخص کا بڑا چرچا تھا جو حج کر کے واپس آیا تھا اور بہت عالم مشہور تھا۔ آپ کے مرید بھی اس کی شہرت سے خاصے متاثر تھے اور آپ سے دبی زبان میں خواہش کرتے رہتے تھے کہ اس شخص سے ایک بار ملنا ضرور چاہیے۔

آپ نے عاجز آ کر پوچھا۔ "تم لوگ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ وہ بہت عالم شخص ہے۔ اس کی علمیت کا آس پاس کوئی جواب نہیں۔"

آپ نے پھر پوچھا۔ "اس کے علاوہ اور کچھ؟"

مرید نے جواب دیا۔ ''اور یہ کہ وہ حج کر کے آیا ہے اور وہاں سے متعلق بڑی اثر انگیز باتیں کرتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تب پھر میں اس سے ضرور ملوں گا۔ تم سب بھی میرے ساتھ ہی چلو۔''

لوگ ہنسی خوشی تیار ہو گئے اور کچھ دیر بعد آپ ان سب کے ساتھ اس شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس عالم کو جب آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو بہت خوش ہوا اور پھولا نہ سمایا۔

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! تو بڑا خوش قسمت ہے کہ خانۂ خدا اور دیارِ حبیب ﷺ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کی۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''بڑی دشوار گزار راہیں تھیں اور راستے میں بھی راہزنوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''دیارِ حبیب پہنچ کر شاید ہی کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو رکھ پاتا ہو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میں تو جناب مدینے میں خوب گھوما پھرا بڑا مزہ آیا اور ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی نئے شہر میں جایئے دل خوش ہو جاتا ہے۔''

آپ نے مزید فرمایا۔ ''حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔''

جواب ملا۔ ''بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم گھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''جناب کا حج کیسا رہا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جناب! بڑا سستا سماں تھا، پانی کی بہتات تھی اور وہاں ایک ایک چیز کا نرخ مجھ سے معلوم کر لیجیے۔ ایک ایک چیز اور اس کا نرخ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔''

آپ نے افسوس سے کہا۔ ''اے شخص! تو نے میری ہر بات کا عجیب بے تکا جواب دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیارِ حبیب میں آدمی فوراً جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے اور تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایک مدینے پر ہی کیا موقوف، ہر نئی جگہ پر لطف آتا ہوتا ہے۔ میں نے کہا حرم پاک میں داخل ہو کر اس کے زمانے، فاصلے سمٹ کر خیالوں میں قید ہو جاتے ہیں اور آدمی وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے جو حرم پاک کی تعمیر اور اس کے نشیب و فراز سے متعلق ہے لیکن تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ تجھ کو حجاج کے ہجوم سے وحشت ہونے لگی تھی اور اب سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ حج کیسا تھا؟ تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ بڑا سستا سماں تھا۔ پانی کی بہتات تھی اور تجھ کو وہاں کی ایک ایک چیز کے نرخ ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تیرے حج میں وہ کون سا جذبہ شامل ہے جس کی میں تعریف کروں، وہ کون سا عشق تھا جس کا ہم سب احترام کریں؟''

اس شخص نے کہا۔ ''حج میں جذبے یا عشق کا کیا کام؟ میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ میں نے حج کر لیا جب کہ دوسرے بہت سے لوگ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ میں اسی کو اپنی خوش قسمتی اور وجۂ فخر سمجھتا ہوں۔''

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ ''میرا خیال ہے بقیہ باتیں نماز کے بعد ہو جائیں گی، آؤ پہلے ہم سب نماز پڑھ لیں۔''

اس شخص نے فوراً جواب دیا۔ ''بے شک، بے شک۔ پہلے نماز پڑھ لیں۔''

وہ شخص فوراً وضو کے لیے بھاگا۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ آپ نے دیکھا وضو میں وہ بار بار ہاتھ دھو رہا ہے پھر چہرہ دھویا تو تین کے بجائے چار مرتبہ دھویا اور جب ایک بار زیادہ کا خیال آیا تو دوبارہ دھونے لگا اور پانچ مرتبہ دھو گیا۔ پھر غلطی کا احساس ہوا تو تیسری بار چہرے پر پانی پھیرنے لگا اس طرح مسلسل وسوسوں میں مبتلا رہا۔

آپ نے فرمایا۔ ''مغرب کا وقت تنگ ہوتا ہے، خدا کے لیے وضو سے جلد از جلد فارغ ہو جا تاکہ نماز میں تاخیر نہ ہو۔''

یہ مشکل وضو کر کے آیا اور امام کی جگہ جا کھڑا ہوا۔ آپ کسی اعتراض کے بغیر اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلی رکعت میں ہی اس نے تین سجدے کیے۔ یہاں تک کہ نماز کے ختم ہوتے ہوتے ہوئے اس نے کئی سجدے غلط کیے۔

آپ نے دوبارہ نماز ادا کی اور اپنے مریدوں سے فرمایا۔ ''تم سب اس کے کس علم کی تعریفیں کیا کرتے تھے؟ اس علم کی جو سہو اور وسوسوں کا شکار ہے۔ جس شخص کو وضو اور نماز کے پانچ وقتی معمولات میں وسوسوں نے تنگ کر رکھا ہو، میں اس کی علمیت پر کبھی یقین نہیں کروں گا۔ اس کا علم بھی اسی طرح سہو اور وسوسوں میں مبتلا ہو گا۔''

آپ نہایت مایوس اور افسردہ اپنے حجرے میں واپس پہنچے اور مریدوں سے کہا۔ ''میں تم لوگوں کے کہنے پر اس شخص کے پاس چلا گیا تھا، ورنہ مجھ کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ میں تمہیں یہ باتیں پہلے ہی بتا سکتا تھا لیکن اس تجربے اور مشاہدے سے پہلے تم لوگ شاید میری باتوں پر یقین نہ کرتے۔''

مریدوں نے بالاتفاق عرض کیا۔ ''ہمیں آپ کی ہر بات پر یقین ہے چنانچہ اگر آپ ہمیں یہ باتیں پہلے بتا دیتے تو ہم سب اس شخص کے پاس ہرگز نہ جاتے۔''

آپ کے مریدوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے یہ زعم ہو گیا تھا کہ اس نے آپ سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور اتنا جانتا ہے کہ ابوالعباس کے علاوہ کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے آپ کے پاس آنا بند کر دیا اور اس کا امیدوار ہوا کہ کوئی خود اس کے پاس پہنچے اور اسی ادب و احترام کا مظاہرہ کرے جس کا ابوالعباس کی مجلسوں میں ہوتا رہتا ہے۔

آپ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کبھی ذکر تک نہیں کرتے۔ ایک عرصے بعد وہ آپ کی خدمت میں آیا اور چند مسائل بھی اپنے ساتھ لایا۔ آپ نے ایک نظر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔ ''تو کہاں چلا گیا تھا؟ خیریت تو ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں موجود تو اسی شہر میں تھا لیکن میں نے ایک عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں، میں خود مستغنی ہو چکا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! تو نے یہ کیسی بات کہہ دی؟''

اس شخص نے پوچھا۔ ''کیسی بات؟ کون سی بات؟ میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جہاں تک استغنا کا سوال ہے، اس دنیا کا کوئی شخص بھی استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس کا تو کر رہا ہے۔'' وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! کیا تو جانتا ہے کہ جب یہ زمین معرضِ وجود میں آئی تھی تو اس کا کیا حال تھا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''نہیں حضرت! آپ ہی بتائیں گے تو بات معلوم ہو جائے گی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''وجود میں آتے ہی زمین کی بے چینی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بے چینی کو پہاڑوں کے بوجھ سے دبا دیا۔ بعینہٖ یہی حال انسانی نفس کا ہے، خدا نے جب نفس کو پیدا کیا تھا تو یہ بھی بہت بے چین تھا۔ خدا نے اس کو بھی عقل کے پہاڑ سے دبا دیا۔''

آپ قاہرہ سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ آپ نے ہجوم دیکھا۔ کوئی موٹا تازہ شخص وعظ کرنے میں مشغول تھا اور سامعین دین و دنیا سے بیگانہ اس کا وعظ سننے میں مشغول تھے۔ آپ اس کا وعظ سننے لگے۔ آپ کے پاس جو شخص کھڑا تھا، واعظ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار واعظ کو دیکھتا اور زیر لب کچھ کہہ کر رہ جاتا۔

آخر آپ نے پوچھا۔ ''اے شخص! تو کس کرب و اذیت میں مبتلا ہے کہ وعظ بھی غور سے نہیں سن رہا؟''

اس نے آپ کو غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ ''میرا خیال تھا کہ واعظ کی فربہی اور تر و تازگی میری طرح دوسروں کو بھی حیرت میں ڈال دے گی لیکن اب معلوم ہوا کہ یہاں میرے سوا ایک بھی صاحب نظر نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تیری بات نہیں سمجھا کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب! میں واعظ میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا، جو اس کے زہد اور تقویٰ کی گواہی دیتی ہو۔ مجھ کو تو یہ شخص بڑا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔''

اس شخص نے یہ بات اتنی آہستگی سے کہی تھی کہ کسی اور کے سننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ واعظ نے دور ہی سے بہ آواز بلند کہا۔ ''اے شخص! جو مجھے سرگوشی میں جھوٹا کہہ رہا ہے ذرا سامنے تو آتا کہ میں بھی اس سچے اور ایماندار شخص کی شکل دیکھ لوں۔''

معترض اس للکار سے حیرت زدہ بھی ہوا اور خوفزدہ بھی۔ اس نے ایک بار پھر سرگوشی میں کہا۔ ''حضرت! اس شخص کو میرے اعتراض اور شبہے کا کس طرح علم ہو گیا؟''

اور آپ کے بجائے اس سوال کا جواب بھی اس واعظ نے دیا۔ ''او چھوٹے سر والے! تو نے میرے موٹاپے پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ میں کیسا اپنے رب کا عاشق ہوں کہ میرا موٹاپا میرے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے حالانکہ میرے دل میں

جو عشقِ الٰہی موجزن ہے، اس نے تیری سرگوشی کو میرے دل تک پہنچا دیا۔''

آپ نے معافی چاہی۔ ''اے واعظ! جب تو اپنے رب کا اتنا بڑا عاشق بامراد ہے تو اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچ۔ کیونکہ سب کچھ اپنے سینے میں چھپا کر لے جانا، یہ عاشقوں کی شان اور حوصلے کے خلاف ہے۔ اپنے علم اور بصیرت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔''

واعظ نے دور ہی سے جواب دیا۔ ''جناب! آپ تو یہ نہ کہیے۔ آپ کا جو مقام ہے اس سے میں واقف ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! میں نادم اور شرمندہ ہوں گو کہ تیرے مرتبے اور بزرگی کا ہر ایک کو علم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود لوں پر تیری زبان کا زور نہیں چل رہا۔ اپنے وعظ میں اثر بھر دے تاکہ جو بھی تیرا وعظ سن کر اٹھے، اپنے آپ میں نہ رہے۔''

واعظ نے جواب دیا۔ ''اے ابوالعباس! اگر یہ بات اپنے بس کی ہوتی تو آپ کی مجلس کے لوگ آپ کی صحبت سے ہرگز مستغنی نہ ہونے لگتے۔ جس دل میں جتنی صلاحیت ہوتی ہے میری باتوں کا اتنا ہی اثر قبول کر لیتا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اثر پذیری کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔''

آپ یہاں سے اسکندریہ تشریف لے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے پھر واپس قاہرہ آگئے۔

ایک دن آپ بڑے جذبے اور جوش میں تھے، اپنے مریدوں سے پوچھا۔ ''کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھے فتی (جوان مرد) اور فتوت (جوانمردی) کا مطلب سمجھا دے۔''

کئی نے لب کھولنا چاہے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ ایک نے سب کی یہ کیفیت محسوس کر لی، بولا۔ ''حضرت! ہم میں کئی ایسے ہیں جو آپ کے سوال کا جواب دے سکتے ہیں لیکن آپ کا رعب ان پر غالب ہے اور ان میں اتنی قوت بھی نہیں کہ آپ کے سامنے لب ہلا سکیں، شاید اگر وہ ایسا کر سکتے تو یہی فتی اور فتوت کہلاتے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات ہرگز نہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ صاحب فتوت تھے، انہوں نے حسی بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اے لوگو! تمہارے سامنے بھی پانچ بت ہیں۔ پانچ معنوی بت اگر تم ان بتوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ تو فتی کہلاؤ۔''

کسی نے سوال کیا۔ ''پانچ معنوی بت کون کون سے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پہلا بت نفس، دوسرا ہوا و ہوس، تیسرا شیطان، چوتھا شہوت اور پانچواں دنیا ہے۔''

لوگوں نے نعرۂ تحسین و آفریں بلند کیا اور بڑی دیر تک بے حال رہے۔ آپ فتوت اور فتی پر بڑی دیر تک بولتے رہے۔

☆☆☆

آپ ایک عرصے تک اپنی تعلیمات اور تشریحات سے لوگوں کی تشنگی بجھاتے رہے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے پر کھلی تنقید کر دیا کرتے تھے، چنانچہ کسی فقیہ کو دیکھتے اور اس سے چند باتیں بھی کر چکتے تو بڑے افسوس سے فرماتے کہ صحیح معنوں میں فقیہ وہ ہے جس کے دل کا حجاب دور ہو چکا ہو۔''

مختلف صوفیوں اور عالموں کے بارے میں سوالات لے کر لوگ حاضریاں دیتے اور آپ ان سب کو اپنے مدلل اور... دل نشیں جواب سے خاموش اور مطمئن کر دیتے۔

آپ آخری عمر میں زندگی سے بے زار ہو گئے تھے اور جب 686ھ میں آپ نے وصال فرمایا تو ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ آپ کے عقیدت مند روتے روتے بے حال ہو گئے لیکن وہ آفتاب عظمت و بزرگی ایک بار جو فنا کی وادی میں اترا تو پھر کبھی واپس نہ آیا۔ یوں تو سبھی کو مرنا ہے اور ہر روز لوگ مرتے رہتے ہیں لیکن ابوالعباس کی وفات آفتاب کے غروب ہو جانے کی طرح تھی۔ چاروں طرف غموں کی بدلیاں چھا گئیں اور لوگ اپنے دامنوں اور رداؤں میں منہ چھپا چھپا کر رو لیا کرتے تھے۔

کہانی کے تاریخی ماخذ

سید ابوالحسن ندوی	ابن اثیر	منہاج سراج	علامہ عبدالوہاب	ابی جعفر جریر طبری	المسعودی

سفر چاہے جسمانی ہو یا روحانی... شوق ہو تو منزل کی دوری، دوری نہیں رہتی نہ صرف یہ بلکہ مشکلات کی مجبوری بھی پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں... اور کچھ انسانوں کے پیروں میں اللہ تعالیٰ اتنا سفر لکھ دیتا ہے کہ کوئی ایک جگہ ان کی شناخت نہیں رہتی بلکہ ہر جگہ ان کے قدموں کے نشانات ثبت ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی ولیوں میں ہوتا ہے جن کی کرامات کسی ایک مخصوص جگہ کے لیے نہیں بلکہ زمین کے مختلف حصوں میں رہنے والے آپ کے علم سے فیض یاب ہوتے رہے۔

بستی بستی، نگری نگری گشت کرنے والے ایک کامل ولی کی روداد

جہانیاں جہاں گشت

ضیا تسنیم بلگرامی



اوچ (بہاول پور) میں سیدوں کے خاندان کو ایک خاص شہرت حاصل تھی۔ اس خاندان میں سید جلال بخاری نے مشہور بزرگ حضرت زکریا ملتانی سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کرلیا۔ یہ ملتان سے اوچ واپس تشریف لے گئے۔ وہیں شادی کی اور اللہ اللہ میں زندگی بسر کرنے لگے۔ یہیں ان کے تین فرزند پیدا ہوئے۔ سید احمد کبیر، سید بہاء الدین اور سید محمد۔ سید احمد کبیر نے اپنے باپ کی سجادگی حاصل کی۔ ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ سید جلال الدین حسین بخاری اور سید صدر

الدین راجو قتال اور یہ دونوں فرزند شہرت اور ناموری میں غیر معمولی ثابت ہوئے۔

ان دنوں بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید شیخ جمال خجندی کو بزرگی میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ جلال الدین حسین کو سات سال کی عمر میں شیخ جمال خجندی کی خدمت میں پیش کیا گیا اور باپ نے ان سے درخواست کی کہ اس بچے کے حق میں دعا کی جائے۔

جمال خجندی نے جلال الدین بخاری کو غائر نظروں سے دیکھا اور سید کبیر احمد کو جواب دیا۔ "بابا سید احمد! تو کس کے حق میں دعا کی درخواست کر رہا ہے؟ کیا تو نے اپنے بیٹے کو اب تک نہیں پہچانا؟"

باپ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں ناچیز کسی کو کیا پہچانوں گا، یہ بات تو منجانب اللہ حاصل ہوتی ہے۔"

جمال خجندی نے فرمایا۔ "بابا سید احمد! تو ذرا دم لے۔ دیکھ میں کیا تماشا دکھاتا ہوں۔ تو خاموش دیکھتا رہ اور کچھ نہیں۔"

سید احمد کبیر نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میری کیا مجال جو دم بھی ماروں۔"

جمال خجندی نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ "ارے یہ تو لوگوں کی شکلیں کیا دیکھ رہا ہے، یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ ذرا بھاگ کے جا اور ان کے لیے کھجوریں تو لے آ۔"

مرید فوراً ہی تڑاٹ ہو گیا..... اور کھجوروں سے لبریز طباق لے آیا اور اسے آپ نے حاضرین میں تقسیم کر دیا۔ جمال خجندی نے حاضرین کو حکم دیا۔ "اب آپ لوگ کھجوریں کھانا شروع کر دیں، تکلف نہ فرمائیں۔"

اجازت پاتے ہی لوگوں نے کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ جمال خجندی نے پوچھا۔ "حضرات! کھجوروں کا ذائقہ پسند آیا؟"

لوگوں نے تقریباً یک آواز جواب دیا۔ "جناب والا! آپ کوئی چیز مرحمت فرمائیں اور وہ بے مزہ ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

کھانے والوں نے کھجور کی گٹھلیاں اپنے آگے رکھ لی تھیں۔ شیخ جمال الدین خجندی نے خادم کو حکم دیا کہ گٹھلیاں پھینک دی جائیں۔ خادم نے سب کے آگے سے گٹھلیاں سمیٹ لیں مگر سات سالہ بچے جلال الدین کے آگے گٹھلیاں نہیں تھیں۔

خادم نے آپ سے پوچھا۔ "میاں صاحبزادے! آپ کی گٹھلیاں کہاں ہیں؟"

جلال الدین نے معصومیت سے جواب دیا۔ "کھا گیا۔"

خادم نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا فرمایا آپ نے؟ آپ گٹھلیاں کھا گئے..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "جناب! میری بات کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ میں نے گٹھلیاں کھا لیں۔"

حاضرین مجلس بھی یہ دلچسپ گفتگو سن رہے تھے۔

خادم نے مزید پوچھا۔ "حضرت! آپ نے کھجوریں کھائیں یا گٹھلیاں؟ کیا آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مفہوم جانتے ہیں؟"

جلال الدین نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "جناب! میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں، میں نے جو کچھ کیا ہے، اسے بھول جاؤں۔ میں تمہیں بار بار یہ بتا رہا ہوں کہ میں کھجوریں گٹھلیوں سمیت کھا گیا۔"

شیخ جمال الدین خجندی نے ہاتھ کے اشارے سے سات سالہ جلال الدین کو اپنے پاس بلایا۔ وہ چلے گئے۔ شیخ جمال نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "ہاں میاں صاحبزادے! گٹھلیوں کی بابت آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "حضرت! میں بار بار یہ بتا رہا ہوں کہ میں کھجوریں گٹھلیوں سمیت کھا گیا لیکن آپ کا خادم میری یہ سیدھی سادی بات بھی نہیں سمجھ پا رہا۔"

شیخ جمال الدین نے فرمایا۔ "لیکن صاحبزادے! گٹھلیاں تو کوئی بھی نہیں کھاتا۔ تم کیوں کھا گئے؟"

جلال الدین نے سادگی سے جواب دیا۔ "حضرت! یہ کھجوریں مجھے آپ کے دستِ مبارک سے عطا ہوئی تھیں۔ پھر میں ان کی گٹھلیاں کس طرح پھینک دیتا۔ میرے لیے تو کھجور کی ہر چیز متبرک تھی۔"

شیخ جمال اس بات سے بہت خوش ہوئے، بولے۔ ''جلال الدین! تو وہ شمع ہے جس کی روشنی قیامت تک رہے گی اور اس میں تیرے خاندان کا نام روشن رہے گا۔''

باپ نے بیٹے کے بارے میں یہ بشارت جو سنی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بڑی دیر تک بیٹے کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے رہے۔

شیخ جمال نے سید احمد کبیر سے کہا۔ ''تم ذرا سی دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔''

باپ، بیٹے کو چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ شیخ جمال نے آہستہ سے کہا۔ ''بیٹے جلال الدین! تم ذرا اور قریب آجاؤ۔''

جلال الدین ان سے اور قریب آگئے۔

شیخ جمال نے پوچھا۔ ''صاحبزادے! میں تمہارے حافظے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ سنتا ہوں تمہیں اپنے بچپن کی باتیں اس طرح یاد ہیں گویا آج کل میں ہی ہوئی ہوں۔''

جلال الدین نے جواب دیا۔ ''ہاں مجھے اپنے بچپن ہی کی نہیں، شیرخوارگی کی باتیں بھی یاد ہیں۔''

شیخ جمال نے کہا۔ ''مثلاً کوئی ایک بات؟ کوئی ایک واقعہ؟''

جلال الدین نے جواب دیا۔ ''جب میں چھ دن کا تھا تو جس عورت نے مجھے نہلا کر کپڑے پہنائے تھے، میں اس کو آج بھی پہچان سکتا ہوں۔''

شیخ جمال نے حیرت سے کہا۔ ''اچھا تو بتاؤ کہ وہ عورت کون سا اور کس رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی؟''

جلال الدین نے آنکھیں بند کیں اور حافظے پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ ''وہ عورت گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کا رنگ گندمی اور قد ذرا لمبا تھا۔''

شیخ جمال کو بچے کی باتوں میں مزہ بھی آرہا تھا اور حیرت بھی ہو رہی تھی۔ پوچھا۔ ''اور کچھ؟''

جلال الدین نے جواب دیا۔ ''میری ماں نے اس کا نام حبیبہ بی کہہ کر لیا تھا۔''

یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر کسی کو مشکل ہی سے یقین آسکتا تھا۔ لیکن شیخ جمال کو بچے کی ایک ایک بات پر پورا یقین تھا۔

شیخ جمال نے سید احمد کبیر کو اندر بلا لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہا..... ''بابا سید احمد کبیر! میں تم سے چند باتیں پوچھوں گا۔ وہ باتیں سات سال پیچھے کی ہیں۔ تم حافظے پر زور دے کر جواب دو۔ شاید یاد آجائیں۔''

سید احمد کبیر نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ سوال کیجیے، میں یاد کر کے صحیح جواب دینے کی کوشش کروں گا۔''

شیخ جمال نے کہا۔ ''بابا! چھٹی کے دن جلال الدین کو نہلایا کس نے تھا؟''

سید احمد کبیر نے ذہن پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ ''ہاں مجھے یاد آیا۔ اس دن اتفاق سے دائی نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن حبیبہ بی کو بھیج دیا تھا۔''

شیخ جمال نے پوچھا۔ ''شاید یہ پوچھنا لاحاصل ہو کہ اس دن حبیبہ بی نے لباس کس رنگ کا پہن رکھا تھا کیونکہ اتنی سی بات کو کون یاد رکھ سکتا ہے۔''

سید احمد کبیر نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ حبیبہ بی کو گلابی رنگ بہت پسند تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور اس رنگ پر گلابی رنگ کھل جاتا تھا۔ اس لیے وہ اکثر گلابی رنگ کے کپڑے پہنتی تھی۔''

شیخ جمال نے جلال الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بابا سید کبیر! میں تم سے سچ کہتا ہوں، تمہارا بیٹا جلال الدین تمہارے خاندان کا نام قیامت تک کے لیے روشن کر دے گا۔''

سید احمد کبیر نے بیٹے سے تخلیے میں کی جانے والی باتوں کی بابت جاننا چاہا لیکن شیخ جمال نے کچھ بھی نہ بتایا۔ کچھ نہ جاننے کے باوجود باپ کو شیخ جمال کی باتوں پر اتنا یقین تھا کہ وہ اس کا لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

جلال الدین کی تعلیم و تربیت شیخ جمال خجندی اور شیخ بہاءالدین قاضی اوچ کے سپرد ہوئی۔ ان دونوں نے جس لگن اور دل سوزی سے یہ فرائض انجام دیے، اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی تھی۔ اس دوران قاضی بہاءالدین کا انتقال ہو گیا اور جلال

الدین کو ملتان جانا پڑا۔ ملتان میں بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ رکن الدین سجادہ نشینی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور آپ کے تبحرِ علمی اور بزرگی کا شہرہ بیرونِ ہند تک پہنچ چکا تھا۔ دہلی کا بادشاہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا اور شیخ رکن الدین کو حضرت نظام الدین اولیاء پر ترجیح دیتا تھا۔ جب جلال الدین، شیخ رکن الدین کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے جلال الدین کو غیر معمولی تپاک سے لیا۔ اس وقت خانقاہ میں بہت سے مرید اور ارادت مند موجود تھے۔ شیخ رکن الدین نے جلال الدین کو اپنے پاس بٹھالیا اور حاضرین سے فرمایا۔ ''حضرات! یہ جلال الدین حسین بخاری ہیں۔ جلال بخاری کے پوتے۔ یہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔''

حاضرین نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ شیخ رکن الدین طلبا کو خانقاہ میں ٹھہرایا کرتے تھے لیکن جلال الدین کو انہوں نے مدرسے میں ٹھہرایا۔ طالب علموں کو کھانا خانقاہ سے دیا جاتا تھا لیکن جلال الدین کو گھر سے بھیجا جاتا تھا۔

جلال الدین نے ان سے ایک سال تک تعلیم حاصل کی۔ ایک سال بعد انہیں اوچ واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ شیخ رکن الدین نے ان کے لیے خاص کشتی کا انتظام کیا۔ جلال الدین اوچ واپس پہنچے اور کچھ دن قیام فرما کر اساتذہ اور مشائخ کی تلاش میں سفر اختیار کیا۔ جلال الدین کے لیے ہر شیخ قابلِ تعظیم اور لائقِ صحبت تھا، خواہ وہ کسی بھی مسلک کا ہو۔ اس سیر و سیاحت میں آپ نے تین سو سے زیادہ اہلِ کمال سے شرفِ ملاقات حاصل کیا اور ان سے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کیا۔ یہاں تک کہ بیت اللہ تشریف لے گئے۔ وہاں سید عبداللہ یافعی شافعی سے گہرے مراسم ہو گئے اور دونوں میں بڑی صحبت و موانست رہی۔

جلال الدین انہیں ساتھ لے کر کعبے کا طواف کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سید عبداللہ یافعی بھی انہیں ساتھ لے کر طوافِ کعبہ کے لیے چلے جاتے اور پھر دونوں ایک ساتھ یہ فرض انجام دیتے۔

انہی ملاقاتوں اور باتوں کے دوران سید عبداللہ نے جلال الدین کو حضرت نصیر الدین کی صاحبِ کمال شخصیت اور کرامات کے متعلق بہت کچھ بتایا۔

جلال الدین نے دریافت کیا۔ ''سیدی! کیا ہند میں نصیر الدین محمود کے علاوہ اس پایہ کا کوئی اور نہیں ہے؟''

سید عبداللہ یافعی نے جواب دیا۔ ''نہیں، ان سے پہلے ایک موجود تھے لیکن اب وہ نہیں رہے۔ ان کی تاثیر اور برکت نصیر الدین محمود میں آ گئی ہے۔ وہ دہلی کے چراغ کہلاتے ہیں۔''

ان باتوں نے جلال الدین میں بے انتہا اشتیاق پیدا کر دیا اور وہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے ملنے کے لیے بے چین رہنے لگے۔

☆☆☆

جلال الدین ہندوستان واپس آئے اور سیدھے ملتان واپس پہنچے۔ وہاں شیخ رکن الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ رکن الدین اوپر کی منزل میں تشریف رکھتے تھے۔ جلال الدین کی آمد کی خبر سنتے ہی آپ اوپر سے اترنے لگے۔ جلال الدین زینے پر لیٹ گئے اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کو اترنے میں زحمت ہوگی اس لیے بہ آسانی اترنے کے لیے آپ میرے سینے پر پاؤں رکھ کر اتریے۔''

شیخ رکن الدین دم بخود انہیں دیکھتے رہ گئے، کچھ دیر بعد بولے۔ ''اے سید! یہ تو نے کیا کیا؟ بابِ نبوت تو مسدود ہو چکا ہے اس لیے وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں مرتبۂ ولایت کہیں نہیں گیا، وہ تجھے مل جائے گا۔''

اس ارشاد کے بعد شیخ رکن الدین نے آپ کو اٹھا کر سینے سے لگالیا اور وہ کچھ عطا کر دیا جس کی انہیں تمنا تھی۔

اس کے بعد آپ نے دہلی کوچ کیا کیونکہ چراغ دہلی سے ملنا بہت ضروری تھا۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے بڑے شوق سے انہیں اپنی صحبت میں بٹھایا۔ یہاں جلال الدین نے چراغ دہلی سے بیعت کیا اور ان کی مریدی کے بعد ان سے خلافت حاصل کی۔ اس طرح انہوں نے چودہ خانوادوں سے خلافت حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ چراغ دہلی کی صحبت میں رہ کر یہ ملتان واپس چلے گئے۔ عید ملتان ہی میں منائی اور نمازِ عید کے بعد آپ نے بہاء الدین زکریا ملتانی کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ادب سے عرض کیا۔ ''بابا زکریا ملتانی! ایک بے نوا اور بے سہارا آپ کے پاس آیا ہے، عید کا دن ہے۔ کیا

میں یہاں سے عیدی لیے بغیر چلا جاؤں؟"
اسی وقت آپ نے ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ "جلال الدین! جا اب تُو مخدوم جہانیاں ہوگیا اور اس نام سے تُو شہرت پائے گا۔"
جلال الدین یہاں سے زکریا ملتانی کے بڑے صاحبزادے صدرالدین کے مزار پر تشریف لے گئے اور وہاں بھی یہی مطالبہ کیا کہ میں آپ سے عیدی لینے آیا ہوں اور عیدی لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔
یہاں بھی ایک آواز سنائی دی۔ "جلال الدین! میرے والد زکریا ملتانی نے تجھ کو مخدوم جہانیاں کا خطاب دیا ہے۔ کیا اس سے تجھے اختلاف ہے؟ بہرحال وہی عیدی میں دے رہا ہوں۔ اب تو مخدوم جہانیاں ہے۔"
آپ یہاں سے باہر نکلے تو راستے میں جو بھی ملا، اس نے آپ کو مخدوم جہانیاں کہہ کر ہی مخاطب کیا۔
اب آپ کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔ انہی دنوں بنگال میں شیخ علاؤالدین چشتی بنگالی قطب کی طبیعت خراب ہوئی اور زندگی کے آثار جاتے رہے تو انہوں نے اپنے مریدوں کو وصیت کی۔ "دوستو! یہ میری وصیت ہے کہ میری نمازِ جنازہ جلال الدین مخدوم جہانیاں پڑھائیں گے۔ ان کے علاوہ کوئی نماز جنازہ نہ پڑھائے ورنہ میں یہ روزِ قیامت دامن گیر ہوں گا۔"
مرید آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "بھائی اپنی سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ جو شخص پنجاب میں بمقام اوچ رہتا ہے، وہ پیرومرشد کی نمازِ جنازہ کس طرح پڑھائے گا۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ بنگال تک پلک جھپکتے پہنچیں گے کس طرح؟"
کسی دوسرے مرید نے سرگوشی میں کہا۔ "کہیں اپنے پیرومرشد حالتِ ہذیان میں تو نہیں تھے؟"
پیرومرشد نے ان دونوں کو جواب دیا۔ "لوگو! ان دونوں سے کہہ دو کہ میرا دماغی توازن خراب نہیں ہوا اور میں اپنے ہوش وحواس میں ہوں۔ رہا یہ سوال کہ مخدوم جہانیاں میری نمازِ جنازہ کس طرح پڑھائیں گے تو یہ فکر تمہیں نہیں مجھے ہونی چاہیے اور میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔ مخدوم جہانیاں ہی میری نمازِ جنازہ پڑھائیں گے کسی کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"
چند گھنٹوں بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اب کوئی مرید یا کوئی اور شخص ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھا سکتا تھا۔ وہ لوگ بڑی بے چینی سے کسی بات کا انتظار کررہے تھے۔ آخر ان سب نے ایک طرف سے مخدوم جہانیاں کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ جنازے کے قریب گئے اور لوگوں سے کہا۔ "لوگو! میں ان کی خواہش پر نمازِ جنازہ پڑھانے آگیا ہوں۔ ذرا اپنی صفیں تو درست کرلو تم سب!"
لوگ ان کی تشریف آوری پر حیران تھے لیکن مخدوم جہانیاں ان کے سامنے موجود تھے اس لیے وہ ان کی موجودگی پر شک وشبہ بھی نہیں کرسکتے تھے۔
لوگوں نے صفیں درست کیں۔ آپ نے شیخ علاؤالدین چشتی کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے وطن اوچ واپس چلے گئے۔ لوگوں کی نظر میں یہ سب کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔
ایک اور بزرگ خواجہ شرف الدین احمد منیری نے آپ کے پاس اپنی جوتی بھیجی۔ آپ نے اس کے جواب میں نہایت عاجزی اور انکساری سے دستار بھیج دی۔ مریدوں نے پوچھا۔ "حضرت! خواجہ شرف الدین نے آپ کو اپنی جوتی کیوں بھیجی تھی......اس کا مطلب کیا تھا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اس کا مطلب یہ تھا کہ خواجہ شرف الدین نے ازراہِ انکساری جوتی بھیج کر یہ کہلایا تھا کہ میں آپ کے پیر کی جوتی ہوں لیکن میں نے جواباً اپنی دستار روانہ کردی جس کا مطلب یہ تھا کہ آپ ازراہِ انکساری جو کچھ فرمارہے ہیں، اس سے میں شرمندہ ہوں۔ آپ میرے پاؤں کی جوتی نہیں، سر کا تاج ہیں۔"
آپ کی شادی ہوچکی تھی۔ آپ کا بچہ چار سال کا ہوچکا تھا۔ آپ نہایت خشوع وخضوع سے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کا لڑکا مصلے کے چاروں طرف چکر لگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد آپ نے سلام جو پھیرا تو دیکھا کہ ایک طرف ایک عزیز شمس الدین بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے شمس الدین سے پوچھا۔ "تم کب آئے؟"

شمس الدین نے جواب دیا۔ "حضرت! میں تو بہت دیر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ کیوں، کوئی خاص بات ہوگئی؟"
آپ نے فرمایا۔ "نہیں، کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔" پھر اپنے چار سالہ بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ بولے۔ "تم نے اس لڑکے کی حرکات دیکھیں، یا یہ بھی نہیں دیکھ سکے؟"
شمس الدین نے جواب دیا۔ "ہاں، اس کی حرکات تو میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ کبھی مصلّے کے پاس جاتا ہے اور کبھی کسی جانور کو پکڑ کر مصلّے کے پاس لے آتا ہے۔ بس یہی حرکت میں دیکھ رہا ہوں اتنی دیر سے۔"
آپ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "افسوس کہ یہ لڑکا زیادہ دن نہیں جیے گا۔"
شمس الدین نے دریافت کیا۔ "یہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہوئی؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ ابھی جب میں نماز پڑھ رہا تھا تو میں نے عین نماز میں اس بچے کی طرف جو رجوع کیا تو بڑی مایوسی میں مبتلا دیکھا۔ اس کے آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس کے انتقال کی خبر دی جا رہی ہے۔ ابھی تک میں اس خبر پر یقین نہیں کر سکا لیکن اب حالتِ بیدار میں صاف صاف اس لڑکے کی تکفین و تدفین دیکھ کر اس کی موت کی خبر دے رہا ہوں۔"
اس دن آپ بہت خاموش رہے۔ شام تک افسردگی طاری رہی۔ شام سے ذرا پہلے بچہ بخار میں مبتلا ہوگیا اور بخار اتنا تیز چڑھا کہ لڑکے کی حالت ہذیان آمیز ہوگئی۔ وہ معلوم نہیں کیا کچھ بکنے لگا۔ رات سے پہلے پہلے لڑکے کا اچانک انتقال ہوگیا۔ آپ کو اس کی موت کا افسوس تو بہت ہوا لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا دخل؟
آپ اپنی خانقاہ میں بیٹھے مریدوں اور ارادت مندوں سے باتیں کر رہے تھے کہ گھاس کی کوٹھری میں آگ لگ گئی۔ یہ کوٹھری یہاں کئی دن سے رکھی ہوئی تھی۔ آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ آپ نے زمین سے مٹی اٹھائی اور کہا...... یا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی میری مدد فرمائیں اور مشکل آسان کر دیں۔
اتنا کہہ کر مٹی کو آگ کے شعلے پر پھینکا۔ آگ فوراً ہی بجھ گئی۔ آپ نے غوث الاعظم سے عالمِ رویا میں مدد جو مانگی تو فوراً ہی قبول ہوئی اور آگ بجھ گئی۔
آپ کے پاس بادشاہ کا وزیر خان جہاں مرزا ملاقات کے لیے آیا۔ آپ اس سے بڑے تپاک سے ملے اور اس کی ضرورت سے زیادہ عزت کرتے رہے۔
کسی نے کہا۔ "حضورِ والا! ہم سب درویش ہیں اور بادشاہوں سے ہمارا کیا واسطہ؟"
آپ نے جواب دیا۔ "بابا! تم لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہو، حالانکہ خدا نے جہاں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہیں اپنے امیر کی اطاعت پر بھی زور دیا ہے۔ اب اگر میں بادشاہ یا اس کے وزیر کو دھتکار دوں گا تو یہ لوگ کہاں اور کس کے پاس جائیں گے؟ اگر یہ لوگ ہماری طرف سے مایوس ہو کر اپنے گھر واپس جائیں تو پھر ان کی کون مدد کرے گا؟ میں انہیں بھی مایوس نہیں کر سکتا۔"
وزیر یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے فرطِ خوشی میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ "یہ بری بات ہے۔"
اس کے بعد وزیر نے اپنی ایک خواہش بیان کی۔ آپ نے آنکھیں بند کیں اور معلوم نہیں کیا کچھ دیکھتے رہے۔ پھر اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں اور وزیر سے کہا۔ "ایک بات سچ سچ تو بتا؟"
وزیر نے کہا۔ "پوچھیے، میں ضرور بتاؤں گا۔"
آپ نے پوچھا۔ "تیرے قیدیوں میں کوئی لڑکا بھی ہے؟"
وزیر نے ذہن پر زور دیا اور کہا۔ "ہاں حضرت! ایک لڑکا اس وقت بھی میری قید میں ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "وہ بے گناہ ہے۔ تو نے اسے کیوں قید کر رکھا ہے؟"
وزیر نے عرض کیا۔ "حضرت! میں نے تو اس کو خطاکار سمجھ کر ہی قید کیا تھا لیکن اگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے تو میں اس کو فوراً ہی رہا کر دوں گا۔"

آپ نے ذرا اور سختی سے کہا۔ "ہاں اور یہ سمجھ لے کہ اگر تُو نے اسے نہ چھوڑا تو تیرے دوسرے کام بھی بگڑ جائیں گے۔ وہ لڑکا بے گناہ ہے۔"

وزیر نے واپس جا کر لڑکے کو رہا کر دیا۔

اوچ کے قصبات میں سے ایک میں ملا وجیہہ الدین نامی ایک شخص رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے کسی کام سے اپنے عزیز مولانا نصیر الدین ابوالمعالی کے پاس گیا۔ کھانا کھا کے ملا وجیہہ الدین قیلولے کی غرض سے وہیں لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے نیند آ گئی اور خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا ہے جہاں لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے اور اس مجمع سے ایک شخص مخاطب ہے۔ اس شخص نے کیا کچھ کہا، ساری باتیں تو یاد نہیں رہیں۔ ہاں ایک بات یاد رہ گئی۔ یہ بزرگ کہہ رہے تھے۔ "لوگو! جو شخص کارِ دنیا کو کارِ دین پر مقدم رکھتا ہے، اس کے دونوں کام خاک میں مل جاتے ہیں۔ اس لیے کارِ دین کو کارِ دنیا پر مقدم رکھو۔"

ملا وجیہہ الدین جس غرض سے اپنے عزیز کے پاس گیا تھا، وہ کارِ دنیا تھا جس کو دین پر ترجیح دی جا رہی تھی۔ ملا نے جاگنے کے بعد اپنے عزیز مولانا نصیر الدین ابوالمعالی سے پوچھا۔ "حضرت! قرب و جوار میں کوئی بزرگ وعظ فرماتے ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا۔ "ہاں، کیوں؟ ان سے کوئی کام؟"

ملا نے پوچھا۔ "ان کا نام کیا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا۔ "سید جلال الدین حسین بخاری۔ یہ اوچ میں وعظ فرماتے رہتے ہیں۔"

ملا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "حضرت! میں نے ان بزرگ کا نام ہی آج سنا ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مولانا نے جواب دیا۔ "ان سے ملنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ آپ اوچ شریف چلے جائیں۔ وہاں آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔"

ملا وجیہہ الدین پر اس جملے کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ اپنے کام ہی کو بھلا دیا اور احرام باندھ کر اوچ روانہ ہو گئے۔ اوچ کے کسی شخص نے انہیں جلال الدین کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آپ کی صورت دیکھتے ہی ملا نے پہچان لیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں جو خواب میں وعظ کرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ملا کی فرطِ جذبات سے حالت ہی غیر ہو گئی۔ بے اختیار آپ کے قدموں میں گر گئے۔

جلال الدین نے انہیں اٹھایا اور فرمایا۔ "دنیا کا کام عقبیٰ پر مقدم نہیں رکھنا چاہیے۔"

ملا وجیہہ الدین کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جب طبیعت قابو میں آ گئی تو آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور آپ ہی کے پاس رہنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

آپ کے پاس دور دور سے لوگ آنے لگے تھے۔ مسجد میں درویشوں کا ہجوم رہتا جو ہر وقت آپ کو گھیرے رہتے۔ وہ رمضان کے دن تھے۔ آپ مسجد میں معتکف ہو چکے تھے۔ آپ کے قریب ہی درویش موجود رہتے۔ والیِ اوچ سومرو کو بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ وہ مسجد پہنچا لیکن وہاں درویشوں کا ہجوم دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے ایک درویش سے کہا۔ "یہ تم لوگوں نے یہاں ہجوم کیوں لگا رکھا ہے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "ہم لوگ سید کی بارگاہ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تجھ کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟"

والیِ اوچ سومرو کو اپنے حاکم ہونے کا شدید احساس تھا، غصے میں حکم دیا۔ "بکواس بند کر اور میں جو حکم دوں اس کی تعمیل کر۔ ورنہ تو یہ جانتا ہی ہوگا کہ حاکم کی حکم عدولی کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔"

درویش نے بھی تنک مزاجی سے جواب دیا۔ "تو حاکم ہے تو ہوا کرے، یہاں کسی کی حکومت نہیں چلتی۔ یہ سید جلال الدین کا دربار ہے اور یہاں انہی کی حکومت ہے۔"

سومرو نے سختی سے کہا۔ "میں سید صاحب سے ملنے آیا ہوں، درویشوں سے کہہ باہر چلے جائیں۔ جب میں مل کر واپس چلا جاؤں گا وہ مسجد میں دوبارہ واپس آ سکتے ہیں۔"

درویش نے ٹکا سا جواب دیا۔ "تیرے حکم سے ایک درویش بھی باہر نہیں جائے گا۔ تجھے ملنا ہے تو ان درویشوں کے

درمیان سے گزر کر جا اور پیر و مرشد کی زیارت کر لے۔"

سومرو کے ساتھ اس کے سپاہی بھی آئے تھے جو اس کے پیچھے ہی موجود تھے۔ سومرو نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور درویش سے کہا۔ "کیا تو ان سپاہیوں کو نہیں دیکھ رہا؟ اگر میں انہیں حکم دے دوں تو یہ تیرے درویشوں کو مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔"

درویش نے جواب دیا۔ "میرے پاس تمہاری بے کار باتوں کا کوئی جواب نہیں۔"

یہ کہہ کر درویش سومرو کے پاس سے چلا گیا۔ سومرو نے اس کے جاتے ہی اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ مسجد میں اعلان کر دے کہ والیِ اوچ سومرو سید جلال الدین بخاری سے ملنے آیا ہے۔ اس لیے مسجد میں موجود جملہ درویش فوراً باہر چلے جائیں اور اس وقت تک باہر کھڑے رہیں جب تک کہ والیِ اوچ ان کی زیارت سے فارغ نہ ہو جائے۔

والی کے اعلان کرنے والے نے یہ اعلان بہ آوازِ بلند کر دیا۔ درویشوں نے جو یہ اعلان سنا تو حیرت زدہ اپنی جگہ پر جس حالت میں تھے، اسی حالت میں رہ گئے۔ سومرو کچھ دیر تک اپنے حکم کی تعمیل کا انتظار کرتا رہا لیکن درویش ٹس سے مس نہ ہوئے۔

آخر سومرو نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ "تم لوگ درویشوں کی ڈھٹائی دیکھ رہے ہو؟ انہیں چند لمحے اور دو۔ اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ مسجد میں موجود رہیں تو انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے۔"

اعلان کرنے والوں نے اعلان کیا۔ "درویشو! والیِ اوچ کی طرف سے چند لمحوں کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اگر تم لوگ اس کے بعد بھی مسجد سے نہ نکلے تو تمہیں جبراً نکال باہر کیا جائے گا۔"

اندر حجرے میں سید جلال الدین بخاری بھی اعلان سن رہے تھے۔ آپ خاموش رہے حالانکہ آپ تفصیل جاننے کے لیے بہت بے چین تھے۔ باہر درویشوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی.... وہ سومرو کے سپاہیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن مرشد کی اجازت کے بغیر یہ نہیں کر سکتے تھے۔

سومرو نے جب یہ دیکھا کہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود درویشوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "سپاہیو! تم کھڑے کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ آگے بڑھو، مسجد میں داخل ہو کر ایک ایک درویش کو نکال کر باہر پھینک دو۔"

تندرست اور زور آور سپاہیوں نے مسجد میں داخل ہو کر درویشوں کو اٹھا اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ شور و غل اور چیخ پکار سے قیامت کا منظر پیدا ہو گیا۔ اندر حجرے میں آپ بے حد بے چین اور مضطرب تھے اور بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ جب درویشوں کو مسجد سے نکال دیا گیا تو سومرو فاتحانہ شان سے اندر داخل ہوا اور آپ کے حجرے میں جا کر آپ کے روبرو جا بیٹھا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنا چاہیں۔ آپ بڑے غصے میں تھے، پوچھا۔ "سومرو! یہ تو نے کیا کیا؟"

سومرو نے جواب دیا۔ "حضرت! اس دنیا میں دو نظام رائج ہیں، ایک روحانی، دوسرا مادی۔ روحانی دنیا کی حکومت آپ کے ذمے ہے اور مادی دنیا میں، میں حاکم ہوں۔ ایک حاکم دوسرے حاکم سے ملنے آیا تو حشرات الارض خوامخواہ اس کا راستہ روکنے لگے۔ میں نے جو کچھ کیا، بدرجہ مجبوری کیا۔ آپ خود ہی بتائیں کہ اگر میں یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

مخدوم جہانیاں نے کہا۔ "تو کیا کہہ رہا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کون حاکم...... کہاں کا حاکم...... کس کا حاکم؟ سومرو! میرا خیال ہے تو دیوانہ ہو چکا ہے اور ساری باتیں پاگل پن میں کر رہا ہے۔"

سومرو نے سکوت اختیار کیا، آنکھیں بند کیں، زور کی جھرجھری لی اور بے ساختہ حجرے سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی چیخا۔ "سپاہیو! تم سب کہاں مر گئے؟ ادھر آؤ، دیکھو میں تمہارا حاکم ہوں۔ اوچ ہی کا حاکم نہیں، دہلی کا بادشاہ، پورے ملک کا بادشاہ۔ دہلی کا بادشاہ باغی ہے جو باغی بن کر میرے تخت و تاج پر قبضہ کر بیٹھا ہے۔ میں اپنی فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ کروں گا اور اس غاصب اور باغی کو قتل کر کے دوبارہ قبضہ کر لوں گا۔"

سومرو کے سپاہیوں نے یہ حیرت انگیز مگر دیوانگی کی باتیں سنیں تو پریشان ہو گئے۔ سومرو نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "سپاہیو! دہلی کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کرو۔ اب میں مزید برداشت نہیں کروں گا۔"

سپاہیوں نے آپس میں کہا۔ ''یہ اس کو کیا ہوگیا؟''
دوسرے سپاہی نے جواب دیا۔ ''شاید دماغ خراب ہوگیا۔''
ایک اور سپاہی بولا۔ ''حضرات! اس سے دور رہو کیونکہ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ ہم پر حملہ بھی کرسکتا ہے۔''
چوتھے سپاہی نے جواب دیا۔ ''دیوانگی میں ہم پر حملہ کرے گا تو مار بھی کھائے گا۔ کم از کم میں تو اس کو معاف نہیں کروں گا۔''
پانچویں نے کہا۔ ''یہ ہمارا حاکم ہے۔ ہم اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔''
چوتھے سپاہی نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارا حاکم اس وقت تک تھا جب تک اس کا دماغ نہیں خراب ہوا تھا۔ اب تو یہ اوچ کا والی بھی نہیں رہا کیونکہ کوئی پاگل والی کے منصب پر کس طرح فائز رہ سکتا ہے؟''
سومرو نے پھر حکم دیا۔ ''سپاہیو! تمہیں دہلی کی طرف کوچ کرنا ہے۔ یہ تم کن فضول مباحث میں پڑ گئے۔ دہلی چلنے کی تیاری کرو۔ اگر دہلی کا تاج و تخت واپس مل گیا تو میں تمہیں نواز دوں گا۔''
سپاہیوں کو بالکل یقین ہوگیا کہ سومرو پاگل ہو چکا ہے۔ یہ پاگل کیوں ہوا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سپاہی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے اور سومرو دیوانہ وار اِدھر اُدھر کے چکر لگانے لگا۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈال کر چیخنے چلّانے لگا کہ میں دہلی کا بادشاہ ہوں، میں ہندوستان کا سچا حکمران ہوں۔ دہلی کا موجودہ بادشاہ غدار اور غاصب ہے۔ میں اس کے خلاف لشکر کشی کروں گا اور اس کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لوں گا۔
سومرو کے بزرگوں نے جب یہ باتیں سنیں تو بہت گھبرائے اور آپس میں صلاح مشورے کرنے لگے۔ وہ سب اس پر متفق تھے کہ اگر یہ باتیں دہلی کے بادشاہ کے کانوں تک پہنچیں تو وہ بغاوت کے جرم میں اس خاندان پر عتاب نازل کرسکتا ہے۔ چنانچہ یہ تجویز طے پائی کہ پہلے سومرو کو گھر واپس لایا جائے۔ اس کے بعد کوئی اور قدم اٹھایا جائے۔
یہ لوگ باتفاقِ رائے سومرو کو بلانے گئے۔ اس وقت وہ بازار میں ننگ دھڑنگ شور کرتا پھر رہا تھا۔ سومرو کے بزرگوں نے اسے آواز دی۔ ''سومرو! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟''
سومرو نے انہیں غور سے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''سومرو! ہمیں پہچان، ہم تیرے بزرگ ہیں۔ تو اپنے گھر چل۔''
سومرو زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا۔ ''خوب، تو تم سب میرے بزرگ ہو اور مجھے لینے آئے ہو؟'' پھر ایک دم چپ ہوگیا۔ ذرا دیر بعد ایک دم سنجیدہ ہوگیا اور پھر انہیں ڈانٹنے لگا، بولا۔ ''بھاگ جاؤ۔ میں تم سب کو خوب پہچانتا ہوں۔ تم لوگوں کو دہلی کے بادشاہ نے میرے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تم سب دھوکے سے مجھے اس کی قید میں پہنچا دو۔ لیکن میں تمہارے داؤ میں نہیں آؤں گا۔ ہرگز ہرگز نہیں آؤں گا۔'' اس کے بعد اس نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی۔ ''ارے سپاہیو! تم سب کہاں مر گئے؟ تمہارے بادشاہ کو لوگ گرفتار کرنے آئے ہیں اور تم سب منہ چھپائے پھر رہے ہو۔ آؤ، بھاگ کر آؤ اور میرے دشمنوں کا مقابلہ کرو۔''
لیکن سپاہی کہاں تھے جو آتے۔ بزرگوں نے ایک بار پھر آپس میں مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ سومرو کو زبردستی گھر لے جانا چاہیے۔ ورنہ یہ پورے خاندان کی تباہی کا باعث بن جائے گا۔
ایک طاقتور بزرگ نے سومرو کو اپنی گرفت میں لینا چاہا تو سومرو نے اسے دھکا دے کر گرا دیا جس سے اس شخص کا سر پھٹ گیا اور خون جاری ہوگیا۔ سومرو نے اس کو دبا لیا اور اس کی مکوں اور لاتوں سے مرمت کرنے لگا۔ دوسرے بزرگوں نے سومرو کو دبا لیا اور بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے بس کردیا۔ وہ بے بس ہونے کے باوجود چیخے جا رہا تھا۔ ''ذلیلو! مجھے چھوڑ دو۔ تم نے مجھ سے میری حکومت چھین لی اور اب مجھے قید میں ڈال دینا چاہتے ہو۔ میں تم سب کا خون پی لوں گا۔''
وہ لوگ سومرو کو باندھ کر گھر لے گئے۔ سومرو کی ماں بیٹے کو بندھا ہوا دیکھ کر بے چین ہوگئی۔ اس نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''میرے بیٹے کا یہ حال کس نے کیا؟ اسے کس کی نظر لگ گئی؟''

اس دوران ایک سپاہی بھی سومرو کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے اعلان کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میرے مالک کا دماغ کیوں خراب ہوگیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا علاج کیا اور کہاں ہے۔''

غمزدہ ماں نے فوراً ہی حکم دیا۔ ''اس سپاہی کو اسی وقت میرے روبرو حاضر کیا جائے۔''

لوگوں نے سپاہی کو سومرو کی ماں کے پاس پہنچا دیا۔ ماں نے واقعے کی تفصیل پوچھی تو سپاہی نے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، یہ جو کچھ ہوا بابا جہانیاں جہاں گشت کی بددعا کا نتیجہ ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اسی وقت ان کی خدمت میں جاؤں گی اور ان سے اپنا بیٹا واپس مانگوں گی۔''

سپاہی خاموش ہوگیا۔ ماں نے اسی وقت جانے کی تیاری شروع کی اور مخدوم جہانیاں کی خدمت میں پہنچ گئی۔ حجرے کے باہر قیس رکھ دی گئی اور آپ کو حجرے میں مطلع کر دیا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''یہ عورت مجھ سے کیا لینے آئی ہے؟''

جب اس سے یہ پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''پیرومرشد سے میں خود بات کروں گی۔''

آپ نے اس کو براہِ راست مخاطب کیا۔ ''مائی! تُو کیا چاہتی ہے؟''

سومرو کی ماں نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مائی! تیرا بیٹا تو اوچ کا حاکم تھا۔ اس کے بقول میں روحانی حاکم ہوں اور وہ مادی حاکم تھا۔ اس نے میری مرضی کے خلاف طاقت کا مظاہرہ کیا اور میرے درویشوں کو اپنے سپاہیوں کے ذریعے اس مسجد سے زبردستی نکلوا دیا۔ میرے پاس نہ تو سپاہی ہیں اور نہ ہی فوج۔ میں نے تو اس سے یہ کہا تھا کہ سومرو! میرا خیال ہے تو دیوانہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس نے واقعی دیوانہ بن کے دکھا دیا۔''

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! اب میں کیا کروں؟ آپ کے نزدیک تو یہ ذرا سی بات تھی لیکن میرے بیٹے کی تو زندگی ہی برباد ہوگئی۔ میں تباہ ہوگئی۔ میں اب کیا کروں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مائی جا اور صبر سے کام لے...... میں کیا کرسکتا ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''آپ میرے بیٹے کو پچھلی حالت میں لاسکتے ہیں۔ اس کو صحیح الدماغ کرسکتے ہیں۔''

آپ نے کہا۔ ''مائی! صبر کر، میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔''

ماں پردے سے باہر آگئی اور آپ کے قدموں میں گرگئی، روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! آپ اچھی طرح سن لیجیے۔ میں آپ کے قدموں میں اس وقت تک پڑی رہوں گی جب تک کہ آپ میرے بیٹے کو واپس نہیں کردیں گے۔''

جب آپ نے ماں کو اس قدر بضد اور بے چین دیکھا تو فرمایا۔ ''اچھا، اسے میرے پاس لے آ۔ پھر میں بتاؤں گا، اس کا علاج کس طرح کیا جائے کہ وہ صحیح الدماغ ہوجائے۔''

ماں فوراً واپس گئی اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے بیٹے کو لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئی۔

جب سومرو کو آپ کے روبرو پیش کیا گیا تو وہ آپ کو دیکھتے ہی زاروقطار رونے لگا، بولا۔ ''اے بادشاہ! میں بادشاہی کے دعوے سے باز آیا۔ تو خدا کے لیے مجھے معاف کر کے رہائی دے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے نادان! بادشاہی صرف خدا کو زیب دیتی ہے۔ اب تو نادم ہے تو تیرا علاج بھی ہوجائے گا اور قید جنوں سے رہائی بھی مل جائے گی۔''

اس کے بعد آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور اس پر دم کر کے فرمایا۔ ''جاؤ، اسے غسل دے کر نئے کپڑے پہناؤ۔ اس کے بعد اسے جمال خجندی کے مزار پر لے جاؤ، اللہ نے چاہا تو وہاں شفائے کامل حاصل ہوجائے گی۔''

سومرو کی ماں نے کہا۔ ''حضرت! اس کو غسل دلوانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔ یہ تو زور آزمائی شروع کردے گا اور ڈر ہے کہ کہیں فرار نہ ہوجائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس پر دم کردیا ہے جس سے اس کی سرکشی دور ہو چکی ہے۔ اب

یہ زور آزمائی نہیں کرے گا۔‘‘
ماں نے سومرو کو گھر واپس لے جا کر نہلوایا اور نیا لباس پہنایا۔ سومرو نے کوئی ہنگامہ نہ کیا۔ اس کے بعد اس کو شیخ جمال خجندی کے مزار پر لے جایا گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی سومرو اپنی اصل حالت میں آ گیا۔ اپنے آس پاس لوگوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ’’آپ بھی یہیں موجود ہیں...... یہ تماشا کیا ہے؟ یہ معاملہ کیا ہے؟‘‘
ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’بیٹے سومرو! اس وقت میں جتنی خوش ہوں تُو اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ گھر واپس چل۔ وہیں چل کر سب کچھ بتا دوں گی۔‘‘
سومرو نے بڑی پریشانی اور حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھا اور مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’ماں! یہ کس کا مزار ہے؟‘‘
ماں نے جواب دیا۔ ’’شیخ جمال خجندی کا۔‘‘
سومرو نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ ماں اس کو ساتھ لے کر واپس آ گئی اور وہاں بیٹے کو سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ ’’تُو نے یہ دوسری زندگی پائی ہے اور اس زندگی پر مخدوم جہانیاں جہاں کا جتنا بھی شکریہ ادا کرو کم ہے۔ میں تو ان کی خدمت میں ایک بار پھر جاؤں گی اور ان کا شکریہ ادا کروں گی۔‘‘
سومرو نے کہا۔ ’’ماں! آپ کے ساتھ میں خود بھی چلوں گا اور اپنی زیادتی کی معافی چاہوں گا۔‘‘
ماں بیٹے کو ساتھ لے کر جہانیاں کی خدمت میں پہنچ گئی اور سومرو کو آگے بڑھا کر عرض کیا۔ ’’حضرت! آپ کا غلام حاضر ہے۔ اس کو معاف کر دیجیے۔‘‘
آپ نے مسکرا کر سومرو کو دیکھا۔ ’’آ، اوچ کے حاکم خوش آمدید!‘‘
سومرو آپ کے قدموں میں گر گیا اور کہا۔ ’’حضرت! اوچ کا حاکم نہیں آپ کا خادم۔ میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔‘‘
سومرو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آپ نے جواب دیا۔ ’’سومرو! میں تو تجھے کب کا معاف کر چکا۔ اگر میں نے معاف نہ کیا ہوتا تو، تو اس وقت میرے پاس معافی مانگنے نہ آتا۔‘‘
ماں نے کہا۔ ’’بس مخدوم جہانیاں جی، مجھے یقین آ گیا ہے کہ آپ نے معاف کر دیا ہے۔‘‘
آپ نے سومرو سے کہا۔ ’’سومرو! اب کسی کی دل آزاری نہ کرنا اور حکومت میں کسی کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا۔‘‘
سومرو نے جواب دیا۔ ’’حضرت! میں تو، توبہ کر چکا۔ مجھے اس دربار سے جو سبق ملا ہے اس کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اب میں پہلے والا سومرو نہیں رہا، میں دوسرا سومرو ہوں جو آپ کی نوازش سے دھل دھلا کر پاک ہو گیا۔‘‘
دونوں ماں بیٹے آپ سے رخصت ہو کر گھر واپس آ گئے اور اب وہ اتنے نرم دل اور دوسروں کے کام آنے والے بن چکے تھے کہ دوسروں کو ان کی سادگی اور بھلائی کا یقین نہیں آتا تھا۔
☆☆☆
آپ کو شیخ الاسلام کا منصب عطا ہوا اور سلطنتِ دہلی میں آپ کا اعزاز و احترام اتنا بڑھا کہ بادشاہ آپ کی قدم بوسی کو باعثِ عزت سمجھنے لگا۔ اس دوران آپ نے ایک بار پھر سفرِ حج کی تیاری شروع کر دی۔ یہ آپ کا چھٹا اور آخری حج تھا۔ دوسرے درویشوں کے ساتھ ملا شمس الدین بھی ہم رکاب تھے۔ آپ ان سب کے ساتھ بحری جہاز میں بیٹھے اور جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ راستے میں جہاز ہی پر درویشوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ اگر مچھلی میسر آ جاتی تو کتنا اچھا ہوتا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جہاز میں مچھلی کہاں مل سکتی ہے۔
آپ جہاز کے ایک گوشے میں بیٹھے اللہ اللہ میں مشغول تھے۔ دفعتاً آپ نے درویشوں سے پوچھا۔ ’’کیا تم نے قرآن پاک کے اس وعدے کو یاد رکھا **’’لاتقنطوا من رحمۃ اللّٰہ‘‘** (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا)‘‘
درویشوں نے یک آواز جواب دیا۔ ’’ہم اللہ کے اس وعدے کو کس طرح بھلا سکتے ہیں؟‘‘
آپ نے فرمایا۔ ’’دیکھو غلط بیانی سے کام نہ لو جبکہ اصل بات یہ ہے کہ تم سب خدا کی رحمت سے ناامید ہو چکے ہو اور

اس کے بے حد و بے حساب کرم کا خیال ذہنوں سے نکل چکا ہے۔''

ایک درویش نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''شاید آپ بجا فرما رہے ہیں۔''

آپ نے بڑے جوش اور جذبے سے فرمایا۔ ''کیا مچھلی اس جہاز پر میسر نہیں آسکتی؟''

اب لوگوں کو احساس ہوا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بیک آواز جواب دیا۔ ''ہم اس کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کو بھلا کر جا بھی کہاں سکتے ہیں اور یہ درست ہے کہ اس وقت ہم سب مچھلی کھانے کی خواہش میں بھی حیران و پریشان ہو رہے تھے اور مایوسی سے یہ سوچ رہے تھے کہ جہاز پر مچھلی کہاں مل سکتی تھی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جہاز پر مچھلی کیوں نہیں مل سکتی؟''

کسی درویش نے جواب دیا۔ ''مچھلی بازاروں میں مل سکتی ہے، دکانوں پر مل سکتی ہے، ساحل پر مل سکتی ہے لیکن بیچ سمندر اور بیچ جہاز میں کہاں اور کیسے ملے گی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی عبودیت میں جو دعویٰ چاہو کرو، لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ تم اللہ کی رحمت اور مہربانی سے مایوس نہیں ہوئے ہو۔''

درویشوں نے دبی آواز میں کہا۔ ''آپ نے درست فرمایا۔ ہم سب کے دلوں کی جو کیفیت تھی اس سے آپ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم سب اللہ کی رحمت اور نوازش سے کسی حد تک مایوس ضرور ہیں۔''

ایک درویش نے عرض کیا۔ ''اور اس مایوسی کا بنیادی سبب بھی تو ہے، بھلا اس سمندر میں مچھلی کہاں سے ملے گی؟ شکار محال، دکان مفقود، خشکی غائب پھر مچھلی آئے گی کہاں سے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لیکن خدا کی قدرت لامحدود اور بے حد و بے حساب ہے۔ اس کے اکرام و انعام کے لیے اسباب کی موجودگی ضروری نہیں۔ وہ اپنے انعام و اکرام کے اسباب پیدا کر سکتا ہے۔''

یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ سمندر کی موجیں اونچی اونچی اٹھنے لگیں۔ یہ موجیں ایک طرف سے اٹھتیں اور جہاز کی دوسری طرف نکل جاتیں۔ درویشوں کا مارے ڈر کے برا حال ہو گیا۔ انہوں نے آپ سے درخواست کی۔ ''حضرت! خدا سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں ان موجوں سے محفوظ و مامون رکھے۔ ورنہ اگر دیر تک یہ صورت قائم رہی تو جہاز کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔''

آپ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہو گا۔ جہاز تباہ نہیں ہو گا بلکہ اس میں بھی کوئی خدا کی مصلحت ہے۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔''

اچانک لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے جہاز پر مچھلیوں کو تڑپتے پھڑکتے دیکھا۔ وہ مچھلیوں پر جھپٹے اور انہیں پکڑنے لگے۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ مچھلیاں کہاں سے آگئیں۔ آپؒ نے فرمایا۔ ''کیا میں نے تمہیں سمجھایا نہیں تھا کہ اللہ جب کرم اور مہربانی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسباب کی موجودگی ضروری نہیں ہوتی بلکہ وہ اسباب خود پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے پیدا کر دیے۔ دوسری بات یہ کہ تم سب موجوں کی یورش سے خوفزدہ اور پریشان تھے جبکہ یہی موجیں تمہارے حق میں مفید ثابت ہوئیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جسے تم مصیبت سمجھ رہے تھے، اس میں تمہاری بھلائی موجود تھی۔''

درویشوں نے فرطِ جذبات میں نعرہ لگایا۔ ''بے شک، بے شک...... پیر و مرشد نے بجا فرمایا۔''

ان مچھلیوں کو درویشوں نے پکایا اور مزے لے لے کر کھایا۔ آپ نے مریدوں سے کہا۔ ''درویشو! خدا کا شکر ادا کرو جس نے تمہاری خواہش پوری کر دی، جو تمہارے قیاس اور عقل میں نہیں آئی تھی۔''

درویشوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

جہاز نے انہیں جدہ میں اتار دیا۔ یہاں سب حضرت حوا کی قبر کی زیارت کی غرض سے چل پڑے۔ آپ نے جملہ درویشوں کے ساتھ قبر کی زیارت کی۔ اس وقت کچھ لوگ ایک جنازہ لائے اور اسے حضرت حوا کی قبر کے پاس دفن کرنا چاہا۔ آپ نے معلوم نہیں کیا محسوس کیا کہ جنازہ لانے والوں کے پاس پہنچ گئے اور ان سے پوچھا۔ ''جناب! یہ کس کا جنازہ ہے؟''

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''بابا! یہ ایک بہت بڑے آدمی کا تابوت ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''میں اس کا تعارف چاہتا ہوں کیونکہ شاید میں آپ لوگوں کی کوئی مدد کر سکوں۔''
جنازے میں شریک دوسروں نے بھی آپ کی باتیں سن لیں۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا۔ ''حضرت! آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میرا نام سید جلال الدین حسین بخاری ہے اور مجھے دو بزرگوں نے عالم ارواح سے مخدوم جہانیاں کا لقب دیا ہے۔ لیکن میں نے چونکہ سیر و سیاحت بہت کی ہے، اس لیے خلائق میں جہانیاں جہاں گشت کہلاتا ہوں۔''
اس شخص نے کہا۔ ''تو آپ مجھ سے مرحوم کا تعارف سنیے۔ یہ تابوت شیخ بدرالدین یمنی کا ہے۔ مرحوم تیس برس سے حرمین الشریفین میں مجاور رہے ہیں۔ کل مکہ معظمہ سے جدہ تشریف لائے تھے اور قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔''
آپ نے سب کچھ سن کر سکوت اختیار کیا پھر آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے۔ لوگ آپ کی حرکات و کیفیات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول دیں اور سر اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ ''لوگو! انہیں دفن نہ کرنا کیونکہ ان کا انتقال نہیں ہوا۔ یہ زندہ ہیں اور مرضِ سکتہ میں مبتلا ہیں۔''
لوگوں کو آپ کی باتوں پر حیرت ہوئی، کسی نے پوچھا۔ ''مگر ہمیں کس طرح یقین آئے کہ شیخ مرے نہیں، سکتے میں مبتلا ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ شیخ کا تابوت مسجد تک لے چلیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کا یقین بھی دلا دوں گا اور آپ لوگ یقین بھی اسی وقت کریں گے جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ شیخ سکتے میں مبتلا ہیں۔''
آپ کی خواہش پر شیخ کا تابوت مسجد لے جایا گیا۔ آپ نے تابوت کو مسجد کے حجرے میں رکھوا کر سب کو حجرے سے باہر نکال دیا اور خود حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد آپ نے تابوت کھولا اور شیخ کو تابوت سے باہر نکالا۔ حجرے میں ایک بوریا بچھا ہوا تھا۔ آپ نے شیخ کے جسم مدہوش کو اس بوریے پر لٹا دیا۔ اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی اور پھر تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔ ''حیی الذی لا یموت'' (تو زندہ ہے مردہ نہیں)
اسی وقت شیخ بدرالدین یمنی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور کچھ دیر بعد وہ اٹھ بیٹھے۔ اپنے سامنے حجرے میں آپ کو دیکھ کر پوچھا۔ ''حضرت! آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟''
آپ نے مختصر اپنا تعارف کرا دیا اور کہا۔ ''بدرالدین! آج اگر میں یہاں نہ آ گیا ہوتا تو تجھے زندہ دفن کر دیا جاتا۔ میرا آنا تو تیرے حق میں آبِ حیات ثابت ہوا جو تجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ تو آج جیتے جی قبر کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہوتا اور سکتے سے ہوش آنے پر تیرا دم گھٹ جاتا۔''
بدرالدین یمنی نے عقیدت سے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور شکریہ ادا کیا۔ باہر لوگ خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے باتوں کی جو آوازیں سنیں تو زور زور سے چلّانا شروع کر دیا، پوچھا۔ ''کیا شیخ کو ہوش آ گیا؟''
آپ نے حجرے کا دروازہ کھلوا دیا۔ دروازے کے کھلتے ہی لوگوں نے آپ کو گھیر لیا۔ بدرالدین یمنی حیران و پریشان ایک ایک کی صورت دیکھ رہے تھے۔ مخدوم جہانیاں نے انہیں جامۂ خاص مرحمت فرمایا اور خواہش کی کہ شیخ بدرالدین امامت فرمائیں۔ وہ خود اپنے درویشوں کے ساتھ ان کی اقتدا میں نماز ادا فرمائیں گے۔
یہ عصر کا وقت تھا، مسجد کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھل گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ شیخ بدرالدین یمنی امامت فرمائیں گے۔ ان کی امامت میں جو بھی نماز پڑھنا چاہے، پڑھ لے۔
جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ جس شیخ کو انہوں نے مرحوم سمجھ لیا تھا، وہ زندہ ہے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی اور مسجد میں داخل ہو کر عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت دونوں طرف کے آدمی نمازِ عصر ایک ساتھ ادا کر رہے تھے۔ حضرت جہانیاں جہاں بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور شیخ کی امامت میں نمازِ عصر پڑھی ... یہاں سے فارغ ہو کر آپ بدرالدین یمنی کے ساتھ ہی کعبۃ اللہ میں تشریف لے گئے اور سعادت طواف سے مشرف ہو کر شیخ ہی کے ہمراہ مدینہ منورہ

روانہ ہوئے۔

مدینے میں آپ نے حضور ﷺ کے روضۂ مبارک پر جا کر سلام عرض کیا...... "السلام علیکم یا جداہ۔"
اسی وقت آپ کو اندر سے جواب ملا۔ "وعلیکم السلام یا ولدی۔"

☆☆☆

اب تو آپ کا یہ حال تھا کہ جس کسی کے گلے ملتے، گلے سے لگتے ہی آپ اس کی ساری ریاضت کھینچ لیتے اور وہ کھوکھلا ہو جاتا۔ ایک دن آپ نے ایک بزرگ کو جوشِ جذبات میں اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ شخص مخدوم جہانیاں کے سینے سے الگ ہوتے ہی اپنے آپ کو خالی خالی محسوس کرنے لگا۔ اس کا سینہ سوز سے خالی ہو چکا تھا۔

اس نے بہت پریشان ہو کر شرمندگی سے کہا۔ "حضرت! یہ کیا بات ہے کہ میں اب کچھ بھی نہیں رہا۔ آپ کے سینے سے لگتے ہی میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ یہ کیا بات ہے؟"

آپ نے تبسم فرمایا۔ بولے۔ "ہاں بابا! تو سچ کہتا ہے۔ اب تو اپنا یہ حال ہو گیا ہے کہ میرے سینے میں مقناطیسیت آ گئی ہے۔ میں جس سے بھی گلے ملوں گا، اس کا کمال چھین لوں گا۔ اس لیے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ مجھ سے گلے نہ ملیں۔"

بزرگ نے عاجزی سے درخواست کی۔ "حضرت! میرا سوز واپس فرما دیجیے۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔"

آپ نے دوبارہ گلے لگ کر اس سے جو کچھ بھی لیا تھا، واپس کر دیا۔

آپ کو غیر شرعی رسوم سے نفرت تھی۔ یہاں تک کہ غیر شرعی تعظیم تک ناپسند تھی۔ ایک مرید نے آپ کی تعریف میں ایک نظم لکھی اور اس میں آپ کو سید السادات لکھ دیا۔ آپ نے اس کو منع فرمایا۔ "بابا! میں سید السادات نہیں گدائے عالم ہوں یہی تم بھی لکھ لو۔"

سلطان فیروز شاہ تغلق کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جب بھی جاتے، بادشاہ استقبال کے لیے دوڑا ہوا آپ کے پاس جاتا۔ خود بادشاہ بھی آپ کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے جایا کرتا تھا۔

آپ کو کسی عزیز نے خط لکھا۔ آپ نے اپنے کسی مرید کو حکم دیا کہ اس کا جواب فوراً روانہ کیا جائے۔ مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! جواب میں اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تجھے کوئی شخص سلام کرے تو، تو اس کا جواب فوراً دے گا یا تاخیر سے...... یا جب جی میں آئے گا؟"

مرید نے کہا۔ "سلام کا جواب تو میں فوراً دوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "بس پھر اسی طرح خط کا جواب بھی فوراً ہی دے دے کیونکہ سلام اور جوابِ سلام اور خط اور جوابِ خط میں کوئی فرق نہیں۔"

مرید نے اسی وقت خط کا جواب لکھ دیا۔ اس طرح اگر آپ کے پاس کوئی ہدیہ لاتا تو آپ ہدیہ کے عوض کچھ نہ کچھ مرحمت ضرور فرماتے۔ آپ اپنے مریدوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی تمہارے لیے ہدیہ لائے تو تمہیں بھی اس کا بدلہ دینا چاہیے اور اگر تمہارے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہ ہو تو لانے والے کے حق میں دعائے خیر ہی کر دو۔

آپ اٹھتر سال تک زندہ رہے اور آپ کی ذات سے لوگوں کو بے انتہا فیض پہنچا۔ آخر 10 ذی الحجہ 785 ہجری بروز عیدِ قرباں 3 فروری 1384ء بروز بدھ وصال فرمایا۔ آپ کا مزار آج بھی اوچ (بہاول پور) میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ دروازے پر درج ذیل تاریخِ وفات ثبت ہے۔

تاریک گشت جملہ جہاں بے جمال شاہ
تاریخ بود ہفت صد ہشتاد و پنج سال



الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین، ابی محمد عبد اللہ
سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار

ان کا آبائی وطن سمرقند تھا۔ دادا حجت اللہ نے ہجرت کی اور ہندوستان چلے آئے پھر یہاں سے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں سفر آخرت اختیار کیا۔ جب وہ ہندوستان میں تھے تو ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا اس کا نام ابوالعلیٰ رکھا گیا۔ ابوالعلیٰ نے اپنا بیٹا خواجہ فیضی کے سپرد کر دیا کیونکہ خواجہ فیضی ابوالعلیٰ کے والد کے رشتے دار اور راجا مان سنگھ کے مصاحب تھے۔ ابوالعلیٰ خواجہ فیضی کی سرپرستی میں پرورش پاتے رہے اور ہندوستان کے نامی گرامی صوفیا میں ان کا شمار ہوا۔

ابوالعلیٰ نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ حج کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزار پر حاضری دی۔ مسجد نبویؐ کے چپے چپے کو اس اعتقاد سے بوسے دیتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس کے کسی عضو نے اس سے لمس کا فیض حاصل کیا ہوگا۔ انہوں نے یہاں بے شمار نمازیں پڑھیں اور اپنے اور اپنی اولاد

چوتھے قیوم

ضیا تسنیم بلگرامی

تاریخ گواہ ہے کچھ خوش نصیب انسانوں کا انتظار دنیا میں ان کی ولادت سے قبل ہی ہونے لگتا ہے کیونکہ جن کے آنے کی بشارت اللہ تعالیٰ خوابوں میں بار بار دے رہا ہو... اور جس کی تائید بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کردی ہو پھر اس سے بڑھ کر دنیا کا خوش نصیب ترین انسان اور کون ہوسکتا ہے۔ آپ کا شمار بھی انہی مقدر والوں میں ہوتا تھا۔



کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔

مدینے میں رہتے ہوئے انہیں کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ ہندوستان کے زائرین نے انہیں اپنے ملک واپس چلنے کی ترغیب دی لیکن ابوالعلیٰ کے قدم رکے ہوئے تھے، اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ کسی ہم وطن زائر نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کب تک یہاں قیام کریں گے؟ واپسی کا ارادہ ہے یا نہیں؟''

ابوالعلیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گنبد خضرا کی طرف محویت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اے شخص! تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح تم خالی ہاتھ واپس جا رہے ہو اسی طرح میں بھی واپس جاؤں۔ سمندر کے ساحل سے یوں ہی واپس چلا جاؤں؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔''

ہم وطن ساتھی نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے کیا طلب کیا ہے؟''

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''فتنہ...... میں نے صالح فتنہ مانگا ہے۔''

وہ شخص بھونچکا رہ گیا۔ حیرت سے بولا۔ ''فتنہ...... یعنی کیا مطلب؟ صالح فتنہ؟''

ابوالعلیٰ نے سادگی سے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے فتنہ مانگا ہے۔ صالح فتنہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولاد کو فتنہ ہی ارشاد فرمایا تھا۔ میں نے بھی رسول اللہؐ سے دعا مانگی ہے۔ میں صالح اولاد کا طالب ہوں جب تک میری یہ دعا قبولِ بارگاہ نہ ہو جائے، میں یہیں پڑا رہوں گا۔''

ابوالعلیٰ مدینے میں غیر معینہ مدت کے لیے رکے رہے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ طلب صادق ہو تو خدا انسان کو مایوس نہیں کرتا۔ جب رات نصف سے گزر جاتی تو ابوالعلیٰ سجدے میں گر جاتے اور رو رو کر دعائے دلی عرض کرتے رہتے۔

وہ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ عشا کی نماز کے بعد بھی ابوالعلیٰ مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے پشت لگا کر درودِ ابراہیمی کا ورد کرنے لگے۔ انہیں اس درود سے ایک عجیب سی فرحت اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔ درود پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ جس حال میں تھے اسے آنکھ لگنا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ ان کی ادھ کھلی آنکھیں مسجد کے محراب اور ستون دیکھ رہی تھیں مگر حواس پر قدرت ختم ہو گئی تھی۔ اس عالم میں انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ ''ابوالعلیٰ! ہندوستان واپس جا، تیری دعا قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بیٹا عطا کرے گا جو تیرا نام روشن کرے گا اور میرا نائب ہوگا۔''

ابوالعلیٰ بیدار ہوئے تو فضا کو معطر محسوس کیا۔ بھینی بھینی خوشبو سے پورا ماحول معطر تھا۔ ابوالعلیٰ نے اس جگہ نماز پڑھی اور رختِ سفر باندھا۔ ان کے ارادت منداس دن کا انتظار کر رہے تھے۔

ہندوستان پہنچنے کے بعد ابوالعلیٰ اپنے ہونے والے بیٹے کی بابت عجیب و غریب خواب دیکھا کرتے۔ انہیں بیداری میں یہ آواز سنائی دیتی کہ ''ابوالعلیٰ! مبارک ہو کہ تو ایک ایسے بیٹے کا باپ ہوگا جس کے کمالاتِ روحانی کا ایک زمانہ اعتراف کرے گا۔''

چنانچہ 5 ذیقعد 1092ھ بروز پیر ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ آپ نے اس کا نام خواجہ محمد زبیر رکھا۔ ماں نے اپنے بستر کو بچے کے بول و براز سے محفوظ رکھنے کے لیے تدبیریں اختیار کیں لیکن انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بچے کو خود احساس ہے کہ خود ناپاک ہو اور نہ بستر ناپاک کرے۔ اس کے پیشاب، پاخانے کا ایک وقت تھا۔ ان اوقات میں اگر ماں کو خیال نہ رہتا تو بچے کو ضبط و احتیاط سے کام لینا پڑتا۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ عزیز و اقارب کے ہجوم میں ماں کو ان کے کپڑے بدلنے پڑتے۔ ماں نے ابھی کرتہ ہی اتارا ہوتا کہ معصوم بچہ ماں کے آنچل میں چھپ جاتا اور یہ اس وقت تک چھپا رہتا جب تک دوسرا کرتہ نہ پہنا دیا جاتا اور پھر یہ بات ہر ایک پر منکشف ہو گئی۔ ننھا زبیر شرم برہنگی سے ماں کی آغوش میں یا آنچل میں دبک جاتا ہے۔

ابھی زبیر کی عمر دو سال تھی کہ انہیں کسی گوشے میں منہمک اور محو بیٹھا ہوا پایا جانے لگا۔ والدین کی بڑی سے بڑی کوشش یہ ہوتی کہ ان کا بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے موجود رہے لیکن یہ بات تقریباً ناممکن ہو گئی۔ کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ ننھا زبیر گوشۂ تنہائی میں کسی سے ہم کلام رہتا ہے۔ ابوالعلیٰ چونکہ خود بھی بڑے خدا رسیدہ تھے اس لیے وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان عجیب و غریب حالات اور واقعات کے پیچھے مشیت ایزدی کیا ہے؟ وہ جانتے تھے کہ زبیر کی ولادت سے پہلے جو بشارتیں ملی ہیں یہ سب ان کے مطابق اور موافق ہیں۔ ابوالعلیٰ کے مکان کے سامنے ایک ویران مکان تھا۔ اس کے مکین معلوم نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ ابوالعلیٰ اپنے حجرے سے نکلتے اور اس عبرت کدے کو دیکھتے تو بے ساختہ فرماتے۔ ''اللہ بس باقی ہوس۔''

ایک دن علی الصباح گھر والوں کی آنکھ کھلی تو یہ جان کر پریشان ہو گئے کہ ننھے زبیر میاں اپنے بستر پر نہیں ہیں۔ ماں نے باپ کے حجرے میں جھانک کر دیکھا تو اپنے تہجد گزار خدا رسیدہ شوہر کو سربسجود دیکھا پورا حجرہ ننھے زبیر کے وجود سے خالی تھا۔ بے اختیار پوچھا۔ "کیا آپ میری آواز سن رہے ہیں؟"

ابوالعلیٰ نے بیوی کی آواز سنی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

بیوی نے کچھ دیر تو جواب کا انتظار کیا مگر پھر بے اختیار حجرے میں داخل ہو گئیں اور بے قراری سے کہا۔ "میں آپ کو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا واسطہ دیتی ہوں کہ میری بات توجہ سے سنیے اور اس کا جواب دیجیے۔ ننھا زبیر اپنے بستر سے غائب ہے۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ غم اور فکر سے میرا کلیجا پھٹا جا رہا ہے۔"

کچھ دیر بعد ابوالعلیٰ نے مڑ کر بیوی کو دیکھا اور پوچھا۔ "زبیر گھر ہی میں کہیں ہوگا۔ کیا تم نے اس کو پورے گھر میں اچھی طرح دیکھ لیا؟"

بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا ہے میں آپ کو کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ زبیر گھر میں نہیں ہے۔"

ابوالعلیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "گھر کے علاوہ وہ کہاں جا سکتا ہے یقیناً تم مغالطے میں ہو۔ وہ گھر کے اندر ہی کہیں موجود ہوگا چلو میں تلاش کرتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

یہ کہہ کر ابوالعلیٰ اٹھے اور بیوی کے ساتھ مکان میں چلے گئے۔ انہوں نے بھی گھر کا چپا چپا چھان مارا مگر زبیر کا کوئی پتا نہیں چلا۔ بیوی کی بے قراری میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا لیکن ابوالعلیٰ کے چہرے پر وہی طمانیت تھی جو حجرے میں پائی جاتی تھی۔ انہوں نے بیوی کو تسلی دی۔ "بی بی! تم مت گھبراؤ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا رب زبیر کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا امن و سلامتی سے ہوگا اور اچھی حالت میں ہوگا۔"

بیوی نے بے چینی سے کہا۔ "آپ کی باتوں پر میں کس طرح یقین کر لوں؟"

ابوالعلیٰ نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب ذرا صبر سے کام لو میں زبیر کی تلاش میں باہر جاتا ہوں۔"

بیوی کی بے چینی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ ابوالعلیٰ جیسے ہی باہر نکلے، انہوں نے ایک بہت بڑے اژدہے کو سامنے کے ویران مکان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ابوالعلیٰ نے اتنا بڑا اژدہا اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بیوی نے بھی دروازے کی اوٹ سے اس اژدہے کو دیکھ لیا اور چیخ کر شوہر سے کہا۔ "اجی اژدہے سے ہوشیار۔"

ابوالعلیٰ نے کوئی جواب تو نہیں دیا بس اژدہے کے پیچھے ہو لیے۔ بیوی کو غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو ننھے زبیر کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے کہ خوفناک اژدہے کے پیچھے ہو لیے۔

اژدہا ویران مکان میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ابوالعلیٰ بھی داخل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا ان کے سامنے ایک بڑا سا دالان تھا۔ دالان کی چھت کا کچھ حصہ تو گر گیا تھا اور کچھ لٹکا ہوا تھا۔ اژدہا اس دالان میں داخل ہو گیا۔ ابوالعلیٰ بھی اس کے پیچھے کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اژدہا دالان سے گزر کر بغیر چھت کی کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ اس کی دم اب بھی دالان ہی میں تھی۔ ابوالعلیٰ نہایت ہوشیاری سے دالان کی دیوار پر چڑھ گئے اور اس کے اوپر سے بے چھت کوٹھری کے اندر کا جائزہ لینے لگے۔ انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہاں ننھا زبیر بھی موجود تھا۔ وہ دیوار کے کونے پر نظریں جمائے معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا اور اژدہا زبیر کے پاؤں پر اس طرح لوٹ رہا تھا جس طرح کوئی وفادار کتا اپنے مالک کے قدموں پر لوٹتا اور پاؤں چومتا ہے۔ اس وقت ابوالعلیٰ کا عجیب سا حال تھا۔ ایک کیف ایک نشہ سا پورے وجود میں گردش کر رہا تھا۔ انہیں اژدہے سے خوف نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت انہیں یہ اشتیاق تھا کہ دیکھیے کہ اور کیا کرتا ہے۔

اژدہا کچھ دیر تو زبیر کے قدموں میں منہ ڈالے پڑا رہا پھر اس میں حرکت ہوئی اور اس نے اپنے منہ کو زمین کی سطح سے بلند کر کے دونوں ہاتھوں پر زبان پھیری۔ گویا وہ انہیں بوسے دے رہا تھا۔ زبیر نے اژدہے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اژدہا ایک بار پھر زبیر کے قدموں میں گر گیا۔ ابوالعلیٰ کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ سامنے کے مکان سے بیوی اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر تھیں۔ انہیں جھنجلاہٹ تھی کہ آخر یہ ابوالعلیٰ کو ہو کیا گیا ہے کہ ویران مکان میں گھس گئے۔ وہ زبیر کو کیوں نہیں تلاش کر رہے ہیں۔

ابوالعلیٰ کو اپنے پیچھے یوں لگا گویا کوئی کھڑا ہے۔ وہ بے چینی سے مڑ کر دیکھنے لگے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ زبیر

اور اژدہے کی طرف رجوع ہو گئے اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ اب وہاں زبیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اژدہا معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ تیزی سے اترے اور مکان کے باہر پہنچ کر اژدہے کو تلاش کرنے لگے۔ دور اپنے دروازے سے بیوی نے بڑے کرب سے پوچھا۔ "یہ آسیبی مکان میں گھسے کیا کر رہے ہیں آپ؟ زبیر کو کیوں نہیں تلاش کرتے؟"

ابوالعلیٰ نے پوچھا۔ "تم نے بڑے اژدہے کو باہر نکلتے تو نہیں دیکھا؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "میں نے اژدہے کو اندر جاتے تو دیکھا تھا باہر نکلتے نہیں دیکھا۔"

ابوالعلیٰ نے کہا۔ "پھر وہ کہاں چلا گیا، اندر بھی نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ویران مکان میں دوبارہ داخل ہو گئے۔ بیوی کے غصے اور بے چینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ آزردہ تھیں کہ آخر ان کے شوہر کو ہو کیا گیا ہے کہ زبیر کے بجائے اژدہے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں لیکن جب ذرا دیر بعد ابوالعلیٰ زبیر کو گود میں لیے ہوئے اندر سے برآمد ہوئے تو ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خالی آسیب زدہ مکان، اس میں ایک بہت بڑے خوف ناک اژدہے کا داخل ہونا اور وہاں زبیر کی پہلے سے موجودگی، ان کا دل خوف اور اندیشے سے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبیر کو دیکھ رہی تھیں اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ کہیں زبیر کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔

ابوالعلیٰ زبیر کو لے کر جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، ماں نے جھپٹ کر گود میں لے لیا اور چہرے کو بار بار دیکھ کر بھینچنے اور پیار کرنے لگیں۔ زبیر معصومیت سے ماں کی صورت دیکھ رہا تھا۔

ابوالعلیٰ پاس ہی کھڑے اس انتظار میں تھے کہ بیوی ان سے کوئی سوال کرے تو وہ اس کا جواب دیں۔ آخر بیوی نے پوچھا۔ "یہ زبیر ان کھنڈر میں کس طرح پہنچ گیا؟"

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ "اس کا صحیح جواب تو خود زبیر دے گا یا خدا کے پاس ہوگا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔"

بیوی نے پوچھا۔ "یہ اندر کیا کر رہا تھا؟"

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ "یہ اندر بغیر چھت کی کوٹھری کے ایک کونے میں کھڑا معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔"

بیوی نے بے تابی سے پوچھا۔ "وہ بڑا اژدہا بھی تو اندر گیا تھا؟"

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ "ہاں گیا تو تھا...... پھر؟"

"وہ اندر کیا کر رہا تھا۔ میرے زبیر کے پاس تو نہیں گیا تھا؟"

"وہ زبیر کے پاس گیا تھا۔ اس نے اندر جاتے ہی زبیر کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے زبیر کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ سی محسوس ہوئی، میں نے اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں دوبارہ زبیر کی طرف گھوم گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب وہاں اژدہے کا نام و نشان تک نہ تھا۔"

بیوی نے ایک بار پھر اپنے ننھے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر بلا کی طمانیت چھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اپنے بیٹے کو گلے لگا لیا۔

ابوالعلیٰ نے کہا۔ "کیا میں نے تمہیں یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ خدا جو کچھ کرے گا بہتر ہی کرے گا کیونکہ زبیر کی بابت جو بشارتیں مل چکی ہیں ان کے مطابق خدا جو کچھ کرے گا بہتر ہی کرے گا۔"

ماں کا خوشی سے عجیب سا حال ہو رہا تھا۔ وہ انہیں بار بار بھینچ کر بوسے دینے لگیں۔

☆☆☆

زبیر کی عمر چار سال چار ماہ کی ہوئی تو ابوالعلیٰ نے انہیں ایک معلم کے سپرد کر دیا۔ آپ کی تیز طبع نے استاد کو حیران کر دیا۔ ایسا لگتا گویا انہیں سب کچھ ازبر ہے۔ ایک دن استاد انہیں قرآن کی اس آیت کریمہ کا مطلب سمجھا رہا تھا۔ جس میں اللہ کو زمینوں اور آسمانوں کا نور کہا گیا ہے تو زبیر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی محنت شاقہ میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسا بوجھ جو اٹھائے نہیں اٹھ رہا مگر زبیر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں پھر پورے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی، وہ کانپنے لگے۔

استاد نے پوچھا۔ "زبیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

زبیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کپکپاہٹ پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اب ان کے چہرے پر پسینے کے قطرات اس طرح نمودار ہونے لگے جس طرح برف کے برتن کے اوپر، آس پاس پانی کے بے شمار قطرات جمع ہو جاتے ہیں۔ استاد نے ایک بار پھر بے چینی سے پوچھا۔ "زبیر! کچھ تو بتاؤ یہ تمہارا کیا حال ہے؟"

زبیر نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو کر گر گئے۔
استاد گھبرایا ہوا ابوالعلیٰ کے پاس پہنچا اور انہیں جلدی جلدی سارا حال سنا کر بولا۔ ''حضرت! زبیر کو معلوم نہیں کیا ہو گیا؟''
ابوالعلیٰ نے آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر کے لیے سکوت اختیار فرمایا پھر آنکھیں کھول کر ارشاد فرمایا۔ ''جاؤ، زبیر کے پاس واپس جاؤ، اب اسے ہوش آ گیا ہو گا۔''
استاد نے اصرار کیا۔ ''لیکن حضرت! یہ سب کیا تھا، کچھ مجھے بھی تو بتایئے؟''
ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! ان باتوں کا تعلق علوم باطنی سے ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''
استاد نے کچھ دیر خاموشی سے ابوالعلیٰ کی صورت دیکھی اور مزید کچھ کہے بغیر زبیر کے پاس واپس چلے گئے۔ وہاں زبیر ہوش میں آچکے تھے۔ استاد کی شکل دیکھتے ہی بولے۔ ''استاد محترم! میں بہت تھک گیا ہوں۔ کیا آپ آرام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟''
لیکن استاد کو تو کچھ اور ہی جستجو تھی، کہا۔ ''لیکن صاحبزادے! یہ تو بتایئے آپ کو یہ ہو کیا گیا تھا ابھی؟''
زبیر نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! مجھ پر علوم اور اسرار کا ایک بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔ میں اس میں کچلا جا رہا تھا۔ آخر اس کے دباؤ نے مجھے گرا دیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔''
استاد کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا۔ انہوں نے مزید استفسار نہیں کیا اور خاموشی اختیار کی۔
اس کے بعد یہ کیفیت تب ان پر طاری ہونے لگی جب بھی قرآن پاک کی ایسی کوئی آیت سامنے آتی جس میں معانی اور مطالب کا ایک سمندر پنہاں ہوتا۔ زبیر کا برا حال ہو جاتا اور وہ بے ہوش ہو جاتے لیکن جب بھی ہوش میں آتے زبیر محسوس کرتے کہ ان میں علم و دانش اور روحانی مطالب کا ایک سمندر سما گیا ہے۔
زبیر جب ذرا بڑے ہوئے تو ابوالعلیٰ نے ایک بار پھر حج کا ارادہ کیا اور بیٹے سے کہا کہ ''تمہیں بھی اس سعید سفر میں میرے ساتھ چلنا ہے۔''
زبیر تو گویا اس کے منتظر ہی تھے۔ سفر حج میں باپ کے ساتھ ہو گئے۔ مکہ کا سفر بڑا پر لطف رہا جبکہ دوسروں پر کسلمندی اور تکان نے غلبہ کر لیا تھا۔ طواف کعبہ کے دوران زبیر پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ اس عالم میں انہوں نے کعبے کو اپنے آس پاس طواف کرتے دیکھا۔
مکے کے بعد ابوالعلیٰ زبیر کو لے کر مدینۂ منورہ روانہ ہو گئے۔ دیار نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہنچنے کے شوق میں دونوں ہی کا عجیب حال ہو رہا تھا۔ زبیر نے کئی بار باپ سے کہا۔ ''بابا جان! میرا جی چاہتا ہے کہ مکے اور مدینے کے درمیان راستوں کے چپے چپے اور ذرے ذرے کو بوسے دیتا چلوں کیونکہ یہ راہیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں سے مس ہونے کی وجہ سے روشن اور منور نظر آ رہی ہیں۔''
ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! یہ وارداتِ عشق اور کیفیات محبت ہیں۔ یہاں سب کچھ روا ہے۔''
زبیر بے اختیار زمین پر گر کر بوسے دینے لگے۔ انہیں ذرے ذرے سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ کافی عرصہ بعد جب زبیر اپنے باپ کے ساتھ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو ان کا حال تھکے ہارے عاشق جیسا تھا جو دشت و بیاباں کی خاک چھان کر آبلہ پا محبوب کے در تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ گنبد کو دور ہی سے دیکھ کر زبیر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹے مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے اور یہاں ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ دونوں کے پاؤں راہ کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔ کسی نے انہیں ٹوک دیا اور کہا۔ ''صاحبان! آپ دونوں کو اپنے اپنے پاؤں صاف کر کے مسجد میں آنا تھا، جایئے اب دھو آیئے۔''
ابوالعلیٰ کوئی جواب دینے ہی والے تھے مگر زبیر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور اس شخص کو خود جواب دیا۔ ''اے شخص! اس گرد و غبار کی قدر و قیمت تو کیا جانے۔ افسوس کہ تو نے تو صرف ٹخنوں کے اوپر جمی ہوئی گرد و غبار کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تیری ظاہری آنکھیں ہمارے تلوؤں کے وہ آبلے نہیں دیکھ سکیں جو دیار حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے میں مانع آ رہے تھے اور ہم ان کی پروا کیے بغیر یہاں تک آ گئے۔ یہ چیزیں متاع عاشقاں ہیں لیکن تو ان باتوں کو کیا جانے۔''
وہ شخص کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس نوجوان نے کیا کہا اور ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کچھ دیر تو زبیر کی صورت دیکھی اس کے بعد کہا۔ ''خیر، اب دھو ڈالو اپنے پاؤں۔''
ان دونوں نے اس شخص کی پروا کیے بغیر نماز شکرانہ ادا کرنا شروع کر دی۔

ابوالعلی زیرلب رو رو کر عرض کر رہے تھے۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ نے جس بیٹے کی خوش خبری دی تھی۔ اس وقت وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہے۔"

اور زبیر رو رو کر کہہ رہے تھے۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے اپنے والد محترم سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے یہیں کسی ستون کے پاس میرے بارے میں بشارت دی تھی۔ اب آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے صالح بننے کی توفیق عطا فرمایئے۔ میں عاجز و ناتواں انسان آخر کس طرح پہاڑ جیسی زندگی کو گناہ اور معصیت سے محفوظ رکھوں گا کیونکہ

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

زبیر گڑگڑاتے رہے اور الحاح وزاری کرتے رہے پھر انہیں یکا یک اپنے وجود میں کوئی شے سرایت کرتی محسوس ہوئی جیسے چیز سیال کی طرح رگوں میں دوڑنے لگی اور زبیر کو طمانیت اور سکون نے اپنے حصار میں لے لیا۔ اسی عالم میں انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے جسم کو ایک شاندار گراں بہا خلعت پہنادی گئی ہے اس خلعت پر سنہری حرفوں میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ خواجہ زبیر نے انہیں یہ غور دیکھا، پڑھا تو پتا چلا کہ پوری خلعت پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی ہے۔ اس وقت ان کے آس پاس نہ تو مسجد تھی اور نہ مسجد کی کوئی اور شے۔ وہ معلوم نہیں کس جگہ کھڑے تھے۔ یہ حالت زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ جب آہستہ آہستہ ہوش میں آئے تو خود کو مسجد نبویؐ کے صحن میں کھڑے دیکھا۔ ان کے پاس ہی ابوالعلی کھڑے تھے اور اپنے بیٹے کی حالت پر غور کر رہے تھے۔ انہوں نے یکبارگی اپنے بیٹے کے داہنے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، پوچھا۔ "بیٹے! زبیر! اس وقت تو کہاں ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "باواجان! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں کہاں تھا اور اب کہاں ہوں؟"

ابوالعلی نے پوچھا۔ "بیٹے! کیا تو نے اپنے جسم پر پڑی ہوئی شاندار اور گراں بہا خلعت فاخرہ نہیں دیکھی؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "دیکھی کیوں نہیں باواجان۔"

ابوالعلی نے پھر کہا۔ "اور کیا تو نے اس خلعت فاخرہ پر سنہرے حرفوں میں کڑھے ہوئے بسم اللہ کو نہیں دیکھا؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے بسم اللہ بھی دیکھی۔"

ابوالعلی نے زبیر کو اپنے سینے سے لگا کر فرمایا۔ "بیٹے زبیر! یہ سب کیا ہے؟ اس کا کوئی خاص مطلب؟"

زبیر نے عاجزی سے جواب دیا۔ "باواجان! میں آپ کے عرفان اور وجدان کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ آپ ہی اس کی وضاحت فرمائیں گے تو میں کچھ جان سکوں گا۔"

ابوالعلی نے کہا۔ "بیٹے! یہ خلعت منصب قیومیت ہے جو تمہیں حاصل ہوگا۔"

زبیر نے اپنے والد سے ازراہِ انکسار عرض کیا۔ "باواجان! یہ حقیقت ہے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خیال ہی نہیں آتا۔"

دیارِ عرب سے واپس آئے تو خواجہ زبیر کی عمر اکیس سال ہو چکی تھی۔ ابوالعلی نے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو اپنے بیٹے کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ خواجہ زبیر ان پر خصوصی توجہ فرماتے اور آنے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جاتا کہ خواجہ زبیر کی ذات میں کمالات روحانی دوسروں سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔

انہی دنوں کابل سے ایک قافلہ آیا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے مختلف بزرگوں کی خدمت میں حاضریاں دیں اور ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کسی کی تلاش ہے چنانچہ یہ لوگ ابوالعلی کی خدمت میں بھی پہنچے۔ ابوالعلی نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور کشف سے ان کا مدعائے دلی معلوم کیا، فرمایا۔ "کیا تم لوگ ایک ایسے نوجوان کی تلاش میں نہیں نکلے ہو جو بزرگی اور فضیلت میں اپنے بزرگوں پر سبقت لے گیا اور جس کا ہر عمل سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مثالی نمونہ ہے اور یہ کہ اس نوجوان کی خواب میں بشارتیں مل چکی ہیں اور اسے دیکھ کر تم پہچان بھی سکتے ہو؟"

قافلے والے حیران رہ گئے، بولے۔ "ہاں، ہمیں ایک ایسے نوجوان بزرگ کی شکل خوابوں میں دکھائی ضرور گئی ہے لیکن ابھی تک وہ ہمیں ملے نہیں ہیں۔"

ابوالعلی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا، تم سب ہمارے ساتھ آؤ۔"

قافلے والے ان کے ساتھ ہو لیے۔ ذرا دیر بعد جب یہ سب لوگ خواجہ زبیر کے پاس پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی سکتے میں رہ گئے۔ کئی آدمی وارفتگی میں آگے بڑھے اور خواجہ زبیر کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، وہ آپ ہی ہیں جن کی

تلاش ہے۔ اپنے ہاتھ ہمارے ہاتھوں میں دیجیے تاکہ ہم آپ سے بیعت ہو جائیں۔''

ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اپنے ہاتھ خواجہ زبیر کے ہاتھوں میں دے دیے اور بیعت ہو گئے۔ یہ لوگ کئی دن آپ کی خدمت میں پڑے رہے اور مواعظ حسنہ سے اپنا ایمان تازہ کرتے رہے۔ آخر ان کے سربراہ آدمیوں نے خواجہ سے درخواست کی کہ کابل تشریف لے چلیں۔ وہاں دوسرے بہت سے لوگ ان کے منتظر ہیں۔

خواجہ زبیر نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''میں اپنے باواجان کی اجازت کے بغیر کابل نہیں جا سکتا۔ آپ ان سے اجازت لیں۔ اگر ہاں ہو گئی تو میں کابل ضرور چلوں گا۔''

ان لوگوں نے ابوالعلٰی سے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کی بڑی نوازش ہوگی اگر آپ انہیں کابل جانے کی اجازت فرما دیں گے۔''

ابوالعلٰی نے ارشاد فرمایا۔ ''میں منع تو نہیں کروں گا مگر میں ابھی تک خواجہ زبیر سے دور نہیں رہا۔''

قافلے والوں نے کہا۔ ''حضرت! دونوں صاحب کشف ہیں پھر یہ دوری کا ذکر کیا۔ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے اور روحانی احوال معلوم کر لیں گے۔''

ابوالعلٰی نے اجازت دے دی، کہا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے۔''

خواجہ زبیر کو رخت سفر ہی کیا باندھنا تھا۔ جس حال میں تھے اسی میں کابل روانہ ہو گئے۔ کابل میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور وہاں ان کے مشتاقانِ دید نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ نے انہیں اپنے دل نشین اور آخرت سنوار مواعظ سے شادکام کیا۔ کابل کے لوگوں نے آپ کی اتنی عزت کی اور کچھ اس طرح خدمت میں حاضری دی کہ شاہانِ وقت دیکھتے تو حسد کرتے۔ خواجہ زبیر نے وہاں کئی سال گزار دیے۔

خواجہ زبیر نے ایک اعلان کر دیا کہ ''میں ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔''

مریدوں نے انہیں روکنا چاہا اور عاجزی سے درخواست کی۔ ''حضرت! پورا ہندوستان انتشار اور ابتری کا شکار ہے آپ ان حالات میں کہاں جائیں گے۔ یہیں تشریف رکھیں جب حالات معمول پر آ جائیں، چلے جائیے گا۔''

خواجہ زبیر نے جواب دیا۔ ''کمزور میری مدد کا طالب ہے مجھے ہندوستان جانا ہی پڑے گا۔''

مریدوں کے بے پناہ اصرار کے باوجود آپ کابل سے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب آپ لاہور پہنچے تو معلوم ہوا کہ راوی کے کنارے شہزادہ معظم اور شہزادہ اعظم شاہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں اور بزورِ شمشیر اس بات کا فیصلہ کرنے پر تل گئے ہیں کہ اب اورنگ زیب کا وارث اور جانشین کون ہے۔

آپ ان دونوں لشکروں سے دور غیر آباد حصے میں ٹھہر گئے تھے۔ ارادت مندوں نے مطلع کیا کہ راستہ مخدوش ہے اور راوی کو عبور کر کے اکبر آباد پہنچنا امر محال میں سے ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ''میں خود بھی آگے نہیں جانا چاہتا۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس ملک کا بادشاہ کون ہے، میں یہیں رہوں گا۔''

کسی نے عرض کیا۔ ''اگر یہیں رکنے کا ارادہ ہے تو حضور کو میرے ناقص مشورے پر یہاں سے ہٹ جانا چاہیے کیونکہ یہاں کسی بھی لمحے چھڑ جانے والی جنگ آس پاس تباہی اور بربادی پھیلا سکتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ حضور کو اس سے کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔''

خواجہ زبیر نے جواب دیا۔ ''مجھے کوئی گزند نہیں پہنچے گی کیونکہ میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ خدا اپنے جس بندے کو کامیاب کرنا چاہے گا روحانی استعداد کے لیے میرے پاس بھیج دے گا۔''

مریدنے عرض کیا۔ ''غیب کا حال تو خدا کو معلوم ہے ورنہ بہ ظاہر یہ جگہ بہت مخدوش اور خطرناک ہے۔ اگر آپ یہیں رکنے پر مصر ہیں تو ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہی رہیں گے۔''

خواجہ زبیر نے اپنی جھونپڑی سے گھڑسواروں کو ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ راوی کے کنارے کنارے حدِ نظر تک خیموں کا شہر سجا ہوا تھا۔ گھوڑوں کے ہنہنانے اور آدمیوں کے بھنبھنانے کی آوازیں ہر وقت آتی رہتی تھیں۔

ایک دن رات کے اندھیرے میں گھوڑوں کی ٹاپیں بالکل قریب سنائی دیں۔ مریدوں کو خوف محسوس ہوا بولے۔ ''حضرت! ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے۔ معلوم نہیں گھوڑے ادھر کیوں آ رہے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مت گھبراؤ، خدا جو کرے گا بہتر کرے گا۔''

جھونپڑی میں چراغ جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں مریدوں کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں جھونپڑی کے در پر رک گئیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ''دیکھو باہر جاؤ، چند معزز مہمان اندر آنا چاہتے ہیں انہیں عزت و احترام سے اندر بلا لاؤ۔''

آپ کے جملہ مرید باہر چلے گئے۔ وہاں پانچ گھڑسوار اپنے گھوڑوں سے نیچے کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک مرید نے بہ آواز بلند کہا۔ ''حضرات! ہمیں ہمارے پیر نے آپ کی پیشوائی کے لیے بھیجا ہے۔ آپ لوگ اندر تشریف لے چلیں۔''

کسی شخص نے اندھیرے ہی میں بے ساختہ پوچھا۔ ''کیا واقعی سچ مچ؟''

مرید نے عرض کیا۔ ''میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟''

اس شخص نے کہا۔ ''پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی۔''

اس کے بعد یہ لوگ جھونپڑی میں داخل ہوگئے۔ چراغ کی روشنی میں دیکھنے پر پتا چلا کہ ان میں جو شخص سب سے آگے تھا وہ اپنے لباس اور وضع قطع میں سب سے شاندار نظر آتا تھا۔

خواجہ زبیر اپنی جگہ سے ہلے اور تقریباً اٹھ کر ان کی پذیرائی کی، فرمایا۔ ''معظم شاہ آؤ، میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

معظم شاہ خواجہ زبیر کے قدموں میں بیٹھ گیا، بولا۔ ''حضرت! دنیاوی اسباب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سارے امرا اور منصب دار دوسری طرف ہیں۔ یہ ذوالفقار خان میری طرف ہے جس کی وجہ سے کچھ سپاہ بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شہزادے نے ایک تنومند جیالے جوان کی طرف اشارہ کیا۔

خواجہ زبیر نے کہا۔ ''بہرحال ہم تیری اعانت کو آگئے ہیں۔ مت گھبراؤ۔''

شہزادے نے شک و شبے سے کہا۔ ''حضرت! جیسا کہ میں نے عرض کیا دنیاوی اور مادی اسباب بھائی اعظم شاہ کے ساتھ ہیں۔ میں تو آپ کے پاس یہ مشورہ کرنے آیا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں اپنے بھائی اعظم شاہ سے مفاہمت کرلوں اور اس کے حق میں دستبردار ہوکر کنارہ کشی اختیار کرلوں؟''

خواجہ زبیر نے فرمایا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کے ہاں قلیل اور کثیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ دنیاوی اور مادی اسباب دوسری طرف سہی لیکن بادشاہت تیرے نام کی جاچکی ہے۔ مایوسی کفر ہے جا مقابلہ کر۔ خدا کامیاب کرے گا۔''

معظم شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''تم نے بشارت سن لی، اب کیا کہتے ہو؟''

ذوالفقار خان نے جواب دیا۔ ''میں پہلے بھی مایوس نہیں تھا۔ اگر مایوس ہوتا تو مخالفوں میں ہوتا۔''

شہزادے نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور جاتے جاتے عرض کیا۔ ''حضور! اب میں اسی وقت حاضری دوں گا جب ہندوستان کا تاج و تخت میرے قدموں میں ہوگا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اب تو جا سکتا ہے۔''

جب شہزادہ اپنے رفیقوں کے ساتھ واپس چلا گیا تو کسی مرید نے ازراہِ شکایت عرض کیا۔ ''حضور! یہ آپ نے شہزادے کو کیسی بشارت دے دی۔ اعظم شاہ کے ساتھ اس کے سارے امرا اور منصب دار ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ان حالات میں اعظم شاہ کو شکست دینا ناممکن ہے۔''

آپ نے جوش میں فرمایا۔ ''اس دنیا میں ناممکن کوئی کام نہیں۔'' مریدوں نے خاموشی اختیار کرلی۔

دوسرے دن علی الصباح دونوں شہزادوں نے ایک دوسرے کو شکست دینے کی خاطر تیاریاں مکمل کرلیں۔ معظم شاہ اپنے لشکر کو لے کر اپنے بھائی اعظم شاہ کے لشکر کی طرف بڑھا۔ دونوں لشکری ٹکرائے گویا سیاہ ہاتھیوں نے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا ہو۔ خواجہ زبیر نے اپنے جھونپڑے سے لڑائی کا منظر دیکھا اور تادیر دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر نہ تو مایوسی تھی نہ اداسی۔ گھڑی بھر بعد اعظم شاہ کے لشکر نے شہزادہ معظم کی فوج کو دبانا شروع کر دیا۔ شہزادہ معظم شاہ کی ایک نہ چلنے دی اور پسپائی کی رفتار تیز ہوگئی۔ شہزادہ معظم بالکل مایوس ہوگیا۔ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ذوالفقار خان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا ذوالفقار خان؟ ہمارے سپاہی حوصلہ ہار چکے ہیں، ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔''

ذوالفقار خان نے بے تابی سے کہا۔ ''شہزادے! خدا کے لیے اپنی جگہ پر واپس جائیے اور سپاہیوں کے حوصلے بڑھایئے۔''

شہزادہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا اور خواجہ زبیر کی جھونپڑی کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''حضرت! آپ تو رات کو یہ فرما رہے تھے کہ فتح میری ہوگی لیکن یہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔''

اسی وقت مرید خواجہ زبیر سے کہہ رہے تھے کہ "حضرت! آپ کی بشارت خاک میں مل گئی۔ معظم شاہ ہار گیا، اعظم شاہ جیت گیا۔"
آپ نے ترشی سے جواب دیا۔ "کیا بکتے ہو، خاموش رہو۔ جنگ کا ابھی فیصلہ کہاں ہوا ہے جنگ ابھی جاری ہے۔ اس کے نتیجے کا انتظار کرو۔"
کچھ دیر بعد لوگوں نے دیکھا مشرق سے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ راوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت اعظم شاہ کی فوج کا منہ طوفان کی طرف تھا۔ طوفانی گرد و غبار نے اعظم شاہ کی آنکھوں میں گھس کر تقریباً نابینا کر دیا۔ اب جو معظم شاہ کے آدمیوں کو جوش آیا تو وہ بڑی بے دردی سے چڑھ دوڑے اور اعظم شاہ کی سپاہ کو کھیرے، ککڑی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی میدان میں اعظم شاہ کا بیٹا بھی مارا گیا۔ اس سانحے نے اعظم شاہ کی کمر توڑ دی۔ اعظم شاہ کے سپاہیوں نے شکست ہوتے دیکھی تو شہزادہ معظم کے پاس آگئے اور اس سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔
اب معظم شاہ ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔ اس کا سب سے زیادہ طاقتور بھائی اور حریف میدان جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ معظم شاہ نے اپنے گھوڑے کا رخ خواجہ زبیر کے جھونپڑے کی طرف کر دیا اور یہاں جھونپڑے میں داخل ہو کر خود کو خواجہ زبیر کے قدموں میں گرا دیا۔ شہزادے کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ وہ کہتا کچھ تھا اور منہ سے نکلتا کچھ تھا۔
خواجہ زبیر نے شہزادے کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا۔ "اب یہ رونا کس بات کا۔ جا بادشاہت کر اور عدل و انصاف سے کام لے۔"
شہزادے نے بہ مشکل عرض کیا۔ "حضور! اگر آپ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو آج میں کچھ بھی نہ ہوتا اور شاید میرا بھی وہی انجام ہوتا جو بھائی اعظم کا ہوا۔"
آپ نے فرمایا۔ "اب یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ جا، راوی کے کنارے ہی رسم تاج پوشی ادا کرا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ یہ تساہل یا تغافل کا وقت نہیں ہے۔"
شہزادہ اٹھا اور عرض کیا۔ "لیکن میری ایک درخواست ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیے مجھ کو تنہا رخصت نہ کیجیے۔"
خواجہ زبیر نے فرمایا۔ "نہیں شہزادے! میرا کام ختم ہوا۔ اب میں سرہند چلا جاؤں گا وہاں مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دینا ہے۔ بادشاہی اور درویشی کے راستے جدا جدا ہیں۔"
معظم شاہ راوی کے کنارے واپس گیا اور بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔
آپ سرہند تشریف لے گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ سرہند والوں نے آپ پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہے۔ چند نیک اور ثقہ آدمیوں نے سرہند والوں کی توجہ خواجہ زبیر کی طرف مبذول کروانا چاہی مگر انہوں نے توجہ دلانے والوں اور خواجہ زبیر دونوں ہی کا مذاق اڑایا۔ خواجہ زبیر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بہت مایوس ہوئے اور اپنے حامیوں اور ارادت مندوں کو منع فرما دیا کہ "جو لوگ ہمارے طرفدار یا عقیدت مند نہیں ہیں ان سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"
ایک دن آپ مجدد الف ثانی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے تشریف لے گئے۔ پہلے ہی سے وہاں بڑا ہجوم تھا۔ خواجہ زبیر کو ذرا سی جگہ مل گئی تو آپ فوراً آگے بڑھ گئے۔ حاسدوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور آپس میں طنزاً کہنے لگے۔ "معلوم نہیں کیسے کیسے لوگ یہاں آجاتے ہیں انہیں کہیں اور جانے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔"
آپ نے ان سے پوچھا۔ "کیا میرا آنا آپ کو ناگوار گزر رہا ہے؟"
ایک سرہندی نے جواب دیا۔ "جی ہاں، آپ کا آنا ہمیں واقعی ناگوار گزر رہا ہے۔ کیا ہندوستان میں اس مزار کے علاوہ کوئی مزار نہیں ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "بھائیو! میرے والد ابوالعلیٰ مجدد الف ثانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس رشتے سے میں ان کا عزیز ٹھہرتا ہوں لیکن اگر آپ لوگوں کو میری موجودگی گراں گزرتی ہے تو میں چلا جاؤں گا۔"
مزار کے سجادہ نشین کو اندیشہ تھا کہ اگر خواجہ زبیر سرہند میں رہ گئے تو یہ مقبول خاص و عام ہو جائیں گے اور ان کا مزار سونا اور غیر آباد ہو جائے گا اس لیے ان کا یہاں سے چلے جانا ازبس کہ ضروری ہے۔ جواب میں کہا۔ "ہماری تو یہی خواہش ہے کہ آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔"
خواجہ زبیر نے اپنے مریدوں سے پوچھا۔ "تم لوگوں کا کیا مشورہ ہے؟"
مریدوں نے بیک زبان جواب دیا۔ "کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پیر و مرشد۔ ہمیں یہیں رہنا چاہیے اگر اس حال

میں ہم یہاں سے چلے گئے تو یہ لوگ ہماری عدم موجودگی میں یہی کہیں گے کہ ڈر کر چلے گئے، بزدل تھے۔"
آپ نے فرمایا۔" ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر جھگڑا یا بدمزگی ہو اس لیے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"
ایک مرید نے دبی زبان میں کہا۔" اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو کہیں نہ جاتا۔"
آپ نے جواب دیا۔" کل میں شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا مگر سرہند کے شری اور حاسد لوگوں کی بابت میں ایک خبر چھوڑ جاؤں گا جس سے یہ جلد یا بدیر دوچار ہوں گے اس سے بچ نہیں سکتے۔"
ایک مرید نے پوچھا۔" حضرت! وہ کیا؟"
آپ نے جواب دیا۔" یہ لوگ آپس میں لڑیں جھگڑیں گے جس سے ان کی بربادی لازم ہو جائے گی۔"
مریدوں نے بیک آواز میں کہا۔" اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم فرمائے۔"
آپ نے حسب وعدہ سرہند چھوڑ دیا اور شاہجہاں آباد چلے گئے۔ وہاں ایک بوسیدہ مسجد میں قیام فرمایا۔ مسجد کی مرمت کی۔ آپ کے ارادت مند اور مرید ساتھ تھے انہوں نے مسجد کے آس پاس بود و باش اختیار کی پھر ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی آن بسے اور رفتہ رفتہ مسجد کے آس پاس شاندار آبادی ہوگئی۔
☆☆☆
آپ کے پاس حاضری دینے والوں میں امرا اور رؤسا بھی پیش پیش تھے۔ وہ جب آتے تو معمولی اور غریب مرید اٹھ جاتے اور انہیں بیٹھنے کا موقع دیتے۔ آپ نے اپنے غریب مریدوں کو سختی سے منع کر دیا کہ" ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں امرا اور غربا کا امتیاز کوئی نہیں۔" اس ہدایت کے بعد امیری اور غریبی کا امتیاز ختم ہوگیا۔
مغل دربار کے وہ امیر جن کا جاہ و جلال زبان زد خاص و عام تھا خواجہ زبیر کے دربار میں آتے تو ان کا جاہ و جلال رخصت ہو جاتا اور وہ خواجہ زبیر کے جلال سے سرنگوں ہو جاتے۔ معظم بہادر شاہ خود بھی ان کا ارادت مند تھا۔ اس کے امرا اور دوسرے منصب دار بھی آپ کے دربار کی چاکری کرنے لگے۔
ایک امیر سینہ پھلائے، گردن اکڑائے آپ کے پاس پہنچا اور بیٹھ گیا، بولا۔" حضرت! میں نے آپ کی عظمت اور بزرگی کا بڑا چرچا سنا ہے۔ خود جہاں پناہ آپ کے بے حد معتقد ہیں لیکن میں اپنی افتادِ طبع سے بہت مجبور ہوں۔ اس وقت تک کسی کو تسلیم نہیں کرتا جب تک میں خود نہ آزمالوں۔"
آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور امیر کی بات سنی ان سنی کر دی۔
امیر نے مزید کہا۔" کیا حضرت نے میری بات نہیں سنی؟"
کسی مرید نے امیر کو جواب دیا۔" اے نادان شخص! یہاں اس لب و لہجے میں بات نہیں کی جاتی۔"
امیر نے اسے ڈانٹ دیا۔" تو خاموش رہ۔ میرا مخاطب تو نہیں تیرا مرشد ہے۔"
آپ نے پر جلال چہرہ اوپر اٹھایا اور اسی مرید کو حکم دیا۔" اس مغرور اور متکبر امیر کو رخصت کر دیا جائے۔ یہ درویش کی کٹیا ہے یہاں عجز و انکسار کا سکہ چلتا ہے۔"
امیر نے شکایتاً کہا۔" حضرت! یہ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ میں ایک حیثیت والا انسان ہوں۔ مجھے کسی معمولی مرید سے نکلوا دینا بڑی بے عزتی کی بات ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔" افسوس کہ تو جسے معمولی سمجھ رہا ہے خدا کے نزدیک وہ غیر معمولی ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ تو خود ہی یہاں سے چلا جا۔"
وہ امیر اٹھا اور غصے میں پاؤں پٹکتا چلا گیا۔ آپ نے فرمایا۔" افسوس کہ جس زمین کو یہ غصے میں روندتا کچلتا جا رہا ہے چند دنوں میں اسی کی آغوش میں چلا جائے گا اور زمین اسے کچل کر رکھ دے گی۔" اور ٹھیک چوتھے دن یہ امیر اپنے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگیا۔
☆☆☆
ابوالعلیٰ کا وصال ہوگیا اور ان کے مریدوں اور ارادت مندوں نے شاہجہاں آباد کا رخ کیا۔ وہ سب آپ کے ارد گرد جمع ہوگئے۔ انہی دنوں ایک متمول شخص کشمیر سے شمال ہند کے لیے چلا۔ اسے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اسے خدا سے ملا دے۔ اس کوشش میں اس نے بڑے دھوکے کھائے۔ جواہر نما سنگ ریزوں سے ملاقاتیں کیں اور ہر بار کچھ نہ کچھ کھو کر تلاش حق میں لگا

رہا۔ وہ پٹھان کوٹ سے آگے بڑھا تو ایک بزرگ نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ''نوجوان! تو کہاں جا رہا ہے۔ پریشانیاں تیرے بشرے سے ٹپک رہی ہیں۔ اگر مجھے کسی لائق سمجھتا ہے تو اپنے دکھ درد مجھے دے دے۔ میں انہیں مار بھگاؤں گا۔''

اس شخص نے ان بزرگ کو دیکھا اور پھر ان کی باتیں سنیں تو حیران رہ گیا، اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں کسی مرد کامل کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں ہوں۔ معلوم نہیں میں اسے پا بھی سکوں گا یا نہیں۔''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''اگر میں اس مرد کامل کا پتا بتا دوں تو!''

حق کے متلاشی نے جواب دیا۔ ''تو میری منزل مل جائے گی اور میں آپ کا زندگی بھر احسان مند رہوں گا اور اگر آپ مجھ سے اس کا معاوضہ چاہیں گے تو میں ہر معاوضہ ادا کرنے کو تیار ہوں جو میری استطاعت اور مقدرت میں ہوگا۔''

بزرگ نے کہا۔ ''شاہجہاں آباد چلا جا، وہاں کسی سے بھی ابوالعلیٰ کے بیٹے خواجہ زبیر کا پتا معلوم کر لینا، یہ وہ ہے جسے اس عہد کی قیومیت عطا کی گئی ہے گویا خواجہ زبیر قیوم رابع ہیں، ان کے والد قیوم ثالث تھے۔ قیوم ثانی حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند خواجہ معصوم کو بخشی گئی تھی اور قیوم اول خود مجدد الف ثانی تھے۔''

یہ شخص ان بزرگ کو وہیں چھوڑ کر شاہجہاں آباد چل دیا اور خواجہ زبیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کئی دن بعد اس نے خواجہ زبیر کو ان بزرگ کا حال سنایا جن کی ہدایت پر یہ شخص آپ کے پاس پہنچا تھا تو آپ نے فرمایا۔ ''یہ بزرگ خود خواجہ خضر تھے۔''

1739ء کے پرآشوب سال میں دہلی خوف اور دہشت کا شکار ہوگئی تھی۔ محمد شاہ رنگیلا کی بادشاہت مغل دبدبے سے محروم ہو چکی تھی اور شاہ درانی دہلی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جنت الحمقا میں رہنے والے مغل لشکری اور امرا نادر شاہ افشار کا مذاق اڑانے میں مشغول تھے لیکن ان میں بعض مرید ایسے بھی تھے جو مغل بادشاہت اور دہلی کے مستقبل سے مایوس اور فکرمند تھے۔ وہ چوری چھپے خواجہ زبیر کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ''حضرت! ہماری آنکھیں بڑا خون خرابا دیکھ رہی ہیں۔ دعا فرمائیے کہ خدا ہمیں فتنوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ رکھے۔''

خواجہ زبیر نے ارشاد فرمایا۔ ''لوگو... ! دہلی پر ایک قیامت نازل ہونے والی ہے۔ اپنے اپنے اعمال درست کر لو تاکہ وہ ظلم کو روکنے کی سپر بن جائیں۔''

ایک عاقبت نااندیش امیر نے نادر شاہ اور اس کی فوج کا مذاق اڑایا۔ ''حضرت! نادر شاہ ہمارے بادشاہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ خدا ہمارے بادشاہ محمد شاہ کو سلامت رکھے۔ ان کے باپ دادا بھی اس ملک پر حکومت کرتے تھے۔ اب یہ حکومت کر رہے ہیں۔ محمد شاہ کے پاس ماضی کا درخشاں ورثہ ہے جبکہ نادر شاہ کے پاس اس قسم کا کوئی ورثہ نہیں۔ یہ گڈریا زادہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تھکا ہارا آئے گا تو مارا جائے گا۔ خود مرے گا اور اپنی فوج کو بھی برباد کروائے گا۔''

خواجہ زبیر نے کہا۔ ''اے شخص! تو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ دہلی کی طرف نادر شاہ اور اس کی فوج کی آمد کوئی معمولی بات ہے کیا؟ یہ قہر الٰہی ہے جو عنقریب دہلی پر نازل ہو جائے گا۔ دہلی والے قیامت صغریٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، تم کس ہوا میں ہو؟''

اسی امیر نے کہا۔ ''حضرت! میں آپ کی تردید تو نہیں کروں گا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ حملہ آور تھکان کی وجہ سے اس لائق نہیں رہ جائیں گے کہ ہم سے جنگ کر سکیں۔ آپ دیکھ لیجیے گا ہم لوگ اس کا منہ موڑ دیں گے اور وہ دوبارہ یہاں آنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔''

خواجہ زبیر نے بے نیازی سے فرمایا۔ ''خدا ایسا ہی کرے۔ میں دعاگو ہوں۔''

نادر شاہ یلغار کرتا، آبادیوں کو روندتا، کچلتا دہلی میں داخل ہو گیا۔ مغل فوج خس و خاشاک کی طرح نادری سیلاب میں بہہ گئی۔ اس دوران جبکہ نادر شاہ دہلی کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر مغل بادشاہ کو زیر کر چکا تھا۔ لوگ اس کا انجام جاننے کے لیے بے چینی سے منتظر تھے۔ خواجہ زبیر کے پاس آنے والوں میں اکثریت ان کی تھی جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ اب دہلی ہندوستان پر حکومت کون کرے گا۔ مغل بادشاہ یا ایران کا گڈریا نادر شاہ۔ خواجہ زبیر نے واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ حکومت مغل فرماں روا ہی کرے گا مگر دہلی والے سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ مریدوں کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ اگر مغل فرمانروا محفوظ رہ گیا اور دہلی والوں پر عتاب ہوا تو اس میں تباہی اور بربادی کس کس کے مقدر میں لکھی ہوئی نکلے گی۔

نادر شاہ ایک دن سو کر جو اٹھا تو اسے اپنے بستر پر سے ایک خط ملا، اس میں کسی مسخرے نے پوچھا تھا۔

''میں ناچیز اور ایک گمنام شخص ہوں اور نادر شاہ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ دہلی کیوں آیا؟ اگر وہ خدا بننا چاہتا ہے تو نادر شاہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کو مخلوق کی ضرورت رہتی ہے اس لیے دہلی والوں کو بادشاہ مخلوق سمجھ کر معاف کر دے اور گر بادشاہ پیغمبر بن کر آیا ہے تو اس کو امت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دہلی والوں کو اپنی امت ہی سمجھ کر معاف کر دے اور اگر نادر شاہ

بادشاہ بننے آیا ہے تو اس کو رعایا درکار ہوگی اس لیے دہلی کو اپنی رعایا ہی سمجھ کر بادشاہ درگزر سے کام لے۔''
نادرشاہ نے اسے پڑھا تو غصے سے اس کا چہرہ لال ہوگیا اور چیخ کر پوچھا۔ ''یہ خط کس نے لکھا ہے؟''
سامنے موجود ہر شخص کا چہرہ لٹک گیا۔ نادرشاہ نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا مگر وہاں پر ہر چہرہ سپاٹ اور لاعلم تھا۔ نادرشاہ نے غصے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال جن صاحب نے بھی میرے بستر پر یہ خط رکھا ہے انھیں میری طرف سے جواب دے دیا جائے کہ نادرشاہ قہر الٰہی بن کر دہلی پر نازل ہوا ہے۔''
اس کے بعد مغل فوج نے نادرشاہ کی فوج میں اڑا دیا کہ ایرانی بادشاہ دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اس خبر نے ایرانیوں کے حوصلے پست کر دیے اور مغلوں کے حوصلے بڑھا دیے۔
نادرشاہ غصے میں گھوڑے سے اتر پڑا اور سنہری مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی تلوار نیام سے باہر کر لی اور اپنی فوج کو حکم دے دیا کہ جو نظر آئے اسے قتل کر دو اور جب تک میری تلوار نیام سے باہر ہے۔ یہ قتل اور خونریزی جاری رہے۔
اس حکم نے دہلی پر قیامت صغریٰ نازل کر دی اور ہر طرف خون کا دریا بہنے لگا۔ لوگ بھاگ بھاگ کر شاہجہاں آباد پہنچنے لگے لیکن جن کے ایمان کمزور تھے وہ یہاں بھی خوفزدہ نظر آتے تھے۔ وہ بار بار یہی پوچھتے۔ ''حضرت! اب کیا ہوگا؟''
خواجہ زبیر جواب دیتے۔ ''کچھ نہیں ہوگا ستر ہزار انسان قتل کر دیے جائیں گے مگر بادشاہ محمد شاہ ہی رہے گا۔''
ایک مرید نے پوچھا۔ ''حضرت! شاہجہاں آباد پر کوئی مصیبت تو نہیں آئے گی؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میرے آس پاس رہنے والے محفوظ رہیں گے۔''
نادرشاہ نے دہلی کو تین دن رات کے لیے امن و امان سے محروم کر دیا لیکن شاہجہاں آباد کا وہ گوشہ بالکل محفوظ رہا جو خواجہ زبیر کی نگرانی میں تھا۔ کچھ عرصہ بعد نادرشاہ ایران واپس چلا گیا اور دہلی کا نظام حکومت محمد شاہ کے پاس ہی رہنے دیا۔ لوگ خواجہ زبیر کے اور زیادہ قائل ہوگئے اور ان کے اعزاز اور مرتبے میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

☆☆☆

خواجہ زبیر نے ایک زمانے کو فیض پہنچایا اور لوگوں کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈال دیا۔ آخری عمر میں انہیں معدے کی خرابی کی شکایت ہوگئی۔ حکیموں نے جلاب تجویز کیا آپ اس پر کاربند ہوگئے۔
ایک بار عشا کی نماز کے بعد انہیں اپنے پیٹ میں درد محسوس ہوا۔ پہلے تو آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس میں شدت آتی چلی گئی۔ حکیم بلوائے گئے انہوں نے دیکھا اور دوائیں دیں لیکن دواؤں کا حلق سے اترنا تھا کہ کھانسی شروع ہوگئی پھر جسم میں بخار چڑھنے لگا۔ صبح ہوتے ہوتے انہیں اپنے سینے میں درد بھی محسوس ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ شاید فجر کی نماز نہیں پڑھ سکیں گے لیکن توقع کے خلاف آپ نے فجر کی امامت کی اور ورد و وظائف میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔
کچھ عرصے بعد صحت بھی جواب دینے لگی۔ مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت! اطبا کہتے ہیں کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''دوستو! وہ دن زیادہ دور نہیں جب میں مستقلاً آرام کر سکوں گا۔''
ایک مرید آپؒ کا مطلب سمجھ گیا، گھبرا کر بولا۔ ''حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟''
آپؒ نے جواب دیا۔ ''یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ مشیت ایزدی ظاہر کر رہا ہوں۔''
سمجھدار ہوش مند مریدوں نے آپ کی خدمت میں زیادہ تندہی اور جوش سے کام لیا۔ وہ آپ کے پاس گھنٹوں موجود رہتے اور صورت دیکھتے رہتے کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ یہ آفتاب بہت جلد گہنا جانے والا ہے۔ اسی دوران رمضان آ گئے۔ خواجہ زبیر نے اس ماہ تین بار قرآن ختم کیا اور بعد میں 29 شوال تک پابندی سے مسجد آتے رہے۔ 29 شوال کے بعد آپ پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ آخر ایک دن اشراق کے وقت آپ اپنے خالق سے جا ملے۔
5 ذیقعد، جمعرات کے دن آپ کی لاش مبارک سرہند پہنچا دی گئی اور 12 ذیقعد کو جمعرات ہی کے دن آپ کو دفن کر دیا گیا۔ کہتے ہیں ایسا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور متبع سنت پھر نہیں پیدا ہوا۔

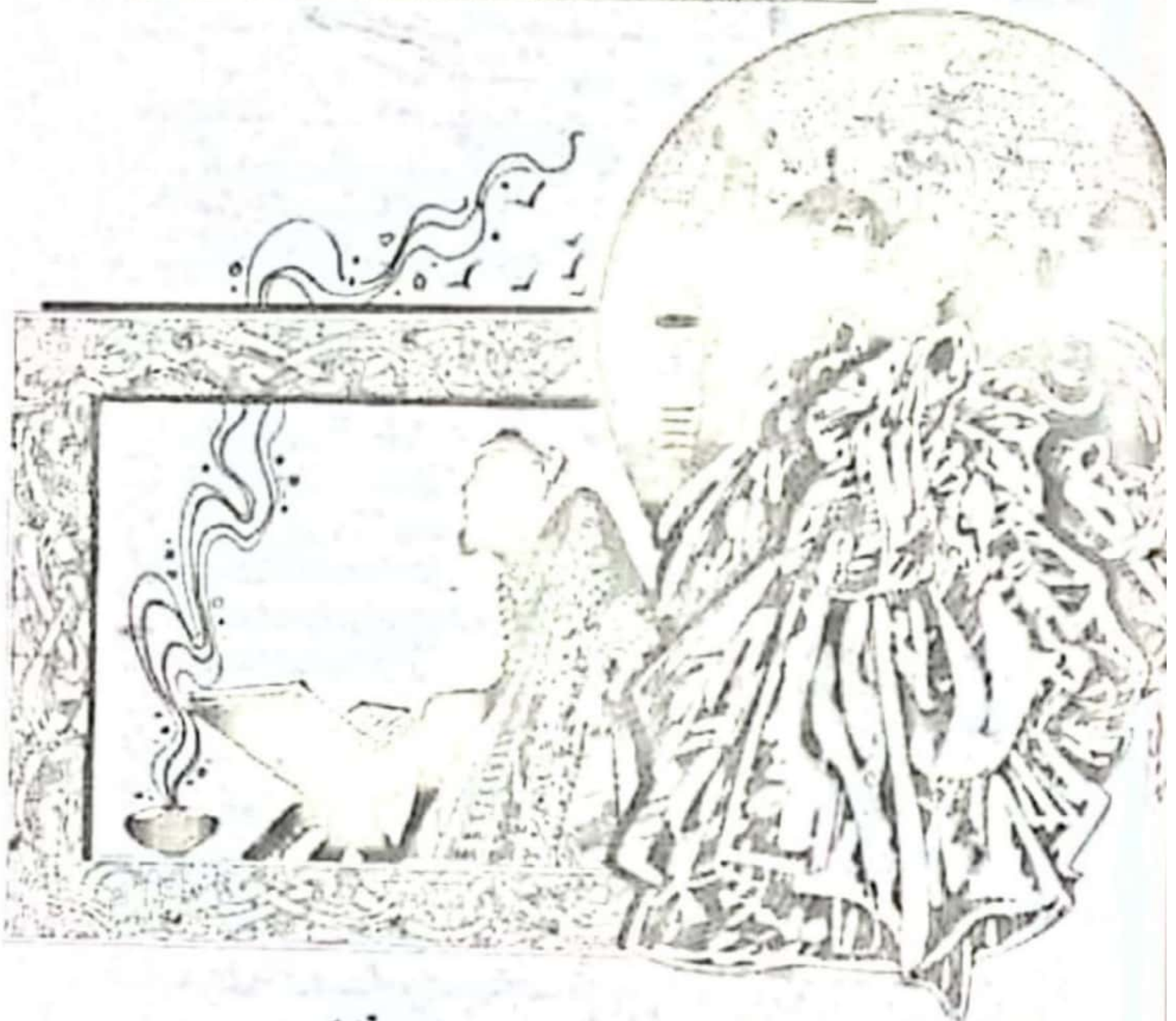
ماخذات	
	خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سکینۃ الاولیا، شہزادہ داراشکوہ۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ داراشکوہ۔ شاہجہاں نامہ (عمل صالح)، محمد صالح کمبوہ۔ تزک جہانگیری، شہنشاہ جہانگیر۔ انوار اصفیا

حکیم الاولیا

ضیا تسنیم بلگرامی

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو ایک مخصوص درجہ اور اپنے قرب سے سرفراز کیا اسی طرح ولیوں میں بھی کچھ کی جگہ اتنی بلند ہے کہ دوسرے اس کا تصور تک نہیں کرسکتے۔ آپ ؒ کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے جنہیں اللہ نے ایک خاص مقام عطا کیا اور حکیم الاولیا کا لقب ملا۔ آپ کے رہنما استاد محترم حضرت خضر ؑ تھے تو کیسے آپ کے علم میں تشنگی باقی رہ جاتی... آپ ایسے کامل ولی تھے جن کے علوم سے خلقِ خدا نے بے انتہا فیض پایا۔

[illegible]



ترمذ کے شیخ محمد بن علی نے اپنے دو ساتھیوں میں بیٹھ کر یہ منصوبہ بنایا کہ تینوں دوستوں کو حصولِ تعلیم کی خاطر بغداد اور ایسے ہی دوسرے شہروں کا سفر کرنا چاہیے۔ یہ تجویز محمد بن علی کی تھی۔ ایک دوست نے کہا۔ ”اگر ہم تینوں یہیں ترمذ میں رہ کر تعلیم حاصل کریں تو کیا حرج ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”حرج تو کوئی نہیں، یہاں بس ایک ہی خرابی ہے، وہ یہ کہ بغداد اور دوسرے شہروں میں جیسی یگانہ

روزگار شخصیتیں پائی جاتی ہیں، ترمذ ان سے محروم ہے۔ اس لیے ہمیں بھی ان اساتذہ و دیگر اور یگانۂ عالم علما سے تحصیل علم کرنی ہے... اس عہد میں دوسری کوئی مثال نہ ملے گی۔"

دوسرے دوست نے کہا۔ "لیکن جناب اس میں ایک قباحت بھی ہے۔ وہ یہ کہ ترمذ سے دور دراز شہروں کا سفر اتنا آسان نہیں ہے جتنا خوش فہمی میں ہم تینوں سمجھ بیٹھے ہیں۔"

محمد بن علی نے جواب دیا۔ "اگر آپ لوگ اس خوش فہمی میں ہیں کہ حصول علم کی راہ میں پیش آنے والی صعوبتیں اور مصائب ہمیں تنگ کردیں گے اور ہماری زندگی دوبھر کردیں گے تو میں اس سفر سے آپ کو روک دوں گا کیونکہ علم جیسی نادر اور قیمتی شے کی حصولیابی اتنی آسان نہیں ہے جتنی آپ دونوں سمجھ بیٹھے ہیں۔"

پہلے دوست نے کہا۔ "لیکن ذرا سے علم کے لیے سفر کی صعوبتیں جھیلنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں جو کچھ پڑھنا ہے ہمیں ترمذ میں ہی رہ کر لکھ پڑھ لیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ خیال بھی درست ہے، ذرا سے علم کی خاطر سیکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ ان فاتحین سے زیادہ احمق نظر آتے ہیں جو ایک ایک شہر یا قصبے کی خاطر ہزاروں میل کے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

دونوں ساتھی آپ کے استدلال پر شرمندہ ہوگئے، بولے۔ "اچھا جناب، ہم دونوں سفر پر آمادہ ہیں آپ منصوبہ بتائیے۔"

آپ نے کہا۔ "کیسا منصوبہ؟ ہمارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس علم کی تحصیل کے لیے شہروں کی خاک چھاننا ہے۔ بس یہی ہمارا منصوبہ ہے اور اسی میں ہمارا مستقبل ہے۔"

تینوں نے آپس میں عہد و پیمان کیے کہ اس وقت جو کچھ طے پایا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہاں تک کہ حصول تعلیم کی راہ میں ہماری جانیں تک چلی جائیں تو ہم اس کی پروا نہیں کریں گے۔

تینوں نے سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔ محمد بن علی بھی تیاریاں کرنے لگے۔ آپ کی تیاریاں دیکھ کر بوڑھی ماں نے پوچھا۔

"بیٹے! یہ سامان کیوں بندھ رہا ہے، خیریت تو ہے، کہاں جانے کی تیاریاں کی جارہی ہیں؟"

محمد بن علی نے جواب دیا۔ "ماں میں آپ کو اپنے اس منصوبے کے بارے میں جانے سے پہلے ضرور بتاتا لیکن اب جبکہ آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میرا جواب بھی سن لیجیے۔ میں حصول علم کی خاطر بغداد جارہا ہوں اور بغداد کے بعد کہاں جاؤں گا کچھ پتا نہیں کیونکہ یہ بغداد پہنچ کر ہی معلوم ہوگا۔"

ماں نے پوچھا۔ "بیٹے! اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "ہمیں اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ پانچ سال لگ جائیں، دس سال بھی لگ سکتے ہیں، دس سال سے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔ ابھی قبل از وقت میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

ماں نے پھر سوال کیا۔ "اور بیٹے! اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ کے لگ بھگ مگر کیوں — آپ اس قسم کی باتیں کیوں کررہی ہیں؟"

ماں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "تیرے حساب میں ساٹھ پینسٹھ کو پہنچ چکی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سال اور جی لوں گی۔ اب اگر تو دس پندرہ سال کے لیے میرے پاس سے چلا گیا تو میری دیکھ بھال کون کرے گا؟ آخری وقت میں میرے پاس کون ہوگا؟ میں تجھے دیکھنے اور تجھ سے بات کرنے کو ترسوں گی اور تو سیکڑوں میل دور لاپتا ہوگا۔ بتا کیا اس حالت میں تیرا سفر کرنا درست ہے؟ میں تجھے یہ سفر نہیں کرنے دوں گی۔"

محمد بن علی بڑی مصیبت میں پھنس گئے، سعادت مندی سے جواب دیا۔ "اچھا پھر میں یہ سفر نہیں کروں گا، آپ کے پاس ہی رہوں گا۔"

ماں خوش ہوگئیں اور بیٹے کو دعائیں دینے لگیں۔

دونوں دوست تیاری کرکے آگئے اور کہا۔ "ابن علی! ہمیں کل صبح بغداد روانہ ہونا چاہیے۔"

محمد علی نے سکوت اختیار کیا۔ دونوں دوستوں نے پوچھا۔ "آخر تم کیوں خاموش ہو؟ کیا تم نے ابھی تک تیاری نہیں کی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے ابھی تک تیاری نہیں کی اور نہ ہی سفر کی تیاری کرنے کا ارادہ ہے۔"

دونوں دوستوں نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر کیوں، کیا ہوا؟"

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے جب منصوبہ بنایا تھا خود سے بنایا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ میری ایک ماں بھی ہے جو بہت بوڑھی ہے۔ میں اگر بغداد چلا جاؤں گا تو میری بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میری ماں زندہ ہے، میں اس قسم کا مدت العمری سفر نہیں کر سکتا۔''

دونوں دوستوں نے کہا۔ ''واہ جناب! ہم دونوں نے مرضی نہ ہونے کے باوجود تمہاری پُرزور دلیلوں پر سفر کا منصوبہ بنایا تھا، اب اگر آپ نہیں جا رہے تو نہ جایئے، ہم دونوں تو جائیں گے ہی، خدا حافظ۔''

آپ نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''تمہارا ساتھ نہ دے سکنے میں میرا اپنا نقصان ہے۔ سالوں کے بعد جب تعلیم حاصل کر کے تم دونوں واپس آؤ گے تو میں تم دونوں کے سامنے جاہل ٹھہروں گا۔ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے مستقبل کا یہ کرب اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے گوارا کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دس سال بعد بھی تعلیم حاصل کر سکوں لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنی ماں کو ایک بار کھو کر دوبارہ حاصل کر لوں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ قابلِ تلافی نقصان کو ناقابلِ تلافی نقصان پر قربان کر دوں چنانچہ اسی لیے میں تمہارا شریک سفر نہیں ہو رہا ہوں۔''

دونوں دوست خاموش ہو گئے۔ کچھ سکوت کے بعد کہا۔ ''ابن علی ہمارے پاس تمہاری زوردار دلیلوں کا کوئی جواب نہیں لیکن جب ہم فارغ التحصیل ہو کر واپس آئیں گے تو ممکن ہے تمہیں لاجواب کر سکیں۔''

محمد بن علی نے جواب دیا۔ ''خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔''

دونوں دوست چلے گئے اور آپ پر غموں نے وہ دباؤ ڈالا کہ بڑی دیر تک طبیعت قابو میں نہیں آئی۔ آپ نے دل کے بوجھ سے تنگ آ کر قبرستان کا رخ کیا۔ وہاں بڑی دیر تک گھوم پھر کر آنسو بہاتے رہے۔ انہیں سب سے زیادہ یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ سالوں کے بعد جب ان کے یہ دونوں دوست واپس آئیں گے تو ان پڑھے لکھے دوستوں میں ان کی اپنی کیا حیثیت ہو گی؟ شاید جاہل ٹھہرائے جائیں گے۔ قبرستان میں چونکہ ہر طرف عبرت ہی کا سامان تھا اور وہاں دنیا اور متعلقات دنیا ہیچ نظر آتی تھیں اس لیے یہاں طبیعت ٹھہر گئی اور دل کو کچھ سکون ملا پھر تو آپ نے یہ دستور بنا لیا کہ جہاں طبیعت گھبرائی آپ نے قبرستان کا رخ کیا اور جب طبیعت ٹھہر گئی تو پھر گھر واپس آ گئے۔

ایک دن حسبِ معمول جو آپ قبرستان تشریف لے گئے تو ایک پرانی قبر کے سرہانے ایک بزرگ کو فاتحہ پڑھتے دیکھا۔ آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ آپ نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لی تھیں اور نہایت خشوع و خضوع سے سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا ورد کر رہے تھے۔ اسی عالم میں لمحہ بھر کے لیے اس شخص کا خیال آیا جو آپ سے پہلے یہاں کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی آپ نے آنکھیں کھول دیں، اب وہ شخص وہاں نہیں تھا۔ آپ نے فاتحہ پڑھ کر جیسے ہی واپسی کے لیے قدم اٹھائے، دیکھا وہ شخص اب بھی ان کے پیچھے موجود ہے۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو محمد بن علی نے اپنے دل پر ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔ اجنبی بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھا۔ ''ابن علی! تو مجھے دیکھ کر گھبرا کیوں گیا؟''

ابن علی نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، خوب اچھی طرح اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو یہاں قبرستان میں کیوں آتا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تو اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بغداد نہیں جا سکا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو نے اس سفر میں اپنے دوستوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ میں تیری ماں کے بڑھاپے سے بھی واقف ہوں۔''

آپ کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ نے اس کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا، بولے۔ ''مجھے حیرت ہے کہ آپ تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور میری ذرا ذرا سی بات آپ کے علم میں ہے لیکن میں آپ کو بالکل نہیں جانتا اور اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا ہوں۔''

اجنبی نے کہا۔ ''ابن علی ان باتوں کو چھوڑ دو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں؟''

ابن علی نے جواب دیا۔ ''میں آپ سے واقف ہی نہیں تب پھر میں یہ فیصلہ کس طرح کر سکتا ہوں کہ آپ میرے کیا کام آ سکتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

اجنبی بوڑھے کو ہنسی آ گئی، کہا۔ ''ابن علی! تو باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے اور دلیلیں بھی اچھی دے لیتا ہے۔''

آپ نے کہا۔ ''ساری باتیں اپنی جگہ، اب آپ اپنا تعارف کروائیں۔ اس کے بعد اور باتیں ہوں گی۔''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”ابن علی! یہ سمجھ لے کہ میں تیرا استاد ہوں اور تجھے وہ سب پڑھا دینا چاہتا ہوں جس کے لیے تیرے دونوں دوستوں نے بغداد کا سفر کیا ہے۔“

ابن علی نے حیرت سے نیچے سے اوپر تک دیکھا، پوچھا۔ ”آپ مجھے کیا پڑھا سکتے ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”وہ سب کچھ جو تو پڑھنا چاہتا ہے۔“

”کیا سچ؟“

”میں جھوٹ نہیں بولتا اور یہ بھی ذہن نشین رکھ کہ میں تیرے پاس کیوں آیا؟ تو نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر جو قربانی دی ہے اس کا کم سے کم جو صلہ بحکم خداوندی میں دے سکتا ہوں یہی ہے کہ میں تجھے وہ سب پڑھا دوں جس کے لیے تو سفر کرنا چاہتا ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”آپ کا مبلغ علم کیا ہے؟“

بوڑھے نے جواب دیا۔ ”میرا مبلغ علم پوچھتا ہے؟ گستاخ! میرا مبلغ علم اتنا ہے کہ بغداد اور دوسرے شہروں کے سارے ہی علمائے کرام اگر مل کر اپنے مجموعی علم سے میرے علم کا مقابلہ کرنا چاہیں تو وہ مجھ سے ہار جائیں گے۔“

بڑے میاں کی لاف وگزاف ابن علی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اس لیے ان سے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد بڑے میاں نے پھر اپنی زبان کھولی، کہا۔ ”ابن علی، تو تامل اور سوچ بچار میں اپنا وقت ضائع نہ کر۔ میں تجھے پابندی سے پڑھا دیا کروں گا اور اس کا تجھ سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لوں گا۔ بول، کیا تجھے میری یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں؟“

ابن علی نے کہا۔ ”بڑے میاں! تمہاری عمر تو خاصی اچھی طرح گزری ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں ترمذ میں موجود ہو اور میں واقف نہیں۔“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”مجھے بڑے میاں نہ کہو ابن علی کیونکہ میں بڑھاپے سے نفرت کرتا ہوں۔“

ابن علی نے کہا۔ ”میں خود بھی تم سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”تجھے یہاں اسی طرح آتے رہنا چاہیے اور میں تجھے یہیں اسی قبرستان میں پڑھا دیا کروں گا۔ علم کے سلسلے میں اس بات کا ہمیشہ خیال رہے کہ جب تو پڑھ لکھ کر فارغ ہو جائے تو، تو مغرور نہیں ہوگا اور بے کار بحث مباحثے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا۔“

”میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں اور کچھ؟“

”اور یہ کہ تو ہمیشہ انکسار اور عجز کو اپنا شعار بنائے گا۔“

”میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں۔“

”اور یہ کہ تو اپنے علم سے خلق خدا کو فائدہ پہنچائے گا۔“

”یہ وعدہ بھی رہا مگر رہا یہ مسئلہ کہ میں خلق خدا کو فائدہ پہنچاؤں گا، آخر کس طرح؟“

”اپنے علم سے اور کس طرح۔“ بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”وہ اس طرح کہ تو طب پڑھے گا، طب پڑھے گا سے میرا یہ مطلب ہے کہ تو طب بھی پڑھے گا۔“

ابن علی نے حیرت سے سوال کیا۔ ”کیا تو طب بھی پڑھا دے گا مجھے؟“

”کیوں نہیں، کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں جتا دیا ہے کہ میں تجھے وہ سب پڑھا سکتا ہوں جس کے لیے تو بغداد جا رہا تھا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”بہرحال میں پڑھنا تو آج ہی سے شروع کر سکتا ہوں لیکن بڑے میاں تم آدمی بے حد دلچسپ ہو اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی ایک شخص میں سارے علوم کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”دیکھنا کیا معنی، وہ تو تو عملاً تجربہ کرے گا اس کا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اور کتابوں کا کیا ہوگا، کتابیں کون فراہم کرے گا۔ مجھے لانا پڑیں گی یا تم لاؤ گے؟“

بڑے میاں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”تو کہے گا تو کتابیں بھی میں ہی لے آؤں گا۔“

ان دونوں میں طے ہو گیا کہ دوسرے دن سے پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ محمد بن علی بشاشت اور ایک قسم کا تجسس لیے گھر آگئے اور بڑے میاں کی بات چیت پر ٹھنڈے دل سے غور کیا کہ یہ بوڑھا واقعی کوئی عالم بے بدل ہے یا سنکی، پاگل؟ وہ رات بڑی فکر اور بڑی جستجو میں گزاری، دوسرے دن صبح ذرا معمول سے پہلے ہی قبرستان پہنچ گئے اور ان بڑے میاں کو ادھر ادھر دیکھنا شروع

کر دیا۔ ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ یہ مایوس ہو کر سوچنے لگے کہ اس بوڑھے نے کل خوب بے وقوف بنایا۔ اب وہ کہیں بیٹھا خوب ہنس رہا ہو گا کہ محمد ابن علی کو اچھا بے وقوف بنایا۔ یہ سوچ کر انہیں بڑا غصہ آیا۔

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ بڑے میاں ان کے پیچھے سے آ گئے۔ ان کی بغل میں کتابیں دبی تھیں اور وہ بالکل تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ قریب آتے ہی بولے۔ ”میاں صاحبزادے! آنے میں ذرا سی دیر کیا ہوئی کہ تم نے میرے بارے میں غلط انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مجھے سنکی دیوانہ سمجھ لیا۔“

یہ بہت شرمندہ ہو گئے، بولے۔ ”بابا! میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کے خلاف اس طرح سوچا اور اس پر حیرت زدہ کہ آپ کو میری سوچ کا علم بھی ہو گیا۔“

بڑے میاں نے ہنس کر کہا۔ ”دیکھو تو تم، میں کتنا عجیب انسان ہوں۔“

اس کے بعد اپنی بغل کی کتابیں ان کے سامنے رکھ دیں، کہا۔ ”دیکھو میں تمہارے لیے کتنی کتابیں لایا ہوں۔ اب پڑھائی شروع کر دو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ سالوں کے بعد جب تمہارے دونوں دوست پڑھ لکھ کر ترمذ واپس آئیں تو تم ان دونوں میں زیادہ بڑھ کر نظر آؤ اور تمہیں ان کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔“

اب تو محمد بن علی میں یارائے گفتگو ہی نہ رہا۔ کتابیں دیکھیں تو اور دنگ رہ گئے۔ تصوف، الٰہیات، حکمت، طب معلوم نہیں کتنے موضوعات پر یہ کتابیں تھیں۔ ان کی پڑھائی شروع ہو گئی اور انہیں پہلے دن ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ بڑے میاں انہیں پڑھا نہیں رہے ہیں بلکہ گھول کے پلائے دے رہے ہیں۔ جو کچھ پڑھا رہے تھے حیرت انگیز طور پر دل و دماغ میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

اب تو آپ کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی قبرستان چلے جاتے اور وہاں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی میں مشغول ہو جاتے۔ کچھ دنوں بعد یہ انکشاف بھی ہوا کہ جب یہ دونوں درس و تدریس میں مشغول ہوتے ہیں اور وہاں کوئی تیسرا شخص آ جاتا ہے تو وہ ان بڑے میاں کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ ہر آنے والا آپ سے تعجب سے سوال کرتا۔ ”میاں صاحبزادے! یہ پڑھنے کی کون سی جگہ ہے اور پھر اس طرح کہ نہ کوئی استاد ہے نہ کوئی ساتھی۔ آخر تنہائی میں دل کس طرح لگتا ہے؟“

بڑے میاں اشارے سے محمد بن علی کو منع کر دیتے کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے چنانچہ یہ ٹالنے والا جواب دے کر اسے چلتا کر دیتے۔

ان کی ماں کو بڑی تشویش تھی کہ ان کا بیٹا یہ ہر روز صبح صبح جاتا کہاں ہے؟ انہوں نے بڑے میاں سے کہا۔ ”کیا میں اپنی ماں کو جو کچھ میں جانتا ہوں، بتا سکتا ہوں یا انہیں بھی ٹالتا رہوں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، انہیں بتا دو کہ خدا کا ایک بندہ تمہیں ہر روز بلا معاوضہ پڑھانے آ جاتا ہے اور بس۔“

چنانچہ آپ نے اپنی ماں کو بتا دیا۔ ماں نے اپنے بیٹے کے ساتھ ہی بڑے میاں کو بھی بڑی دعائیں دیں کہ وہ ان کے بیٹے کو بلا معاوضہ پڑھا رہا ہے۔ محمد بن علی تین سال تک ان بڑے میاں سے پڑھتے رہے اور اس عرصے میں انہوں نے کئی علوم حاصل کر لیے اور ان علوم میں علم طب بھی شامل تھا۔

محمد بن علی کو ذہن رسا کے ساتھ ہی حسن بھی وافر ملا تھا۔ اس پر جوانی کا رنگ، جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ عورتیں آپ سے بات چیت کی متمنی رہتیں۔ لڑکیاں آپ کی ایک جھلک کے لیے گھنٹوں چشم براہ رہتیں لیکن خود آپ کا یہ حال تھا کہ کسی پر توجہ ہی نہ دیتے۔ ایک تو طبیعت میں یوں ہی شرم و حیا اور حلم اور سنجیدگی بہت زیادہ تھی۔ اس پر بڑے میاں کی صحبت کا اثر، آپ کو دنیا کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی دلچسپی محسوس ہی نہ ہوتی۔

ایک خوب صورت عورت بہت دنوں سے آپ سے بات کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ کئی بار ستانے میں آپ کی راہ میں حائل ہوئی لیکن آپ اس سے بچ کر نکل گئے۔ اس نے ایک آدھ بار آپ کو آواز بھی دی لیکن سنی ان سنی کر گئے۔ عورت بھی بڑی ہمت والی تھی، اس نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ محمد بن علی کو زیر کر کے ہی دم لے گی۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں اس کی ناکامی پر خوش ہوتیں اور مذاق میں کہتیں۔ ”تو کچھ بھی کر لے محمد بن علی تجھے دیکھنا تک گوارا نہ کریں گے۔“

عورت کہتی۔ ”بس یہی تو مجبوری ہے، اگر ابن علی ایک بار بھی مجھے دیکھ لیں تو میں دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ میرا اثر قبول کیے بغیر نہ رہیں گے اور میرے عشق میں بولائے بولائے پھرتے رہیں گے اور پھر میں بھی کنارہ کشی اختیار کر لوں گی اور انہیں اس سے زیادہ ستاؤں گی جتنا یہ مجھے ستا رہے ہیں۔“

عورتیں طنزاً کہتیں۔ "ارے ابن علی تیرے قابو میں نہیں آئیں گے۔ یہ بہت مغرور ہیں۔"
عورت نے کہا۔ "ابھی میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر تو چلایا ہی نہیں۔ جب میں ابن علی سے ہر طرح مایوس ہو جاؤں گی تو اپنا وہ آخری تیر چھوڑوں گی جس کا نشانہ کبھی خطا ہوا ہی نہیں اور جو دنیا کا خطرناک تیر کہلاتا ہے۔ مردوں کے حق میں عورتوں کا خطرناک ترین تیر۔"
ایک عورت نے پوچھا۔ "اپنا وہ آخری تیر مجھے بھی تو بتا تاکہ میں بھی آزما کے دیکھوں۔"
عورت نے جواب دیا۔ "واہ، میں کیوں بتاؤں تجھے۔ پہلے میں آزما لوں پھر تجھے بتا دوں گی۔"
عورتوں نے جواب دیا۔ "اچھا جب وہ آخری تیر لے کر ابن علی کے پاس جانا تو ہمیں بھی دکھا دینا۔"
عورت نے جواب دیا۔ "نہ صرف دکھاؤں گی بلکہ بتا بھی دوں گی، تم لوگ فکر نہ کرو۔"
اس کے بعد اس عورت نے بڑی محنت اور جانفشانی سے آپ کے معمولات کا پتا چلانا شروع کر دیا۔ کتنی دیر گھر میں رہتے ہیں۔ گھر سے نکلتے ہیں تو کہاں کہاں، کس کس کے پاس جاتے ہیں اور کتنی کتنی دیر ٹھہرتے ہیں۔ ان معمولات میں اسے ایک ہی کام کا نظر آیا۔ ابن علی ہر روز ترمذ کے ایک ایسے باغ میں ضرور جاتے ہیں جو عموماً ویران رہتا ہے اور اس میں دوسرے لوگ جانا پسند نہیں کرتے۔ ابن علی اس باغ میں گھنٹوں غور و فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اس باغ کو اس عورت نے اپنی کمین گاہ تصور کر لیا اور وہاں پہنچنے اور اپنے منصوبے پر کامیابی سے عمل درآمد کی تدبیریں سوچنے لگی۔
ایک دن اس عورت نے بہترین لباس زیب تن کیا اور ترغیب اور تحریص آرائشیں کر کے اپنی حاسد عورتوں میں پہنچی اور کہا۔ "ذرا دیکھو تو میں کیسی لگ رہی ہوں؟"
عورتوں نے حسد طور پر جواب دیا۔ "قیامت، بخدا مرد تو مرد ہم عورتوں پر تیرے حسن اور آرائش کا جادو اثر کر رہا ہے۔"
عورت نے جو لباس پہن رکھا تھا اس میں عریانیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ نیم عریانیت جو عریانیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس نے کہا۔ "عورتو! آج میں اپنا آخری تیر آزمانے جا رہی ہوں۔ میرا یہ تیر ترغیبات اور تحریصات کا تیر ہے۔ نیم عریانی کا تیر ہے۔ آنسوؤں کا تیر جو ابن علی کے سامنے چلے گا، ناز اور نخرے کا تیر ہے جو ان کے سامنے چھوڑا جائے گا اور خلوت کی کمین گاہ میں جب یہ تیر ایک ساتھ چلیں گے تو میں دیکھوں گی کہ ابن علی ان تیروں سے کس طرح بچتے ہیں۔"
آج ان حاسد عورتوں کو بھی اس عورت کی کامیابی کا کچھ کچھ یقین ہو گیا۔ پہلے وہ اس عورت کی ناکامی پر خوش ہوا کرتی تھیں۔ آج اس کی کامیابی کے خیال سے غمزدہ ہو گئیں اور دل ہی دل میں ناکامی کی دعائیں مانگنے لگیں۔
یہ عورت آپ سے پہلے ہی اس باغ میں پہنچ گئی اور ایک کنج میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ابن علی بھی وہاں پہنچے اور ایک سرو کے نیچے بیٹھ کر کچھ سوچنے لگے۔ ان دنوں ان کا دل معارف و اسرار کا گنجینہ بنتا جا رہا تھا۔ سرو کی جڑ میں تنے سے پشت ٹکا کر وہ معلوم نہیں کیا سوچتے رہے۔ ان کے آس پاس جھاڑیاں تھیں، ان جھاڑیوں نے آپ کو دنیا والوں کی نظر سے چھپا لیا تھا۔ اس عورت کو اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں وہ اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ابن علی کو بے بس اور حواس باختہ کر سکتی۔
وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ آپ کی طرف بڑھی اور بڑھتے بڑھتے بالکل ان کے قریب پہنچ گئی پھر اس نے اپنے دل پر تمکینی اور یاس کا اثر قائم کیا یہاں تک کہ اس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کا چہرہ حسرت و اندوہ کا مرقع بن گیا پھر وہ سسکیاں بھی لینے لگی۔ آپ نے سسکیوں کی آواز جو سنی تو ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا، وہ سسکیاں لیتے ہوئے آپ کے قریب پہنچ گئی اور واویلا کرتے ہوئے بولی۔ "اے نوجوان! خدا کے لیے میری مدد کر، میں بڑی مظلوم عورت ہوں۔"
آپ نے اس عورت کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس کا حسن ہوشربا اور آرائش و زیبائش زہد شکن۔ عورت نے خود کو ابن علی کی گود میں گرا دینے کی کوشش کی، بولی۔ "مجھے بچا لے اے نوجوان، مجھے بچا لے۔"
آپ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "عورت! ذرا ہوش و حواس میں رہ اور دور سے بات کر، آخر تیرے ساتھ ہوا کیا ہے؟"
عورت نے جواب دیا۔ "میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں اور اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اپنی آغوش میں لے کر میری ہچکیاں تھام تاکہ میرے دل سے ڈر نکلے اور میں اطمینان سے باتیں کر سکوں۔"
آپ نے کہا۔ "پھر بھی تو مجھ سے دور دور رہ اور وہیں سے بات کر۔ میری موجودگی میں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
عورت نے جواب دیا۔ "تو بڑا بے حس نوجوان ہے کہ ایک مظلوم اور مجبور عورت کی بے بسی سے بھی نہیں پسیج رہا ہے۔"

آپ نے کہا۔ ’’اچھا تو بیٹھ کر باتیں کر اور یہ بتا کہ کیا یہاں تیرے علاوہ بھی کوئی شخص ہے؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’ہاں ایک شخص اور بھی تھا میرے ساتھ اب معلوم نہیں کہ وہ موجود بھی ہے یا چلا گیا۔‘‘
آپ نے کہا۔ ’’اچھا تو بیٹھ جا اور اطمینان سے بتا کہ تیرے ساتھ کیا ہوا؟‘‘
عورت آپ کے سامنے بیٹھ گئی اور بات کیے بغیر آنسو بہانے لگی۔ آپ کو اس کے آنسوؤں پر بڑا رحم آیا اور آپ کو اپنے دل میں اس کے لیے دکھ درد محسوس ہوا۔ آپ نے مزید کہا۔ ’’میں تیری حالت پر افسوس کر رہا ہوں۔ بتا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟‘‘
عورت نے کہا۔ ’’پہلے آپ یہ یقین دلا دیں کہ آپ واقعی میری مدد کریں گے ورنہ یوں ہی بلاوجہ حالِ زار سنانے سے فائدہ؟‘‘
آپ نے جواب دیا۔ ’’میں نے ایک بار تجھ سے کہہ تو دیا کہ میں جس حد تک تیری مدد کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔‘‘
عورت نے کہا۔ ’’میں ایک غمزدہ عورت ہوں۔ میں شادی شدہ تھی لیکن میرا شوہر مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور ایک عورت اسے لے گئی۔ اب میں ہوں اور ایک لمبی تنہائی ہے جس کا بہ ظاہر کوئی علاج نہیں۔‘‘
آپ نے پوچھا۔ ’’اس سانحے کو کتنا عرصہ گزرا؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’تقریباً تین سال ہوا چاہتے ہیں۔‘‘
آپ نے پھر پوچھا۔ ’’اور اس دوران تجھے اپنے شوہر کی کوئی خبر بھی نہیں ملی؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’ملی کیوں نہیں، سنتی ہوں اصفہان میں ہے اور اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔‘‘
آپ نے کہا۔ ’’اور تو نے کوشش نہیں کی کہ اسے بلوا لے؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’میں کیا کوشش کرتی۔ وہ اپنی مرضی سے بتائے بغیر گیا ہے، میں اس کا پیچھا کس طرح کر سکتی ہوں؟‘‘
آپ نے پوچھا۔ ’’لیکن اس وقت تو یہاں کس طرح آ گئی؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’یہ ایک الگ داستان ہے۔ میرے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ تیرا شوہر اصفہان سے آیا ہوا ہے اور تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آ گئی اور اچھے سے کپڑے پہن کر اپنے کو خوب بنایا سنوارا مگر وہ مجھے بری نیت سے اس باغ میں لے آیا اور چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ زیادتی کرے کہ یہاں تو نظر آ گیا، وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو گیا اور میں بھاگ کر تیرے پاس آ گئی۔‘‘
آپ نے عورت کو سرزنش کی۔ ’’تو نے ایک غیر مرد کی باتوں پر اعتبار کیوں کر لیا؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’محمد بن علی! تو ایک عالم ہے اور عالم ہو کر ایسی بات کرتا ہے۔ جس عورت نے شوہر کی مفارقت میں کئی سال گزارے ہوں اور اس دوران اس نے دوسرے مرد کی صورت تک نہ دیکھی ہو کیا تو اس کی پریشانیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا؟‘‘
اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی، بولی۔ ’’محمد بن علی، کہتے ہیں اضطراری حالت میں حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے، تو یقین کر شوہر کی جدائی کے عذاب میں اضطراری حالت کا شکار ہو گئی ہوں اور میں اپنے خیال میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اب حرام بھی مجھ پر حلال ہو گیا ہے۔‘‘
آپ نے غصے میں کہا۔ ’’اے عورت! تو یہ بک کیا رہی ہے، کیا تو نے اپنی باتوں کے معانی و مطالب بھی سمجھے؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’میری باتوں کے معانی و مطالب کوئی مجھ سے بہتر بھی سمجھ سکتا ہے؟‘‘
آپ نے کہا۔ ’’باتیں تو بہکی بہکی ہی کر رہی ہے اس وقت۔‘‘
عورت پھر رونے لگی، بولی۔ ’’اب میں زندہ ہی معلوم نہیں کیوں ہوں، ورنہ مصائب نے مجھے مردے سے بدتر کر رکھا ہے، اب تو میری مدد کر۔‘‘
آپ نے پوچھا۔ ’’عورت! میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟‘‘
عورت نے جواب دیا۔ ’’تو میری مدد کر سکتا ہے اور خوب کر سکتا ہے۔‘‘
آپ نے کہا۔ ’’بتا، اگر میرے بس کی بات ہوئی تو ضرور کروں گا تیری مدد۔‘‘
عورت نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ’’میں تیرا ہاتھ پکڑ رہی ہوں، تو بھی میرا ہاتھ پکڑ لے اور وعدہ کر کہ تو زندگی بھر میرا ساتھ دے گا اور میں بھی عہد کرتی ہوں کہ ہمیشہ تیری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔‘‘
آپ نے نفرت سے کہا۔ ’’تو میرا ہاتھ چھوڑ دے، یہ ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے۔‘‘

عورت نے آپ کو اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگا لینا چاہا، بولی۔ ”ابن علی! میں تیرے فراق میں آہیں بھرتی رہتی ہوں اور تو ہے کہ میری خبر ہی نہیں لیتا۔“

آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے، بولے۔ ”واہ اتنی ذرا سی بات کے لیے اتنی لمبی تمہید کی ضرورت تھی تو نے۔ اس کی کیا ضرورت ہے تو اگر کسی تمہید کے بغیر ہی اپنا مطلب واضح کر دیتی تو میں تیری پیش کش پر غور تو ضرور ہی کرتا بہرحال تو مجھ سے جو کچھ چاہتی ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ بآسانی ہو جائے، مجھے غور کرنے کا تو موقع دے۔“

عورت نے کہا۔ ”میں بہت صبر کر چکی، میں نے بہت ضبط کر لیا اب مزید صبر کا یارا نہیں ہے۔“

ابن علی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”تو جو کچھ چاہتی ہے وہ مجھ سے نہیں حاصل کر سکے گی، اس لیے اپنا راستہ لے۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”ابن علی! تو بڑی بے وقوفی کر رہا ہے، ترمذ کے کتنے ہی مرد میرے عشق میں آہیں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک تو ہے کہ میں تیرا پیچھا کر رہی ہوں، اگر تو نے یہ موقع ضائع کر دیا تو زندگی بھر پچھتائے گا۔“

آپ نے کہا۔ ”تو غلط مجبوری ہے بلکہ واقعی یہ ہے کہ اگر میں نے اس وقت تیرا کہنا مان لیا تو زندگی بھر پچھتاؤں گا۔“

عورت نے آپ کو پکڑنا چاہا، آپ نے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ باغ سے باہر آگئے اور عورت مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے تلے بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد جب یہ عورت مایوس اور غمزدہ ان عورتوں اور لڑکیوں کے سامنے سے گزری جو اس کا انتظار کر رہی تھیں تو ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے تیزی سے گزر کر اپنے گھر چلی گئی اور عورتوں نے اس کی شرمندگی اور ندامت سے اندازہ لگا لیا کہ وہ ناکام رہی ہے چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی منائی۔

☆☆☆

آپ اس عورت سے پیچھا چھڑا کر گھر پہنچے تو بہت پریشان تھے۔ ماں نے پوچھا۔ ”بیٹے! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“

انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ ماں نے بیٹے کو دعائیں دیں کہ ”خدا تجھے اسی طرح برائیوں سے بچاتا رہے۔“

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر گئے تو دروازے پر انہی بڑے میاں کو کھڑے دیکھا جن سے وہ قبرستان میں تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ اس وقت خلافِ توقع اپنے دروازے پر دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے، کہا۔ ”زہے نصیب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف تو لائے۔“

اس کے بعد آپ نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا اور باتیں ہونے لگیں۔ بڑے میاں نے کہا۔ ”ابن علی! اس وقت میں خاص طور پر اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں مبارک باد دوں۔“

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کس بات کی مبارک باد؟“

بڑے میاں نے کہا۔ ”اس بات کی کہ تو زلیخا کے مکر سے بچ گیا۔“

ابن علی نے کہا۔ ”لیکن حضرت یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”مجھے کون بتاتا، میں خود وہاں موجود تھا اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔“

آپ نے سر پکڑ لیا، بولے۔ ”حضرت! میں بہت پریشان ہوں۔ آخر آپ اپنا تعارف کیوں نہیں کرواتے کہ میرے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے آپ کو اس کا بغیر بتائے ہی علم کیسے ہو جاتا ہے، کیا آپ جن ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“

آپ نے کہا۔ ”پھر کیا آپ فرشتہ ہیں؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”نہیں میں فرشتہ نہیں ہوں۔“

آپ نے کہا۔ ”نہ آپ جن ہیں اور نہ فرشتہ ہیں پھر آپ ہیں کیا؟“

بڑے میاں نے پوچھا۔ ”کیا میں واقعی یہ بتا دوں کہ میں کیا ہوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر آپ اس وقت بھی اپنا تعارف نہیں کرائیں گے تو مجھے اختلاج ہو جائے گا۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”میں نہ تو جن ہوں نہ فرشتہ بلکہ میں خضر ہوں۔ جسے خدا نے بھولے بھٹکوں کی راہ نمائی کی خدمت سونپی ہے اور ہمیشہ کی زندگی عطا فرمائی ہے۔“

آپ سناٹے میں آگئے اور خضر کی صورت دیکھتے رہے، بولے۔ ”تو گویا مجھے حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردی کا شرف

حاصل ہے؟"

"ہاں تو میرا شاگرد ہے، خضر کا شاگرد اور خدا نے یہ کام اس لیے میرے سپرد فرمایا تھا کہ تو نے اپنی ماں کے احترام میں تحصیل علوم کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔"

آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ بڑی دیر تک آپ سے باتیں کرتے رہے۔ آخر میں رخصت ہوتے ہوئے فرمایا۔ "ابن علی! میں ہفتے میں ایک بار اس غرض سے تمہارے پاس آتا رہوں گا کہ میں نے تمہیں اب تک جو کچھ پڑھایا ہے اس پر علمی مباحثے کر کے مزید اضافہ کر دوں۔"

یہ واقعہ راز نہیں رہا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ابن علی کے پاس خضر آتے ہیں۔ اس کا علم اس عہد کے صوفی ابوبکر وراق کو بھی ہو گیا۔ وہ آپ سے ملنے آئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عرض کیا۔ "ابن علی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے پاس خضر تشریف لاتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ درست ہے بلکہ میں نے علم ہی ان سے حاصل کیا ہے۔"

ابوبکر وراق نے کہا۔ "تب پھر ان سے میری ملاقات کرا دیجیے۔ اس وقت میں یہی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "خضر ہفتہ میں ایک بار میرے پاس آتے ہیں۔ میں ان سے اجازت لے لوں اس کے بعد آپ کو ان سے ملوا دوں گا۔"

ابوبکر وراق چلے گئے۔ اس ہفتے جب حضرت خضر ان سے ملنے آئے تو آپ نے ان کے آگے ابوبکر وراق کی درخواست پیش کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا۔ "جس باغ میں عورت نے آپ کو مبتلائے معصیت کرنا چاہا تھا۔ آپ جمعے کی شب ابوبکر وراق کو لے کر آ جایئے، وہیں ملاقات ہو جائے گی۔"

آپ نے ابوبکر وراق کو مطلع کر دیا اور جمعہ کی شب یہ دونوں اس باغ میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک درخت کے سائے میں ایک بہت بڑا تخت بچھا ہوا تھا اور وہاں معلوم نہیں کس چیز کی روشنی ہو رہی تھی جس سے پورا باغ روشن ہو رہا تھا۔ تخت پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی تخت چھوڑ دیا۔ نیچے آ گئے اور ان دونوں کی تعظیم کو چند قدم ان کی طرف بڑھے اور ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر لے گئے اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا پھر کچھ دیر بعد یکے بعد دیگرے چالیس بزرگ اور آ گئے۔ ان کے لیے کھانا کہاں سے آیا تھا کسی کو کچھ پتا نہ تھا لیکن ان دونوں نے کھانے کے بعد متفقہ کہا۔ "ہم نے ایسا کھانا کہیں اور نہیں کھایا۔"

ابوبکر وراق نے سکوت اختیار کیا اور ابن علی اور حضرت خضر آپس میں باتیں کرنے لگے لیکن یہ دونوں کس زبان اور کس موضوع پر باتیں کر رہے تھے ابوبکر وراق نہیں سمجھ سکے۔ اب ابوبکر وراق کو ابن علی کے مرتبے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے ابن علی کی صحبت میں مستقلاً اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

اس دوران آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا اور آپ نے خدا کی لو لگا کے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ آپ کبھی کبھی کچھ لکھنا شروع کر دیتے۔ اس طرح کچھ عرصے بعد اچھے خاصے صفحات ہو گئے۔ آپ تنہائی میں ان کا مطالعہ کرتے تو اکتا جاتے اور ان صفحات کو ضائع کرنے کی سوچنے لگتے۔ آخر ایک دن ابوبکر وراق سے کہا۔ "ابوبکر! میں نے مختلف اوقات میں جو بے کار کام کیا ہے، اب اسے ضائع کرنا چاہتا ہوں۔"

ابوبکر نے پوچھا۔ "کون سا بے کار کام حضرت؟"

آپ نے اپنے صفحات ابوبکر کے حوالے کر دیے اور کہا۔ "انہیں دریائے جیحون میں پھینک آیئے۔"

ابوبکر نے پوچھا۔ "ان صفحات پر لکھا کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں مختلف اوقات میں معلوم نہیں کیا کچھ لکھتا رہا ہوں، اب جو پڑھا تو انہیں اس لائق نہیں سمجھتا کہ اپنے پاس رکھوں اور میرے خیال میں ان کی بہترین جگہ دریائے جیحون کی لہریں ہیں۔"

ابوبکر ان صفحات کو اپنے گھر لے گئے اور ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ چند ہی صفحات پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچ کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ علم کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اسے دریائے جیحون کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر ابوبکر نے وہ صفحات محفوظ کر لیے۔

کئی دن بعد آپ نے ابوبکر سے پوچھا۔ "ابوبکر، وہ صفحات کیا ہوئے؟"

ابوبکر نے جواب دیا۔ "حضرت! دریائے جیحون میں پھینک آیا۔"

آپ نے کہا۔ "خوب! تمہارا گھر دریائے جیحون ہے، یہ بات آج ہی معلوم ہوئی۔"

ابوبکر آپ کے کشف پر حیران رہ گئے اور شرمندگی سے عرض کیا۔ "حضرت! مجھے ان صفحات کے مطالعے سے بڑی مدد حاصل ہوئی اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں کیوں ضائع کروں، میں خود کو بہت گناہ گار محسوس کروں گا۔"

آپ نے کہا۔ "نہیں ابوبکر، انہیں اپنے پاس مت رکھو اور دریائے جیحون میں پھینک آؤ کیونکہ اس خرافات کی اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

ابوبکر نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی اور وہ صفحات اپنے گھر سے لے کر دریائے جیحون کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابوبکر یہ صفحات دریا برد کرتے ہوئے دکھ محسوس کر رہے تھے لیکن حکم کی تعمیل بھی بہت ضروری تھی۔ مجبوراً با دل ناخواستہ انہیں دریا میں پھینک دیا۔ یہ صفحات پانی پر بکھر گئے۔ اسی وقت دریا کی سطح پر ایک صندوق نمودار ہوا، اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ یہ سارے اوراق ایک ایک کر کے اس میں چلے گئے اور آخر میں صندوق بند ہو گیا اور صندوق دریا کی تہ میں چلا گیا۔ ابوبکر کو ان صفحات کی غرقابی کا بڑا ملال تھا لیکن اس دکھ میں یہ حیرت بھی شامل تھی کہ یہ صندوق کیسا تھا اور اس کے ڈھکنے کا کھلنا اور اوراق کا اس میں سما جانا اور ڈھکنا بند ہو کر صندوق کا دریا کی تہ میں بیٹھ جانا، آخر یہ سب کیا تھا؟ لیکن یہ جو کچھ بھی تھا، اس کا ابن علی کے سامنے ذکر کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

کئی دن بعد آپ نے ابوبکر سے پوچھا۔ "ابوبکر! وہ صفحات دریا برد کر دیے تھے؟"

ابوبکر نے جواب دیا۔ "حضرت! میں نے انہیں اسی دن دریائے جیحون کے حوالے کر دیا تھا۔"

آپ نے پوچھا۔ "وہ صفحات پانی کی لہروں پر منتشر ہوئے تھے یا نہیں؟"

ابوبکر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ "حضرت! میں کیا عرض کروں؟ میں نے وہاں جو منظر دیکھا اسے بیان کرنے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

آپ نے کہا۔ "نہیں، ڈرو مت۔ جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو، میں ناراض نہیں ہوں گا۔"

ابوبکر نے پورا واقعہ دہرا دیا، بولے۔ "حضرت! یہ واقعہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

آپ مسکرانے لگے، اس کے بعد آپ نے کہا۔ "ابوبکر! اندر جا کر صندوق کھولو اور اس میں سے وہ صفحات نکال لاؤ۔"

ابوبکر اندر گئے اور صندوق سے وہ صفحات نکال لائے۔ یہ وہی صفحات تھے جنہیں وہ دریائے جیحون میں پھینک آئے تھے۔ ابوبکر حیران و پریشان صفحات لے کر آپ کے پاس لے آئے اور کہا۔ "حضرت! میں تو پاگل ہو جاؤں گا، ایک راز سے پردہ اٹھتا نہیں کہ دوسرا مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ آخر یہ اسرار کیا ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے استاد حضرت خضر ان صفحات کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا آنا نہیں ہو رہا تھا، مجبوراً میں نے ان کو دریائے جیحون کے ذریعے ان کے پاس بھیج دیا چنانچہ جب انہوں نے میرے صفحات پڑھ لیے تو واپس کر دیے۔"

لیکن کچھ عرصہ بعد آپ اپنی تحریروں سے واقعی دل برداشتہ ہو گئے اور ساری تحریریں دریائے جیحون میں پھنکوا دیں لیکن اسی شام کو وہ تحریریں لیے ہوئے حضرت خضر ان کے پاس پہنچے اور کہا۔ "ابن علی! یہ تم نے کیا کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "استاد محترم! جب میں ان صفحات کو پڑھتا ہوں تو اپنی بے بضاعتی اور جہالت پر شرمسار ہونے لگتا ہوں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں دریا برد کروا دوں۔"

حضرت خضر نے کہا۔ "یہ غلط کیا تم نے، تمہیں اپنے یہ صفحات محفوظ رکھنا چاہئیں کیونکہ یہ کارآمد ہیں اور دوسروں کے لیے بے حد مفید۔ اس لیے میں انہیں تمہارے پاس لے آیا۔"

آپ حج کرنے تشریف لے گئے اور وہاں طواف کعبہ کے دوران گریہ سے بہت برا حال ہو گیا۔ جب واپس تشریف لائے تو ان کی کٹیا میں ایک کتیا نے بچے دے رکھے تھے۔ آپ اس کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ وہ خود سے چلی جائے تو بہتر ہے انہیں دھتکارنا نہ پڑے لیکن کتیا نہیں ہلی۔ آپ نے پوری رات وہاں کھڑے ہو کر گزار دی۔

اس محلے میں ایک ایسے بزرگ بھی رہتے تھے جو ابن علی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس بات سے حسد کرتے تھے کہ لوگ ان کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ ان بزرگ کو سلام کرتے تو وہ منہ پھیر کر نفرت سے سلام کا جواب دیتے۔ ان بزرگ کو جب یہ معلوم ہوا کہ کتیا نے آپ کی جھونپڑی میں بچے دے رکھے ہیں جس کی وجہ سے آپ بے حد پریشان ہیں تو بہت خوش ہوئے۔

آپ نے اپنی رہائش دوسرے حصے میں کر لی اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ کتیا دھتکارے بغیر ہی چلی جائے۔ اسی کشمکش میں ستر دن گزر گئے۔ کتیا کے بچے بڑے بڑے ہو گئے اور جب وہ خود دوڑنے بھاگنے کے لائق ہو گئے تو کتیا انہیں لے کر چلی گئی۔

آپ نے اس حصے کو خوب صاف کیا، دھویا اور اس میں دوبارہ رہائش اختیار کی۔

اسی دن بڑے میاں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ "اے نادان شخص! تو محمد بن علی سے بلاوجہ نفرت کرتا ہے حالانکہ یہ وہ شخص ہے جو کسی کا برا چاہتا ہی نہیں، یہاں تک کہ اس نے سترہ راتیں اسی انتظار میں گزار دیں کہ کتیا کو دھتکارنا نہ پڑے۔ جب وہ خود سے چلی گئی تو ابن علی نے اپنی رہائش گاہ کو دوبارہ کام میں لیا۔" یہ بزرگ اس خواب کے بعد فوراً آپ کے پاس پہنچے اور قدموں میں گر کر دیر تک معافی مانگتے رہے۔

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! تم نے کون سا قصور کیا ہے جو میں معاف کردوں۔ تم نے اپنے دل میں شرمندگی محسوس کرلی، میرے اور تمہارے لیے یہی کافی ہے۔"

☆☆☆

آپ کے دونوں دوست ایک عرصہ بعد سفر سے واپس آئے تو وہ بہت بڑے عالم بن چکے تھے۔ انہیں اپنی علمیت پر بڑا ناز تھا اور ان دونوں نے یہ سوچا تھا کہ ترمذ پہنچ کر محمد بن علی کو شرمندہ کریں گے کہ تم نے منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہے اور ہم دونوں علم حاصل کرکے واپس بھی آگئے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ اب وہ دلائل سے ابن علی کو لاجواب کردیا کریں گے لیکن جب ترمذ والوں سے یہ سنا کہ ابن علی کے علوم کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کرسکتا تو حیرت ہوئی اور جب ان دونوں نے آپ سے ملاقات کی اور ابن علی کو اس سے کہیں زیادہ پایا جتنا سنا تھا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ دونوں دوستوں کا علم منقولی اور معقولی تھا جبکہ ابن علی منقولی اور معقولی علوم کے ساتھ ہی باطنی علوم بھی رکھتے تھے۔

دونوں دوستوں میں سے ایک نے آپ کے ساتھ حسد کا سلوک کیا اور اس کوشش میں رہنے لگا کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو ابن علی کو شرمندہ کیا جائے لیکن اس قسم کا موقع ہاتھ آنا آسان نہیں تھا۔ وہ دوست آپ کے پاس آنے جانے والوں کو ورغلانے لگا۔ وہ کہتا۔ "ابن علی کو آتا ہی کیا ہے؟ میں نے تو علوم کی تحصیل میں بغداد اور دوسرے کئی شہروں کا سفر کیا ہے، مصیبتیں اٹھائی ہیں اور سختیاں جھیلی ہیں لیکن ابن علی ترمذ سے باہر تک نہیں نکلے پھر ان کی علمیت میرے مقابلے میں کیا ہوسکتی ہے اور تم لوگ اپنی اندھی عقیدت سے انہیں معلوم نہیں کیا کچھ سمجھنے لگے ہو۔"

لوگ آپ کے دوست کی باتیں سنتے اور آپ کے گوش گزار کردیتے کہ آپ نے اپنی آستین میں ایک خطرناک سانپ پال رکھا ہے، اس سے جلد از جلد پیچھا چھڑا لیجیے ورنہ یہ کسی روز بری طرح آپ کو ڈس لے گا۔

آپ نے جواب دیا۔ "میرا دوست اگر سانپ ہے تو یہ سانپ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا اور نہ ہی میں اس سانپ سے ڈرتا ہوں۔"

مریدوں اور ارادت مندوں نے خاموشی اختیار کرلی اور دوست آپ کی کاٹ میں رہا۔ اب آپ اپنے دوست پر بہت زیادہ مہربان رہنے لگے تھے۔ اس کا بڑا خیال رکھتے اور یہ کوشش کرتے کہ وہ آپ کی کسی بات پر آزردہ نہ ہو۔

آخر ایک دن وہ بہت شرمندہ ہوا اور کہا۔ "ابن علی! میں تمہارا دوست ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے یہ کب کہا کہ تم میرے دشمن ہو؟"

دوست نے شرمندگی سے کہا۔ "لیکن کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے پاس رہائش کیوں اختیار کی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں جانتا ہوں۔"

دوست نے پوچھا۔ "تم کیا جانتے ہو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ تم اپنے دنیاوی علوم کے زہر کا شکار ہوگئے ہو اور چاہتے ہو کہ مجھے میرے مریدوں اور ارادت مندوں میں کسی بات پر شرمندہ کرو۔"

دوست نے کہا۔ "جب تمہیں میرے ارادوں کا علم تھا تو تم نے خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی بلکہ تم نے اس دوران میری زیادہ عزت کی ہے، آخر کیوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تم نے مجھ سے حسد کیا، معلوم نہیں کس چیز پر۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر مجھ میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو میرے دوست میں نہیں ہے تو مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ میں نے تمہاری ناراضی کا جواب ناراضی سے کیوں نہیں دیا؟ کیا میں تم سے حسد کرتا؟ اگر کرتا تو کس بات پر حسد کرتا؟ ان حالات میں میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ محبت سے پیش آؤں۔"

دوست آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔

آپ سجدے میں گر کر مناجات کرنے لگے۔ "خدایا! اگر میں نے اپنے کسی فعل سے تجھ کو ناراض کیا ہے اور تو نے مجھے صبر پر آمادہ کر دیا ہے تو تو مجھ سے اس مصیبت کو دور فرما دے اور جس کو میری بات ناگوار گزری ہو اس کو اس سے دور فرما دے۔"

آپ نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ آپ جو عبادت کرتے ہیں اس میں آپ کا نفس پورا ساتھ نہیں دیتا۔ انہوں نے پورے ذوق وشوق اور انہماک سے عبادت گزاری شروع کر دی اور نفس کے خلاف جدوجہد کرتے رہے لیکن ہر بار یہی محسوس ہوا کہ وہ کامیاب نہیں رہے۔ آخر عاجز آ کر آپ دریائے جیحون کے کنارے پہنچ گئے اور وہاں رات کے سناٹے میں عبادت میں مشغول ہو گئے نصف رات کے بعد وہ مایوس ہو گئے کیونکہ نفس برابر سرکشی پر مائل رہا۔ آپ نے اس سلسلے میں حضرت خضر کی راہنمائی چاہی لیکن کچھ دیر کے لیے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حضرت خضر نے بھی دست کشی اختیار کر لی ہے۔ آپ نے عاجز آ کر دریا میں چھلانگ لگا دی کہ اس سے تو موت ہی بہتر ہے لیکن جیسے جیسے آپ ڈوب جانے کی کوشش فرماتے موجیں آپ کو اوپر ہی اوپر رکھتی تھیں یہاں تک کہ دریا کی چند سرکش اور تیز لہروں نے آپ کو ساحل پر لا ڈالا۔ آپ نے بڑی رقت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے مالک الله العالمین! تیری ذات کتنی پاکیزہ ہے کہ جس نے میرے نفس کو نہ تو فردوس ہی کے لائق چھوڑا اور نہ ہی جہنم کے لائق۔ میں تیرا شکریہ کس طرح ادا کروں۔"

آپ نے شادی کر لی کہ شاید نفس اسی طرح قابو میں آجائے لیکن وسوسے اور اس نوع کے دوسرے خیالات آپ کو پریشان کرتے رہتے۔ آپ بے حد پریشان رہنے لگے۔ آپ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور اس نام کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوعبداللہ قرار پائی۔

آپ کے ضبط واحتیاط کا یہ حال تھا کہ اپنی بیوی کے سامنے بھی ناک وغیرہ صاف نہیں کرتے تھے۔ کسی بزرگ نے آپ کے ضبط واحتیاط کا ذکر کسی شخص سے کیا تو وہ آپ کو دیکھنے چلا آیا۔ آپ سے مل کر وہ آپ کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور کسی قسم کی بات چیت نہیں کی۔ آپ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ "تیرا مجھ سے کوئی کام ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، بس یونہی دیدار کو چلا آیا۔"

آپ نے کہا۔ "تیری صورت پر تو کچھ اور ہی لکھا ہے۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "میری صورت پر کیا لکھا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

آپ نے اسی وقت اس کے سامنے اپنی ناک صاف کی اور کہا۔ "اے شخص! تو نے میرے بارے میں جو کچھ سنا ہے، درست ہے اور اب یہ جو کچھ دیکھ رہا ہے یہ ظاہر ہے، میرا اظہار کیونکہ اسرار شاہی ظاہر کر دینے والا مقرب بارگاہ نہیں رہتا۔"

ایک بار آپ سخت بیمار ہو گئے۔ اس بیماری نے آپ کو اس لائق بھی نہ رکھا کہ اوراد و وظائف کے معمولات کو بخیر جاری رکھ سکتے۔ ایک دن بڑی بے بسی سے سوچا کہ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو میرے اوراد و وظائف میں کمی نہ ہوتی، کچھ اضافہ ہی ہوتا۔ آپ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ آپ ان سیٹیوں کی آواز میں کھو گئے اور اس دوران یہ محسوس کیا کہ ان سیٹیوں کی آوازوں میں کوئی ان سے کہہ رہا ہے۔ "اے ابن علی! تو کتنا نادان انسان ہے جو اللہ کی مصالح پر اعتراض کر رہا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ تیرا کام سہو اور میرا کام مراعات پر منحصر ہے۔"

آپ اس آواز سے بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ واستغفار کرنے لگے۔ اس کے بعد آپ نے عبادت وریاضت میں اضافہ کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر کافی ہو چکی تھی اور عورت والے واقعے کو چالیس سال گزر چکے تھے۔ آپ خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لیے طبابت کرنے لگے تھے۔ صبح، دوپہر، شام غرضیکہ جب دیکھیے لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے اور لوگ آپ سے دعاؤں کی خواہش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایک دن آپ تخلیے میں بیٹھے ماضی کی سیر کر رہے تھے، یکے بعد دیگرے سارے ہی مناظر سلسلے وار گزرنے لگے۔ اس میں اس عورت کا بھی خیال آیا۔ آپ نے گھبرا کر سوچنا چھوڑ دیا اور اللہ اللہ کرنے لگے۔ اسی دن شام سے ذرا پہلے مریضوں نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ آپ نہایت توجہ سے ان کا حال پوچھتے، معائنہ کرتے اور اس سے فارغ ہو کر نسخہ لکھ دیتے۔ انہی مریضوں میں ایک عورت بھی تھی۔ یہ عورت ہذیان جیسی کیفیت کا شکار تھی اور اس وقت اس کی عمر ساٹھ یا پینسٹھ سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ آپ نے عورت سے پوچھا۔ "تیری یہ کیفیت کب سے ہے؟"

عورت نے آپ کو غور سے دیکھا، بولی۔ "یہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ میری یہ حالت کب سے ہے؟ یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں اپنی عمر کے کس حصے میں ہذیان کا شکار نہیں تھی۔"

آپ نے کہا۔ "اچھا یہی بتا دیجیے۔"

عورت نے کہا۔ "ابن علی! مجھے تو تم بہت ہی سیدھے معلوم ہوتے ہو، کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے تجھے پہچانا کیوں نہیں، تو وہی زلیخا ہے جس نے جوانی میں مجھے گناہ کی ترغیب دی تھی اور میں بچ نکلا تھا۔"

عورت ہنسنے لگی، بولی۔ "وہ بھی کیا دن تھے؟ بخدا میں آج بھی انہی دنوں کے لطف اور لذیذ تصورات کے سہارے زندگی کے بقیہ شب و روز گزار رہی ہوں ورنہ اب رہ کیا گیا ہے مجھ میں؟"

آپ نے کہا۔ "اچھا اب تو ایک بات بتا مجھے۔ چالیس سال پہلے باغ میں، میں نے خود کو بہ مشکل بچایا تھا۔ اب جب تو خود اپنی اس حرکت پر غور کرتی ہے تو کیسا محسوس کرتی ہے؟ شرمندہ ہوتی ہے یا نہیں؟"

عورت زور زور سے ہنسنے لگی، بولی۔ "شرمندگی؟ کیسی شرمندگی، کس بات کی شرمندگی؟ میں تو آج تک اس ناکامی پر افسوس کرتی رہتی ہوں کہ آخر میری تدبیر میں وہ کون سا نقص باقی رہ گیا تھا کہ جس نے مجھے ناکام رکھا تھا۔ خواہش وصال جس نے مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ میں تنہا اس باغ تک چلی گئی تھی۔ آج بھی حسرت بن کر میرے دل میں جاگزیں ہے۔"

آپ نے لاحول پڑھی اور کہا۔ "اس کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دل پر واقعی مہر لگا دی ہے اور اس کو بدل دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔"

اس عورت نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ "کیا تو نے اس ناکامی پر جو میری ہی نہیں، تیری بھی ناکامی تھی، آج تک کوئی افسوس محسوس نہیں کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی ناکامی پر نہیں، اس غلطی پر ضرور افسوس کیا تھا کہ میں نے اس دن تجھے اتنا وقت کیوں دیا تھا آخر؟ فوراً ہی کیوں نہیں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

عورت نے کہا۔ "اگر تو اب بھی راہ راست پر نہیں آیا اور اسی انداز میں سوچ رہا ہے جس طرح چالیس سال پہلے سوچا کرتا تھا تو میں تجھ سے اپنا علاج نہیں کرواؤں گی کیونکہ میرے خیال میں تو خود ایک کہنہ مرض کا شکار ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھے شفا دے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اور تیرا مرض یہ ہے کہ تو اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے، جس سے صحت یابی کو بیماری اور بیماری کو صحت یابی سمجھتی رہتی ہے۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔"

عورت ہنستی، قہقہے مارتی چلی گئی لیکن آپ کے دل میں ایک طوفان برپا کر گئی۔ پرسکون تالاب میں پتھر پھینک کر ہلکورے پیدا کر گئی۔ اس دن آپ بہت پریشان رہے۔ آپ کے نفس نے ایک بار پھر سرکشی اختیار کی اور آپ غیر ارادی طور پر سوچنے لگے۔ "کیا یہ عورت درست کہتی تھی کہ چالیس سال پہلے مجھے جو ایک شاندار موقع ملا تھا کہ میں اس سے حظ وصل اٹھاؤں اور میں گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ کیا میں نے بھاگ کر غلطی نہیں کی تھی؟ اگر میں لطف اندوز ہو لیتا اور اس کے بعد توبہ کر لیتا تو کیسا رہتا؟ شاید یہ میری بہت بڑی غلطی اور بھول تھی۔ یہ عورت درست ہی کہتی تھی کہ میں نے غلطی ہی کی تھی جو فائدہ اٹھائے بغیر ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

رات دیر تک اسی طرح سوچتے رہے لیکن جب صبح بیدار ہوئے اور رات کی باتوں کا خیال آیا تو اپنے دل میں بے حد نادم ہوئے۔ وہ خود پر لعنت ملامت کرنے لگے کہ انہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ وہ اسے ایک بڑا گناہ خیال کر کے گھر سے نکل گئے اور تین دن تک پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر چوتھے دن آپ نے خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ "اے ابن علی! تمہاری خجالت اور پشیمانی ہمیں بہت پسند آئی اور اسی صلے میں تمہیں اتنا بڑا مرتبہ ملا ہے۔ اب تو تمہیں اس پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ تم اداس اور ملول نظر آ رہے ہو۔"

ابن علی نے کہا۔ "میں خوش ہوں اور اس لیے خوش ہوں کہ میرا رب خوش ہے۔"

اسی دن شام کو آپ نے وعظ میں فرمایا۔ "لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ خناس کیا چیز ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا۔ "نہیں، ہم لوگ نہیں جانتے کہ یہ خناس کیا چیز ہے۔ آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے کہا۔ "میں ضرورت بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ تم سب کو خناس کی بابت کچھ بتا دیا جائے۔"

لوگ خاموشی سے آپ کا وعظ سننے لگے۔
آپ نے فرمایا۔ "لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابلیس لعین کہاں رہتا ہے؟"
لوگوں نے جواب دیا۔ "ہمیں نہیں معلوم، آپ ہی ارشاد فرمائیں۔"
آپ نے کہا۔ "ابلیس کی جائے قیام نفس ہے۔ اس لیے سارے ہی برگزیدہ لوگ ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کی خطائیں معاف کر دی تھیں اور یہ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے تھے تو ابلیس آدمی کی شکل میں حوا کے پاس پہنچا تھا کہ: اے نیک بی بی! چند دنوں کے لیے میرے بیٹے خناس کو اپنے پاس رکھ لے۔ میں سفر پر جا رہا ہوں جب واپس آؤں گا تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لوں گا۔"
حوا نے اسے رکھ لیا اور جب آدم آئے اور حوا کے پاس خناس دیکھا تو پوچھا۔ "اے حوا یہ کون ہے؟"
حوا نے جواب دیا۔ "خناس، ایک شخص اسے چھوڑ گیا ہے جب واپس آئے گا تو لے جائے گا۔"
آدم نے کہا۔ "حوا! یہ تو نے بہت برا کیا جو خناس کو اپنا مہمان بنالیا۔" اس کے بعد آدم نے خناس کو قتل کر دیا اور اس کے جسم کے ٹکڑوں کو اِدھر اُدھر ڈال دیا۔ شام کو جب ابلیس گھر میں داخل ہوا تو داخل ہوتے ہی اس نے خناس کی بابت پوچھا۔ "حوا! یہ خناس کہاں چلا گیا؟"
حوا نے بڑے افسوس سے کہا۔ "افسوس کہ اسے ضائع کر دیا گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"
ابلیس نے کہا۔ "ایسا نہیں ہوسکتا، میرے خناس کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"
اس کے بعد ابلیس نے خناس کو آواز دی، خناس کی طرف سے فوراً ہی جواب ملا۔ "بابا جان! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" اس کے بعد وہ اچھی ابلیس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ حوا حیران رہ گئیں۔
دوبارہ حوا نے خناس کو پھر رکھ لیا اور آدم نے ایک بار پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے درختوں میں ان ٹکڑوں کو لٹکا دیا۔ ابلیس نے پھر آواز دی اور خناس ایک بار پھر دوڑتا ہوا ابلیس کے پاس پہنچا اور خوشی میں اچھلنے کودنے لگا۔
تیسری بار پھر ابلیس نے خناس کو حوا کے حوالے کر دیا اور چلا گیا۔ اس بار آدم نے خناس کے ساتھ پھر وہی سلوک کیا کہ اس کے ٹکڑے کر کے جلا دیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا لیکن اس دن ابلیس نے جیسے ہی آواز دی راکھ نے خناس کی شکل اختیار کر لی اور ابلیس کے سینے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔
آخری بار خناس جب گھر میں پھر نظر آیا تو آدم نے ذرا زیادہ سختی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے خناس کو قتل کر کے پکایا اور پھر حوا اور آدم نے مل جل کر اسے کھالیا۔
جب ابلیس کو یہ معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا، بولا۔ "اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، میں بھی یہی چاہتا تھا کہ خناس تمہارے جسموں میں داخل ہو جائے، سو داخل ہو چکا۔ اب یہ انسانوں کو تباہ و برباد کرتا رہے گا۔"
یہ داستان سنا چکنے کے بعد ابن علی نے کہا۔ "وہی خناس ہم سب کے سینوں میں موجود ہمیں ورغلاتا، ستاتا رہتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خناس کے بارے میں فرمایا۔ "الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس (وہ خناس جو انسانی سینوں میں وسوسے کرتا رہتا ہے)
اس کے بعد آپ دیر تک لاحول پڑھتے رہے کیونکہ سینے کا خناس آپ کو بہت پریشان کرنے لگا تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے کہ "سو بھیڑیے بکریوں کے گلّے کو اتنا پریشان نہیں کر سکتے جتنا ایک شیطان پوری جماعت کو تباہ کر کے نقصان پہنچا دیتا ہے۔" آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ "خدا کے سوا کسی اور کا شکر نہ کرو اور نہ ہی کسی کے آگے عاجز بنو۔"
آپ جب تک زندہ رہے لوگوں کی روحانی اور جسمانی تکالیف کا علاج کرتے رہے اور جب رخصت ہوئے تو ایک زمانے کو رلا کر رخصت ہوئے چونکہ آپ حکیم بھی تھے اس لیے بعد میں صوفیوں میں ایک فرقہ حکیمیہ کے نام سے پیدا ہوا۔ یہ حکیمیہ محمد بن علی کے مسلک سے تعلق رکھتا ہے اور انہی کے نام پر اس فرقہ کا نام رکھا گیا اور خود آپ کو حکیم الاولیاء کا لقب دیا گیا۔

ماخذ	الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین ابی محمد عبداللہ سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارشکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار

سترھویں صدی کے اکبرآباد میں جو صوفیائے کرام خاص شہرت رکھتے تھے اور مرجع خاص و عام تھے، ان میں خلیفہ ابو القاسم کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی خانقاہ میں جو لوگ حاضری دیتے، علوم باطنی اور ظاہری میں یکتا ہوتے تھے۔ کسی معمولی یا جاہل شخص کے لیے اس دربار میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ جب اکبرآباد کے ایک اور صوفی سید عبداللہ، اللہ کو پیارے ہو گئے تو عبدالرحیم (والد شاہ ولی اللہ) کو عبداللہ ہی جیسے کسی بزرگ کی تلاش ہوئی۔ شاہ صاحب خود کو تنہا اور لاوارث سا محسوس کرنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنی تنہائی اور بے سکونی کو دور کرنے کے لیے کسی دوسرے بزرگ کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جس کسی وضع دار اور لائق شخص سے ملتے یہی ذکر شروع کر دیتے کہ افسوس سید عبداللہ جیسا کوئی اور شخص نہیں مل رہا۔

اسی طرح ایک دن چند بے نیاز انسانوں کی محفل میں یہی بات کہہ دی تو ایک بزرگ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''میاں! یہ کیسی

خلیفہ ابوالقاسم

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ کے نیک بندے اللہ کی ہر آزمائش پر پورا اترنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور شاید یہی ادا اس خالق کائنات کو پسند آتی ہے کہ انہیں اتنی خلقت کے درمیان ایک نمایاں مقام عطا کر دیتا ہے کہ ان کے در پر بادشاہت بھی سر جھکا دیتی ہے مگر ان کی عبادت و ریاضت انہیں دنیا کی کسی آسائش کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتی۔ ایک ولی کی یہی شان ہوتی ہے کہ اسے ہر دم اپنے مالک کی رضا کا خیال رہتا ہے۔

آخرت کے متمنی...... دنیا سے بے پروا ایک ولی کا قصہ



بات کہہ رہے ہو؟ سید عبداللہ اٹھ گئے تو کیا ہوا۔ اسی اکبرآباد میں ایک دوسرے بزرگ بھی موجود ہیں۔ تم ان کے پاس چلے جاؤ۔"
شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ "حضرت! ان بزرگ کا نام اور پتا؟"
جواب ملا۔ "خلیفہ ابوالقاسمؒ۔ مشہور صوفی امیر ابوالعلیٰ کے نامور خلیفہ۔"
شاہ عبدالرحیمؒ اسی وقت اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں اسی وقت ان کے پاس چلتا ہوں۔"
آپ فوراً ہی خلیفہ ابوالقاسمؒ کے پاس روانہ ہو گئے۔ پوچھتے پوچھتے جب منزلِ مقصود پر پہنچے تو کسی نے انہیں خلیفہ کی مجلس میں لے جا کر کھڑا کیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے مجلس پر غائرانہ نظر ڈالی اور خلیفہ ابوالقاسمؒ کو پہچاننے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ان میں کوئی بھی شخص اپنے چہرے مہرے اور قیافے سے خلیفہ ابوالقاسمؒ نہیں لگتا تھا۔ پوری مجلس بھی شاہ صاحب ہی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ کئی بار جی میں آئی کہ اہالیانِ مجلس سے پوچھیں کہ تم میں خلیفہ ابوالقاسمؒ کون ہے؟ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہے۔
آخر ایک شخص اٹھ کر شاہ صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "جناب! آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ "خلیفہ ابوالقاسمؒ سے!"
اس شخص نے کہا۔ "افسوس کہ اس وقت وہ اس مجلس میں تشریف نہیں رکھتے۔"
شاہ صاحب کو بڑی مایوسی ہوئی فرمایا۔ "اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟ اور میں ان سے کس وقت اور کہاں مل سکتا ہوں؟"
اس شخص نے جواب دیا۔ "آپ ان سے اسی وقت اور یہیں مل سکتے ہیں۔ ذرا انتظار کی زحمت ضرور گوارا کرنا پڑے گی۔"
شاہ صاحب مجلس میں ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا۔ "اگر یہ بات ہے اور وہ یہیں کہیں قریب ہی موجود ہیں تو میں ذرا دیر کیا سارا دن اور ساری رات ان کا انتظار کرلوں گا۔"
اسی وقت ایک دوسرا شخص اٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کے درمیان سے گزر کر شاہ صاحب کے پاس پہنچا اور کہا۔ "لیکن آپ انتظار کیوں کریں، میرے ساتھ چلیے میں اسی وقت ملوائے دیتا ہوں۔"
شاہ صاحب گومگو، حیران و پریشان اس شخص کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں خانقاہ کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں راج مزدور اپنے اپنے کام میں مشغول تھے اور ان کے سامنے ایک شخص معمار اور مزدوروں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس شخص نے ہدایت دینے والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جنابِ والا! یہ رہے خلیفہ ابوالقاسمؒ جن کی تلاش میں آپ سرگرداں نظر آتے تھے۔"
یہ باتیں تقریباً کان میں کہی گئی تھیں۔ اس لیے خلیفہ ابوالقاسم نہیں سن سکے۔ یہ شخص سرگوشی میں تعارف کرا کے واپس چلا گیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ خلیفہ ابوالقاسمؒ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے دو ایک بار انہیں سرسری نظر سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ کچھ دیر تو اس انتظار میں کھڑے رہے کہ کوئی مناسب موقع میسر آجائے تو بات شروع ہو۔ لیکن ایسا موقع ہاتھ نہیں آیا۔
کچھ دیر بعد خلیفہ ابوالقاسمؒ نے شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ اور فارسی کا شعر پڑھا۔

هر کرا ذرهٔ وجود بود
پیش هر ذره در سجود بود

(جسے ذوق و وجدان سے ذرہ بھر بھی نعمت حاصل ہے وہ کائنات کے ہر ذرے کو لائق سجدہ سمجھے گا)
شاہ صاحب نے عرض کیا۔ "حضرت! میری یہ مجال نہیں کہ میں آپ کے شعر یا کلام میں فی نکالوں لیکن اس خاکسار نے اس شعر کو یوں پڑھا ہے۔"

هر کرا ذرهٔ شهود بود
پیش هر ذره در سجود بود

(جسے شہود باری تعالیٰ کی نعمت کا ذرا سا عرفان حاصل ہو وہ ذراتِ عالم کو مسجود تصور کرلے گا)
خلیفہ ابوالقاسمؒ چونک پڑے اور حیرت سے کہا۔ "صاحبزادے! میں نے جن صحیح نسخوں کا اب تک مطالعہ کیا ہے، ان میں شہود کی جگہ وجود ہی دیکھا ہے معلوم نہیں تم نے شہود کہاں پڑھ لیا۔"
شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ "خاکسار نے بھی اب تک جتنے نسخے دیکھے ہیں ان میں سب میں شہود ہی نظر آیا۔"

خلیفہ نے شاہ صاحب کو نہایت توجہ سے دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتے ہی رہے پھر فرمایا۔ ''معلوم ہوتا ہے تم علم سے بھی بہرہ مند ہو۔''
شاہ صاحب نے کہا۔ ''آپ کا خیال درست ہے لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میرا علم راہِ حق میں ضرررساں ہے تو میں اس سے توبہ کرنے کو تیار ہوں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، علم ہر شخص کے لیے نہ تو نافع ہے اور نہ نقصان دہ۔'' اس کے بعد آپ نے ایک شعر پڑھا۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(علم اگر پرورش جسم و جان کے لیے حاصل کیا جائے تو وہ سانپ کی طرح ہے اور اگر تحصیل علم اور مقصد روح کا ارتقاء ہو تو یہ رفیق راہ ثابت ہوتا ہے)
شاہ صاحب نے معصومیت سے پوچھا۔ ''حضور والا! آپ کا ضمیر مصفا اور روشن ہے، بڑی نوازش ہوگی اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ میرا علم میرے لیے نافع ہے یا نقصان دہ۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''کیا یہ ملاقات پہلی اور آخری ہے؟''
شاہ صاحب نے گھبرا کر کہا۔ ''خدا نہ کرے، اب میں اس در کو نہیں چھوڑ سکتا۔''
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے جواب دیا۔ ''پھر یہ ساری باتیں اسی وقت کیوں؟ پھر بھی ہوجائیں گی۔''
شاہ صاحب اس وقت تو اپنے گھر واپس چلے گئے لیکن دوسرے دن علی الصباح پھر پہنچ گئے اور نہایت عاجزی اور انکساری سے سلام کیا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''صاحبزادے کل میں مکان کی تعمیر میں مشغول تھا اس لیے بات ادھوری رہ گئی تھی۔ بقیہ بات اس وقت ہوجائے گی۔''
شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''کون سی باتیں حضرت؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''شہود اور وجود والی باتیں۔'' پھر پوچھا۔ ''صاحبزادے ذرا یہ تو بتانا کہ اگر وجود کی جگہ شہود ہو تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟''
شاہ صاحب نے کہا۔ ''حضرت! جس شخص کو ذرات عالم میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ جائے گا۔ وہ لامحالہ ہر ذرے کو سجدہ کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔''
خلیفہ نے پوچھا۔ ''لیکن میں نے شہود کی جگہ وجود ہی دیکھا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ لفظ وجود کے ساتھ شعر کی کیا تشریح ہوگی؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''حضور والا! لفظ وجود وجدان کا ہم معنی ہے۔ اس طرح یہ شہود کے قریب المعنی ہے۔ اس لیے اس کا بھی وہی مطلب ہوگا۔ جو ایں عاجز نے شہود کے ساتھ بیان کیا ہے۔''
خلیفہ ابوالقاسمؒ کے چہرے پر شگفتگی طاری ہوگئی۔ چہرہ کھل گیا، فرمایا۔ ''صاحبزادے! تم ہر روز حاضری دیا کرو۔''
اب شاہ صاحب کو چونکہ حاضری کی اجازت مل گئی تھی اس لیے نہایت مستعدی اور پابندی سے حاضری دینے لگے۔
خلیفہ ابوالقاسمؒ ان پر بے حد مہربانیاں فرمانے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے ارادتمندوں میں حسد پیدا ہوگیا اور وہ شاہ صاحب سے جلنے لگے۔

☆☆☆

خلیفہ ابوالقاسمؒ کا لنگر عام تھا جس سے مسافر اور حاجت مند دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ خانقاہ کے گودام اشیائے خوردنی اور اجناس سے بھرے رہتے تھے، کہیں چاولوں کا ذخیرہ تھا تو کہیں گیہوں بھرا ہوا تھا، کسی حصے میں آٹے کی بوریاں رکھی رہتی تھیں۔ نمک مرچ، سبزیاں، گھی، مویشی وہاں کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی۔ کسی بھی چیز کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی وافر مقدار آجایا کرتی تھی۔ چنانچہ آپ کو یہ فکر بھی لاحق نہ ہوتی کہ کم ہونے والی چیز کو کہاں سے اور کس طرح فراہم کیا جائے۔
مآل اندیش کارندوں نے آپ سے کئی بار درخواست کی کہ چیزوں کا حساب کتاب رکھا جائے اور جو چیز جب بھی کم ہو اس کی مزید فراہمی کا فوری بندوبست ہونا چاہیے۔
لیکن آپ اپنے مشیر کارندوں سے کبھی بھی اتفاق نہ کرتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ میں کل کی فکر کا سرے سے قائل ہی نہیں

اور یہ بات انسان کے بس کی بھی نہیں کہ وہ مشیت ایزدی کے خلاف اپنی مرضی، خواہش اور کوشش سے کوئی کام سرانجام دے سکے۔

ایک کارندے نے عرض کیا۔ ''حضرت! یہ دنیا ہے یہاں تو کل کی فکر کرنا ہی پڑے گی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''کل کی فکر سے میں کب منع کرتا ہوں، انسان کو کل کی فکر ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن صرف آخرت کی فکر، عقبیٰ کی فکر، عاقبت اور آخرت کی فکر، اگر کسی انسان کو یہ فکر نہیں تو وہ انسان نہیں، جانور ہوگا۔''

کسی دوسرے کارندے نے کہا۔ ''حضرت! میں آپ کو جھٹلانے کی جرأت تو نہیں کرسکتا۔ لیکن میں مآل اندیشی اور مستقبل بینی کی افادیت ضرور واضح کرسکتا ہوں لیکن وہ بھی اجازت کے بعد۔''

آپ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اس کی اجازت دیتا ہوں۔''

کارندے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ مسافروں اور حاجت مندوں کی بھیڑ بھاڑ نے کسی سرائے کا سماں پیش کررکھا تھا۔ لیکن خیال یہ ہے کہ اتنی بھیڑ بھاڑ کا سرائے کی بھیڑ بھاڑ سے مثال دینا سراسر ناانصافی اور زیادتی کی بات ہوگی۔

ایک دن شام سے ذرا پہلے کسی کارندے نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! گھی ختم ہورہا ہے اس کا انتظام فرمادیجیے ورنہ کام ادھورا ہی رہ جائے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر گھی ختم ہورہا ہے تو ہوجانے دو۔ ویسے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ گھی جب تک موجود رہے گا یہ ختم نہیں ہوسکتا یہ میرا ایقان ہے، یہ میرا ایمان ہے۔''

کارندے نے روکھا سامنہ بنا کر عرض کیا۔ ''حضرت! میں کوئی صاحب کشف تو ہوں نہیں، گھی ختم ہورہا تھا اس لیے خدمت میں عرض کردیا۔ کل سے کھانا پانی میں پکے گا۔''

یہ بات اسی طرح ختم ہوگئی۔ کارندہ چلا گیا۔ اور خلیفہ نے فرمایا۔ ''انسان ناشکرا اور جلد باز ہے اس نادان کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آسکتیں۔''

دوسرے دن صبح جب کھانا تیار ہوا تو اس میں گھی نام کو بھی نہ تھا۔ آپ نے بے گھی کے کھانے کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا اور خود بھی کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔ ارادت مندوں اور کارندوں کا خیال تھا کہ وہ خلیفہ کو گھی منگوانے پر مجبور کردیں گے لیکن خلیفہ نے ذرا سی بھی پروا نہیں کی۔

شریر کارندہ صبح سے شام تک کئی بار آپ کو چھیڑتا رہا۔ وہ طنزاً کہتا۔ ''حضرت! آپ تو یہ فرماتے تھے کہ جب گھی ختم ہوجائے گا تو یہاں مزید گھی آجائے گا۔ اب وہ مزید گھی کہاں چلا گیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس وقت تیری باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میرا رب نہ تو مجھے شرمندہ کرے گا اور نہ اس حال میں زیادہ دنوں رکھے گا۔ یہ جو پریشانی ہے عارضی ہے۔ پریشانی کیوں ہے؟ اس کا بھی کوئی خاص جواب نہیں۔ لیکن میں اس کا جواب بھی کسی نہ کسی دن پا جاؤں گا۔''

کئی دن بعد آپ کسی کام سے چھت پر جانے لگے تو کارندوں نے آپ کو روکنا چاہا اور درخواست کی۔ ''آپ اوپر نہ جائیں کیونکہ دنیا کے مسلم الثبوت صوفیوں نے مدتوں آسمان نہیں دیکھا اور اس سے گریز اور پرہیز کرتے رہے ہیں۔ آپ بھی آسمان نہ دیکھیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آج آسمان ضرور دیکھوں گا اس کے بعد توبہ کرلوں گا۔''

کارندے نے بجھے بجھے دل سے عرض کیا۔ ''ہم آپ کی ہر بات مان لیں گے لیکن کہیں تضاد ہوگا تو بے لفظوں میں اس کا اظہار بھی کردیں گے۔''

آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''بے شک، بے شک، اجازت ہے، اجازت ہے!''

آپ خانقاہ کی چھت پر چلے گئے اور ادھر ادھر گھوم پھر کر معلوم نہیں کس شے کی جستجو کرنے لگے۔ اوپر کاٹھ کباڑ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کاٹھ کباڑ کو ادھر ادھر کرنا شروع کردیا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور خالی بوریوں کے نیچے سے کئی سربمہر پیپے نمودار ہوگئے۔ آپ نے ان پیپوں کو ان کی جگہ سے ہٹانا چاہا تو پتا چلا کہ وہ خالی نہیں ہیں۔ ان میں کچھ بھرا ہوا ہے۔

آپ نے ان پیپوں کو وہیں چھوڑا چھت کے نیچے جھانکتے ہوئے کارندوں کو آواز دی۔ ''ارے بھائی! ذرا اوپر تو آنا۔''

کئی کارندے آپ کی آواز سن کر چھت پر پہنچ گئے۔

آپ نے انہیں پیپوں کے پاس کھڑا کر دیا اور فرمایا۔ ”ذرا دیکھ کر بتانا تو کہ ان پیپوں میں کیا بھرا ہوا ہے؟“
کارندوں نے پیپوں کو ہلایا اور اوپر کے تیرتے ہوئے حصوں پر ناک رکھ دی اور سونگھ سونگھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔
آپ نے فرمایا۔ ”ان میں کیا رکھا ہے بتاتے کیوں نہیں؟“
کارندوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور پھر خاموش رہے۔
آپ نے قدرے سختی سے پوچھا۔ ”کیا تم قوت گویائی سے محروم ہو چکے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟“
کارندے نے مردہ آواز میں جواب دیا۔ ”حضرت! ان پیپوں میں گھی بھرا ہوا ہے۔“
آپ نے حیرت سے کہا۔ ”گھی! گھی کہاں سے آ گیا؟ ذرا ایک بار پھر سونگھو، یہاں گھی کہاں سے آئے گا۔“
دوسرے کارندے نے جواب دیا۔ ”حضرت! ان پیپوں میں گھی بھرا ہوا ہے۔“
آپ نے گھی کے پیپے چھت سے نیچے پہنچا دیے اور خود بھی نیچے اتر آئے۔ جملہ کارندوں کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ ”یہ گھی کس نے پہنچایا تھا؟“ کچھ دیر تک تو جواب کا انتظار کیا۔ جب جواب نہیں ملا تو پھر بولنا شروع کیا۔ ”میں جانتا ہوں یہ گھی کس نے اور کیوں چھپایا تھا۔ یہ گھی اس لیے چھپایا گیا تھا کہ میری غیر مآل اندیشی کا مذاق اڑایا جائے۔ مگر تم نے خود مشاہدہ کیا کہ جب تک یہ چھپایا ہوا گھی یہاں موجود رہا۔ ہم سب گھی سے محروم رہے۔ اب جب یہ گھی خرچ ہو جائے گا تو خدا مزید گھی کا انتظام فرما دے گا۔“
آپ نے جو فرمایا تھا، حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ جب یہ گھی بھی ختم ہو گیا تو گھی کی آمد کا سلسلہ جاری ہو گیا۔
ایک دن مریدوں نے آپ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ...... پریشان اور مضطرب پھر رہے ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پریشانی کا سبب دریافت کر لیتا۔ اس وقت خلیفہ ابوالقاسمؒ گویا بڑی عجلت میں تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ ”حضرت! کیا بات ہے؟ آپ پریشان پریشان سے نظر آتے ہیں اس کا کوئی خاص سبب ہے یا یوں ہی......؟“
خلیفہ نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! میں حج کرنا چاہتا ہوں۔ بس اس فکر نے پریشان کر رکھا ہے، دعا کرو، خدا میری مراد برلائے۔“
شاہ صاحب نے عرض کیا۔ ”حضرت! میری یہ مجال کہ میں آپ کے لیے دعا کروں۔“
خلیفہ نے کہا۔ ”اس میں مجال کی کیا بات، تم میرے لیے دعا کرو کہ میں حج کی سعادت حاصل کر لوں!“
کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ خلیفہ ابوالقاسمؒ سفر حج کے لیے روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کے ارادت مندوں نے حسب حیثیت نذرانے پیش کرنا چاہے مگر آپ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ ایک نادار ارادت مند نے تخلیے میں ایک چونی پیش کی اور عاجزی اور شرمندگی سے کہا۔ ”حضرت اس سے زیادہ میری حیثیت نہیں ہے، خدا کے لیے اسے قبول فرما لیجیے۔“
آپ نے اپنے نادار مرید کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کچھ تامل کے بعد کہا۔ ”گو کہ میں نذرانے قبول نہیں کرتا ہوں چونکہ اس چونی میں تیرا بے پایاں خلوص شامل ہو چکا ہے جس سے اس کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔“
آپ نے چونی لے لی اور اس کو اپنے بازو پر باندھ لیا۔
آپ نے سورت سے جہاز پکڑا۔ جہاز کے ہم سفروں نے بہت جلد آپ کی حیثیت اور مرتبے کا اندازہ لگا لیا۔ وہ سب آپ کے ارد گرد جمع رہنے لگے۔ یہ لوگ آپ کی مجلس میں مختلف موضوعات پر بحث کرتے رہتے۔ ان مباحثوں میں خلیفہ نہیں شریک ہوتے تھے۔
ایک دن ان میں جہاز کا کپتان بھی شامل ہو گیا۔ اس نے حاضرین سے پوچھا۔ ”کیا آپ سب تصوف سے دلچسپی رکھتے ہیں۔“
یہاں کا ہر شخص تائید میں بولا۔ ”الحمدللہ! ماشاءاللہ۔ ہم لوگ آپ کی صحبت میں کیوں بیٹھتے ہیں؟ اس کی بس سب سے بڑی وجہ ہے کہ ہم سب یہیں سکون پاتے ہیں اور اسی سکون کی خاطر ان کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“
کپتان زور زور سے ہنسنے لگا۔ سارے مرید اس کی ہنسی پر ہکا بکا رہ گئے۔
ایک نے پوچھا۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟“
کپتان نے جواب دیا۔ ”میں اس پر ہنس رہا ہوں کہ درویشوں اور اللہ والوں کی بابت معلوم نہیں کیسی کیسی افواہیں پھیلی

ہوئی ہیں۔"
مرید نے پوچھا۔ "کیا آپ ان پر یقین نہیں رکھتے؟"
کپتان نے ایک بار پھر سرد مہری سے جواب دیا۔ "جناب والا! میں ان بے کار، نا قابل اعتبار اور فرسودہ دیرینہ خرافات پر کس طرح یقین کرلوں۔"
مریدوں کو غصہ آ گیا، بولے۔ "کپتان! اپنی زبان کو قابو میں رکھو ورنہ ہم تجھے سمندر میں پھینک دیں گے۔"
کپتان بڑا نڈر تھا، بولا۔ "حضرت! پہلے میری بات خوب اچھی طرح سن لیجیے اس کے بعد کچھ کہیے سنیے۔"
ٹھنڈے مزاج کے ایک مرید نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا۔ "بھائیو، ذرا صبر و تحمل سے کام لو اور اس کپتان کی بھی سن لو۔ یہ ہم سے کہنا کیا چاہتا ہے اور یہ تصوف اور صوفیائے کرام پر کیوں یقین نہیں رکھتا۔ یہ ساری باتیں پہلے معلوم تو ہو جائیں۔"
تند خو مرید نے کہا۔ "میں اس گمراہ اور عاقبت نا اندیش کی اب ایک بات بھی نہیں سنوں گا۔ آؤ اس کے پاس سے ہٹ جائیں۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ارادت مندوں کو ہٹا دیا اور خود کپتان کے پاس جا کھڑے ہوئے، پوچھا۔ "ہاں بھئی! یہ تنازعہ کس بات پر ہوا؟ تیری سمجھ میں کیا بات نہیں آرہی ہے؟"
کپتان نے جواب دیا۔ "صوفی جی! میں نے کئی صوفیوں کی بابت یہ سنا ہے کہ اپنے روحانی زور سے وہ دریا یا سمندر کے پانی پر چلنے لگے۔ دوسرے اس کو مان سکتے ہیں لیکن میں ماننے کو تیار نہیں، کیونکہ پانی پر چلنا انسانی اختیار میں نہیں یہ فضول خوش اعتقادیاں اور خوش فہمیاں ہیں جو نادانوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے کپتان سے پوچھا۔ "بس اتنی سی بات ہے جس نے تجھے تصوف اور صوفی سے برگشتہ کر دیا؟"
کپتان نے جواب دیا۔ "ہاں صوفی جی! یہ اتنی سی بات نہیں ہے، بڑی اہم بات ہے۔"
خلیفہ نے سمندر کی سطح پر ابھرتی بیٹھتی موجوں کی طرف دیکھا اور کپتان سے کہا۔ "یہ تماشا تو میں بھی دکھا سکتا ہوں، اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔"
کپتان نے حیرت سے خلیفہ کی طرف دیکھا۔ "آپ دکھا سکتے ہیں۔ یعنی آپ بھی پانی کی سطح پر چل پھر سکتے ہیں؟"
خلیفہ نے جواب دیا۔ "ہاں! اس میں کوئی خاص بات نہیں۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ بات کرتے ہوئے جہاز کے کنارے پر چلے گئے اور ایک بار پلٹ کر کپتان کی طرف دیکھا۔ "دیکھ میں پانی کی سطح پر جا رہا ہوں تو خود بھی دیکھ اور انہیں بھی دکھا دے جو تیری ہی طرح اس پر یقین نہیں رکھتے۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اپنی بات پوری کی اور ساتھ ہی سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ کپتان نے چیخنا شروع کر دیا۔ "لوگو! دوڑو، اس درویش نے جوش میں آ کر پانی میں چھلانگ لگا دی ہے۔ خدا اس پر رحم کرے، یہ تو خوامخواہ مارا گیا۔ میں نے اس سے بلا وجہ ایسی باتیں کیں جس سے یہ جوش میں آ گیا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔"
جس جس نے کپتان کی آواز سنی، دوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔ سبھی کی نظریں کپتان کی نظروں کے تعاقب میں سمندر کی ایک خاص سطح پر ٹک گئیں۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سطح پرسکون تھی۔
خلیفہ ابوالقاسمؒ کے ایک ارادت مند نے کپتان کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو جھٹکے دے دے کر پوچھا۔ "کیا تو نے انہیں دھکا دے دیا ہے، بتا! پیر و مرشد کہاں چلے گئے؟"
کپتان نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ "میں انہیں کیوں دھکا دیتا؟ وہ اپنی مرضی سے یہ دکھانے کے لیے سمندر میں کود گئے کہ وہ بھی بڑے بڑے صوفیائے عظام کی طرح سمندر کی سطح پر چل پھر سکتے ہیں۔"
مرید نے رونا شروع کر دیا۔ "کپتان! تو کچھ بھی کہہ، میں تیرے بیان پر یقین نہیں کروں گا۔ تو نے پیر و مرشد کو ضرور دھکا دیا ہے۔ اب تو انہیں نکال بھی، ورنہ میں تجھ کو دھکا دے دوں گا۔"
کپتان گھبرایا۔ کیونکہ اب دوسرے صوفی بھی کپتان کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے ارادے صحیح نظر نہیں آتے تھے۔ کپتان نے بھاگنا چاہا مگر سبھوں نے اسے محاصرے میں لے لیا۔ کپتان نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "بھائیو! اگر تم نے میرے ساتھ زیادتی کی اور مجھے سمندر میں پھینک دیا تو یہ بھی سمجھ لو کہ پھر اس جہاز کا خدا حافظ۔ یہ بھی ڈوب جائے گا اور جب یہ ڈوب جائے گا تو تم سب ڈوب جاؤ گے اور جب تم سب ڈوب جاؤ گے تو مجھے اپنے ڈوبنے کا کیا ملال؟ کیا خوف؟"

مریدوں نے کہا۔ "کچھ بھی ہو ہم تجھے معاف نہیں کریں گے۔"
انہوں نے کپتان کو پکڑلیا اور اس کو جھلانا شروع کر دیا تاکہ اسے دور پانی میں پھینک دیں لیکن اسی وقت انہوں نے پانی کی سطح پر خلیفہ ابوالقاسمؒ کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے منع کر رہے تھے کہ کپتان کو مت پھینکو، میں آرہا ہوں۔
مریدوں نے کپتان کو تو چھوڑ دیا لیکن خود تماشائے حیرت بن گئے۔ معتقد اور غیر دونوں ہی حیرت زدہ اور مبہوت خلیفہ ابوالقاسمؒ کو دیکھنے میں مشغول تھے۔
کپتان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اپنے آس پاس موجود لوگوں سے پوچھا۔ "کیا میں سچ مچ خلیفہ ابوالقاسمؒ کو سمندر کی سطح پر چلتے پھرتے دیکھ رہا ہوں یا میں حالت خواب میں ہوں؟"
ایک مرید نے جواب دیا۔ "تو بیدار ہے اور حالت بیداری میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا ہے۔"
کپتان نے اپنے گال میں ناخن چبھو دیے اور کھال کو نوچ کر خون نکال لیا۔ سیاہ خون کو انگلی سے پونچھ کر دیکھا۔ گال میں سوزش ہونے لگی تھی۔ اس تکلیف نے اسے یقین دلایا کہ وہ حالت بیداری میں یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔
خلیفہ ابوالقاسمؒ پانی کی سطح پر چلتے ہوئے جہاز کے پاس آگئے اور بہ آواز بلند کپتان سے پوچھا۔ "کپتان! تو اب بھی مطمئن ہوا یا نہیں؟"
کپتان نے جوب دیا۔ "یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں کون ہے جو دیکھ کر بھی منکر ہی رہے گا۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے عاجزی سے پوچھا۔ "تو میں اب بھی یہیں رہوں یا اوپر آجاؤں؟"
کپتان نے درخواست کی۔ "حضرت! آپ خدا کے لیے اوپر آجائیے۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ جہاز کی سطح پر اس طرح آگئے جس طرح کوئی شخص خشکی پر سے جہاز میں سوار ہو جائے۔
کپتان نے آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور روہانسی آواز میں کہا۔ "حضرت! میں شرمندہ ہوں، میں نے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا، مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔"
آپ نے جواب دیا۔ "تمہیں ایسی باتیں ضرور کرنا چاہیے تھیں کیونکہ اگر یہ باتیں نہ کرتے تو تم اپنے شبہات اور وسوسوں کا جواب کس طرح حاصل کرتے۔"
کپتان اس درجہ مرعوب اور متاثر ہو چکا تھا کہ بے چون و چرا حلقۂ نیازمنداں میں داخل ہو گیا۔
☆☆☆
جب آپ حرمین شریفین میں پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ پر کوئی توجہ نہ دی۔ ان دنوں وہاں ایک ایسا شخص بھی رہ رہا تھا جسے حضرت غوث الاعظمؒ کی کلاہ مبارک تبرکا سلسلہ وار اپنے آباؤ اجداد سے ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا۔
اس شخص نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ حضرت غوث الاعظمؒ تشریف فرما ہیں اور اس شخص سے کچھ کہہ رہے ہیں۔
اس نے دریافت کیا۔ "حضرت! آپؒ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"
غوث الاعظمؒ نے جواب دیا۔ "اے شخص! خلیفہ ابوالقاسمؒ اکبرآبادی ہند کو میری کلاہ دے دے جو تیرے پاس وراثتاً چلی آئی ہے۔"
اس شخص نے پوچھا۔ "حضرت! یہ کون شخص ہے؟ میں تو اس سے واقف بھی نہیں ہوں۔"
غوث الاعظمؒ نے جواب دیا۔ "یہ شخص ہندوستان کے پائے تخت اکبرآباد سے آیا ہے اور ہندیوں میں بڑی شہرت اور عظمت رکھتا ہے۔"
جب یہ شخص بیدار ہوا تو تردد میں پڑ گیا۔ اس کو شیطان ورغلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ ان بزرگ کا امتحان لے لیا جائے۔
کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کلاہ کے ساتھ ایک جبہ بھی خلیفہ ابوالقاسمؒ کے حوالے کرے گا اور یہ دیکھے گا کہ انہیں ان دونوں کی بابت کچھ معلوم بھی ہے یا نہیں، اگر وہ جبے کو بھی قبول کر لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ خلیفہ ابوالقاسمؒ دنیادار اور کشف سے خالی شخص ہیں۔ اور اگر کچھ ہیں تو وہ جبہ نہیں قبول کریں گے۔

دوسرے دن صبح یہ شخص خلیفہ ابوالقاسمؒ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی دیر تک انہیں تلاش کرتا رہا۔ آخر ہندی زائرین میں انہیں پالیا۔ اس نے خلیفہ کو سلام کیا اور ان کے قدموں میں احترام سے بیٹھ گیا۔

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اس شخص سے پوچھا۔ ''ہاں بھائی بتا۔ تو میرے پاس کیوں آیا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! رات میں نے حضرت پیرِ دستگیرؒ کو خواب میں دیکھا وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کا کلاہ اور جبہ، دونوں چیزیں میں آپ کے حوالے کردوں۔ چنانچہ میں انہیں لے کر حاضر ہوگیا۔ آپ قبول فرمائیں۔''

آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''لاؤ، میری چیزیں میرے حوالے کردو۔''

اس شخص نے کلاہ اور جبہ آپ کے حوالے کردیا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے دونوں چیزیں احتیاط سے رکھ لیں۔ وہ شخص بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا شکار قابو میں آچکا ہے۔ اس کو ذلیل اور رسوا کرنا چاہیے۔ وہ خاموش بیٹھا رسوا کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ ''ہندی بزرگ! آپ جس مرتبے کے بزرگ ہیں اس کی اس عہد میں دوسری کوئی مثال نہیں ملے گی۔ میں اب لوگوں کو بتاتا ہوں کہ ایک ہندی بزرگ بھی ہم میں تشریف فرما ہیں اور وہ اتنے بلند مرتبہ ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے اپنے دونوں تبرکات آپ کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا۔ آج میں کلاہ اور جبہ دے کر بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کیونکہ...... حق بہ حق دار رسید۔''

آپ نے پوچھا۔ ''ان باتوں کا مطلب؟ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

اس شخص نے کہا۔ ''بات سیدھی سی ہے، کلاہ اور جبہ میرے پاس آپ کی امانت تھے۔ آج میں نے یہ امانت آپ کو دے دی۔ تو سکون حاصل ہوا۔ اب اس خوشی میں ایک کام آپ بھی کریں۔''

خلیفہ نے جواب دیا۔ ''ضرور کروں گا، بتاؤ......''

اس شخص نے کہا۔ '' آپ اس خوشی میں رؤسائے شہر کی دعوت کردیجیے تاکہ ان سے میں آپ کا تعارف کرادوں۔''

خلیفہ نے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔ آپ مہمانوں کو کل بلا لیجیے۔''

وہ شخص خوشی خوشی اپنے گھر گیا اور شہر کے رئیسوں کو دعوتِ طعام دے دی۔ دوسرے دن جب رؤسائے شہر اس شخص کے ساتھ خلیفہ ابوالقاسمؒ کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خلیفہ نے زبردست دعوت کا انتظام کر رکھا ہے۔ پوری فضا کھانے کی خوشبو سے مہک رہی تھی، آپ نے مہمانوں کے ہاتھ دھلوائے اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ رؤسائے شہر ان کی زیارت کرکے بہت خوش تھے۔

کسی رئیس نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ ہندی درویش ہیں۔ آپ کے پاس مال و زر کے نام پر شاید کچھ بھی نہ ہو۔ اگر میرا یہ خیال درست ہے تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ دعوت کا اہتمام کیوں کر ہوا اور آپ کے پاس جب کچھ بھی نہ تھا تو یہ خرچہ کس طرح اور کہاں سے ہوا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کل ان صاحب نے مجھے دو تبرک دیے تھے کلاہ اور جبہ، کلاہ تو میرے پاس موجود اور محفوظ ہے لیکن جبہ میں نے فروخت کردیا اور اسی کی قیمت سے میں نے یہ دعوت کردی۔''

اس شخص کا غصے سے برا حال ہوگیا۔ اشتعال میں آکر کانپنے لگا، چیخ کر بولا۔ ''حضرات! میں نے اس ہندی فقیر کو اہل اللہ سمجھا تھا مگر یہ تو ریاکار مکار نکلا۔ میں نے اس کو غوث الاعظمؒ کے دو تبرکات کلاہ اور جبہ اس لیے دیے تھے کہ میں نے ان دونوں متبرک چیزوں کا اسے اہل اور مستحق سمجھا تھا۔ مگر اس نے ان کی قدر نہیں جانی...... افسوس۔''

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے بھی اس شخص کو ڈانٹ دیا۔ ''چپ رہ مکار انسان! جو چیز تبرک تھی اس کو میں نے محفوظ کرلیا ہے اور جس چیز کو تو نے میرا امتحان لینے کے لیے دیا تھا۔ اسے میں نے فروخت کردیا اور اس کی رقم سے میں نے رؤسائے شہر کی دعوت کردی۔''

آپ نے جو کچھ فرمایا اور جس انداز میں فرمایا اس سے اس شخص پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ مبہوت اور سحر زدہ ہو گیا، پوچھا۔ ''کیا آپ جبے کی قدر و قیمت سے واقف تھے؟''

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے جواب دیا۔ ''اگر واقف نہ ہوتا تو میں تیرا جبہ فروخت ہی کیوں کرتا؟''

یہ شخص کسی عامل کے معمول کی طرح اصل حقیقت اہلِ مجلس کے سامنے بیان کر گیا اور کہا۔ ''حضرات! اس ہندی فقیر نے جو کچھ کہا ہے درست ہے، جب حضرت غوث الاعظمؒ نے خواب میں مجھ کو ہدایت کی کہ میں ان کی کلاہ اس فقیر کے حوالے کردوں تو معاً میرے دل میں خیال آیا اس درویش کا امتحان لینا چاہیے۔ چنانچہ اس خیال سے میں نے کلاہ کے ساتھ اپنا جبہ

میں اس فقیر کے حوالے کر دیا۔ اس خدا رسیدہ بزرگ نے میرا جبہ بیچ کر آپ سب کی دعوت کر دی اور اس طرح مجھ کو شرمندہ و خوار کر دیا، میں اس سے معافی کا طلبگار رہوں اور اس کی بزرگی اور عظمت کے آگے اپنا سر جھکاتا ہوں۔"

☆☆☆

مکے کے دوران قیام ہی میں وہاں قحط پڑ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انسانوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں اور آدمی آدمی سے ڈرنے لگا۔ چند ہندی مسافروں نے فیصلہ کیا کہ آپ کی خدمت میں دعا کے لیے حاضری دی جائے، چنانچہ سب بھوکے آپ کے پاس پہنچے، آپ نے انہیں بٹھا کر پوچھا۔ "بھوکے ہو کھانا کھالو، بقیہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

وہ سب بھوکے تو تھے ہی، کھانے کا نام سن کر باچھیں کھل گئیں کہا۔ "بے شک، پہلے ہم سب کھانا کھائیں گے اس کے بعد اپنا مدعا عرض کریں گے۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ نے ان سب کے آگے بریانی لگا دی اور اس کے ساتھ ہی چند دوسرے کھانے بھی رکھ دیے۔ بھوکوں نے اسے ذرا سی دیر میں چٹ کر دیا اور خلیفہ سے کہا۔ "حضرت! اس قحط زدہ شہر میں اتنے اچھے اچھے کھانے آپ کو کہاں سے میسر ہوئے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "جو خدا اکبر آباد میں ہے میرے ساتھ وہی یہاں بھی ہے اور اس وقت بھی میرے ساتھ ہے، پھر مجھے کوئی تکلیف کیوں ہو؟"

لوگوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

آپ نے پوچھا۔ "تم نے اپنی آمد کا مدعا نہیں بیان کیا۔"

ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "حضرت! خدا سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں قحط سالی سے بچائے اور اس عذاب کو واپس لے لے۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں دعا تو اسی وقت کیے دیتا ہوں لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس قحط سالی میں اللہ کی مشیت بھی شامل ہے اور میں اللہ کی مشیت کے خلاف اس سے کچھ کیوں مانگوں؟"

لوگوں نے اصرار کیا۔ "حضرت! یہ تو ممکن ہے کہ اللہ آپ کی دعا سے ناراض ہو جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ خدا آپ کو آزردہ اور مایوس کر دے۔"

آپ نے دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور گڑگڑانے لگے۔ "خدایا! اس عاجز اور گنہگار کی شرم رکھ لے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ تو مجھ پر مہربان ہے اور تیری نظر کرم میرے حال پر قائم و دائم رہتی ہے، ان کے اس خیال اور خوش فہمی کی لاج رکھ لے۔ میں تجھ سے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہتا۔ دوسروں کے لیے مانگ رہا ہوں، اس کو پورا کر دے۔"

آپؒ دعا مانگ ہی رہے تھے کہ کسی نے آ کر اطلاع دی کہ شام سے اناج اور اشیائے خورونوش سے لدے ہوئے اونٹوں کا قافلہ آ گیا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر شگفتگی دوڑ گئی۔

☆☆☆

حج کر کے واپس آئے تو اکبر آباد والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن یہ خود ان باتوں سے بے نیاز تھے۔ ان کے اپنے معمولات اور اصولوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مہمان نوازی، آنے والوں کی قدر و منزلت اور اسوۂ حسنہ پر عمل درآمد، گفتگو کرتے تو خوش اخلاقی اور خوش کلامی کا دامن نہ چھوڑتے، کبھی کبھی کسی ایسی بات پر غصہ بھی آ جاتا کہ ان کی مجلس میں بیٹھنے والا روشناس اور زود فہم کیوں نہیں۔

ایک دن صبح صبح خلیفہ ابوالقاسمؒ حمام کے لیے گھر سے نکلے تو گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس وقت کسی طرف سے شاہ عبدالرحیمؒ بھی پہنچ گئے۔ آپ ان کو دیکھتے ہی مسکرانے لگے، شاہ عبدالرحیمؒ نے سلام کیا۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ "صاحبزادے! خیریت تو ہے؟ گرمی بڑی غضب کی پڑ رہی ہے۔"

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ "جی پیر و مرشد، میں نے سوچا آپ کی خانقاہ میں سکون ضرور ملے گا۔"

خلیفہ ابوالقاسمؒ ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر خانقاہ میں واپس گئے۔ یہاں انہیں بٹھا دیا اور مکان میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب مکان کے اندر سے نمودار ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں چمچہ، پیالہ، گلاب کا عرق اور بتاشے کا بوجھ تھا۔ ان چیزوں

کو شاہ صاحب کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔
''میاں صاحبزادے! جی چاہے تو بتاشے کھالو۔ ورنہ عرق گلاب میں بتاشے ڈال کر شربت بنالو اور پی جاؤ۔''
وہاں خلیفہ کا ایک دوسرا مرید بھی موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''جناب والا! میں تو صرف بتاشے کھاؤں گا۔''
خلیفہ نے اس مرید پر کوئی توجہ ہی نہیں دی اور شاہ عبدالرحیمؒ سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تمہیں کیا چیز پسند ہے، شربت یا محض بتاشے؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''شربت!''
خلیفہ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں...... وجہ؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''جب آپ اندر سے چمچہ، عرق گلاب اور پیالہ لے کر آئے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ کی خواہش میں بھی یہی بات مخفی ہے کہ ان چیزوں کو بھی کام میں لایا جائے۔''
خلیفہ خوشی سے اچھل گئے اور سامنے موجود مریدوں کو مخاطب کیا۔ ''صاحبان! یہ نوجوان عبدالرحیم بلا کا ذہین اور سمجھ دار ہے، اس کی ہر بات میں حکمت موجود ہے۔''
شاہ صاحب نے عرض کیا۔ ''حضرات! میں نے تو یہ سوچ کر شربت پسند کیا ہے کہ پیرومرشد ایک غیر معمولی شخص ہیں ان کا کوئی کام خالی از علت نہیں ہوسکتا۔ آپ حمام تشریف لیے جارہے تھے، اس ناچیز کو دیکھ کر واپس آگئے اور عرق گلاب، چمچہ، پیالہ اور بتاشے اندر سے لے آئے۔ میں خفقان کا مریض ہوں اور اس مرض میں یہ چیزیں مفید ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پیرومرشد میری خاطر مدارات کے ساتھ ہی میرا علاج بھی کررہے ہیں اور پھر حمام کے بعد یہ شربت پیرومرشد کو فائدہ پہنچاتا ہے بس اسی خیال سے میں نے شربت پینا پسند کیا۔''
خلیفہ نے کہا۔ ''سبحان اللہ! سبحان اللہ! اللہ اور زیادہ عقل و فکر مرحمت فرمائے۔'' پھر اس مرید کو مخاطب کیا۔ ''او نادان اور کم عقل شخص! تو میری مجلس سے چلا جا کیونکہ تیرے جیسوں کے لیے اس مجلس میں اٹھنا بیٹھنا حرام ہے، تو اسی وقت یہاں سے چلا جا۔''
شاہ صاحب نے خوشامد کی۔ ''پیرومرشد! اس کو مجلس سے نہ نکالیے کیونکہ یہ باہر نکل کر مجھ کو بددعائیں دے گا اور میں ان بددعاؤں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''
خلیفہ نے کچھ سکوت اختیار کیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ ''اس بار صاحبزادے تمہاری وجہ سے اس کو معاف کیے دے رہا ہوں اگر آئندہ ایسی حماقت کی تو میں کھڑے کھڑے اپنی مجلس سے نکلوادوں گا۔'' پھر مرید سے کہا۔ ''تو نے میری بات اچھی طرح سن لی ہے یا نہیں......؟''
مرید نے سہمے لہجے میں کہا۔ ''حضرت! یہ آج کی سرزنش میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جا! میں نے تجھے معاف کردیا۔''
مرید خوشی سے دیوانہ ہوگیا اور تکلف اور احترام کو بالائے طاق رکھ کر رقص شروع کردیا۔
آپ نے فرمایا۔ ''اب بس بھی کر۔''
اس کے بعد آپ حمام تشریف لے گئے۔

☆☆☆

آپ وعظ فرمارہے تھے آپ کے ارادت مند گوش برآواز تھے۔ ہر شخص محو و منہمک تھا لیکن ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے آپ کا وعظ نہیں سنا۔ حالانکہ وہ شخص آپ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔
وعظ ختم ہوا تو لوگ ادھر ادھر جانے لگے۔ آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس مغموم، غائب دماغ اور فکر مند شخص کے پاس جا کھڑے ہوئے، کچھ دیر اس کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ''کیوں میاں سید عبدالرسول کیا بات ہے؟ تم ضرورت سے زیادہ فکر مند نظر آرہے ہو؟''
عبدالرسول کو رونا آگیا، بولا۔ ''حضرت! اب کیا عرض کروں؟ کچھ کہتے نہیں بنتا۔''
خلیفہ نے فرمایا۔ ''نہیں، تم خست سے کام نہ لو۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔''

عبدالرسول نے دوسرے مریدوں کی طرف دیکھا تو ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ کہا۔ ''ان سب کے سامنے کیا عرض کیا جائے؟''

خلیفہ نے ان سب کو باہر نکال دیا اور عبدالرسول سے کہا۔ ''ہاں اب تو بتا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟''

سید عبدالرسول نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے پیر و مرشد کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''حضرت! میری ایک ہی بیٹی ہے، اب وہ بالغ ہو چکی ہے میری معاشی حالت بہت خراب ہے، میں راتوں کو چین سے سو نہیں سکتا، دن میں سکون نہیں پاتا۔ میں چاہتا ہوں اس کا کوئی رشتہ آ جائے تو میں اس فرض سے فراغت حاصل کر لوں لیکن غربت اور افلاس کی وجہ سے کوئی رشتہ بھی نہیں آتا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو پھر تو چاہتا کیا ہے؟''

عبدالرسول نے جواب دیا۔ ''اپنی بیٹی کی شادی۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو دہلی جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں تاکہ میں وہاں کے اہل ثروت اور مخیر حضرات کے در پر سوالی بن کر حاضری دوں اس طرح شاید میرا کام بن جائے۔''

آپ نے کچھ سکوت اختیار فرمایا اور پھر کہا۔ ''اگر تو نے یہ ارادہ ہی کر لیا ہے کہ امراء کے در پر سوالی بن کر صدا لگائے تو سب سے پہلے شاہ عبدالرحیمؒ کے در پر جانا اس کے بعد کہیں اور جانا اور جو چاہے کہنا سننا۔''

عبدالرسول آپ سے جدا ہو کر دہلی پہنچے اور سب سے پہلے شاہ عبدالرحیمؒ سے ملاقات کی۔ عبدالرسول نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا، پوچھا۔ ''بھائی! کیا تم بھی اہل ثروت میں شمار کیے جاتے ہو؟''

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ''نہیں تو! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

عبدالرسول نے ذہن پر زور دیا۔ ''پھر پیر و مرشد نے مجھے آپ کے پاس کیوں بھیج دیا؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''پہلے تم اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔''

عبدالرسول نے اپنی آمد کا مقصد صاف صاف بیان کر دیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کہا۔ ''میاں عبدالرسول! حضرت خلیفہ نے تمہیں میرے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہیں کسی اور کے در پر نہ جانے دوں۔ میں تمہاری مدد ضرور کروں گا کہ تم سوالی بننے کی ذلت سے بچ جاؤ۔ خدا تمہیں معزز و موقر بنائے۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے عبدالرسول کو ایک ہفتہ مہمان بنائے رکھا اور جب واپسی کا ارادہ کیا تو اس حال میں، کہ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر دیا تھا اور شادی کے اخراجات کے لیے معقول رقم کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔

جب عبدالرسول خوشی خوشی واپس پہنچے اور پیر و مرشد کو سارا احوال سنایا تو وہ مسکرانے لگے، فرمایا۔ ''میں نے تجھے شاہ عبدالرحیمؒ کے پاس اسی لیے بھیجا تھا کہ تو میری بات تو سمجھے گا نہیں، شاہ عبدالرحیمؒ کی باتیں جلدی ہی تیری سمجھ میں آ جائیں گی۔''

عبدالرسول پھر رونے لگے۔ لیکن اس بار ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

☆☆☆

ان دنوں اکبر آباد میں اورنگ زیب کے حکم پر فتاویٰ عالمگیری کا کام بڑے زور و شور سے انجام پا رہا تھا، ملک کے بڑے بڑے نامور اور جید عالم اس کام میں شریک تھے۔ ان میں شیخ حامد نامی ایک بزرگ بھی شامل تھے۔ شیخ حامد، شاہ عبدالرحیمؒ کے شریک پیر بھی رہ چکے تھے۔ شیخ حامد کو خوب اندازہ تھا کہ شاہ صاحب کس پائے کے بزرگ اور عالم ہیں۔ شیخ بھاگے بھاگے شاہ عبدالرحیمؒ کے پاس پہنچے اور یہ خوش خبری سنائی کہ فتاویٰ عالمگیری کے کام میں مجھے شامل بھی کر لیا گیا ہے میری خواہش ہے کہ آپ میری اس کام میں مدد کریں میں آپ کا روزینہ مقرر کرا دوں گا۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ''میں اس کا فیصلہ خود نہیں کر سکتا والدہ سے مشورہ کر لوں تو کوئی جواب دے سکوں گا۔''

شیخ حامد نے کہا۔ ''بھائی! مشورہ جس سے چاہو کر لو۔ لیکن یہ کام تمہیں بہر حال کرنا پڑے گا۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے اپنی ماں سے مشورہ کیا تو انہوں نے زور دیا کہ یہ کام ضرور کر لو۔ اس کے بعد ماں نے اس کے فوائد اور نفع رسانی پر ایک شاندار تقریر کر ڈالی۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے جب اپنی ماں کو ادھر راغب دیکھا تو ہامی بھر لی اور شیخ حامد کی وساطت سے فتاویٰ عالمگیری میں روزینہ دار ہو گئے اور کام شروع کر دیا۔ چند دنوں بعد خلیفہ ابو القاسمؒ کی خدمت میں حاضری

دی اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں؟
خلیفہ صاحب نے جواب دیا۔ "یہ کام مت کرو، کیونکہ اس کام میں خرابی یہ ہوگی کہ تم جو کچھ کرنا چاہو گے علما سے ہو کو نہیں ہونے دیں گے اس لیے اس میں تمہاری شمولیت محض روزی کو تو مفید ہوگی مگر اس سے دین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"
شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں نے یہ ناگوار فریضہ محض والدہ کی وجہ سے قبول کیا ہے ورنہ میری طبیعت ادھر راغب نہ ہوتی تھی۔"
خلیفہ نے کہا۔ "والدہ کی مرضی کو نظر انداز کردو اور اس کام کو بھی ترک کردو۔"
شاہ عبدالرحیمؒ نے حیرت سے خلیفہ کو دیکھا۔ انہیں حیرت تھی کہ اتنا بڑا بزرگ اور عالم ایسی بات کہہ رہا ہے اور ماں کے مرتبے کو نظر انداز کردینے کی بات کر رہا ہے۔ شاہ صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ "حضرت! یہ آپ نے کتنی بڑی بات کہہ دی کہ میں ماں کی مرضی کو نظر انداز کردوں، کیا ماں کے حکم کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔"
خلیفہ نے جواب دیا۔ "ترجمہ: (جب اللہ کا حق آجاتا ہے تو بندوں کے حقوق ساقط ہوجاتے ہیں) یہ اٹل حقیقت ہے اور اس جواز سے ماں کا حکم ساقط ہوجاتا ہے۔"
شاہ صاحب نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ اس حدیث قدسی پر عمل کروں، آپ بھی دعا فرمائیں کہ میں اس میں کامیاب ہوجاؤں۔"
خلیفہ نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ "جاؤ، اللہ تمہاری مشکل آسان کردے گا۔"
شاہ صاحب وہاں سے چلے آئے اور خلیفہ ابوالقاسمؒ کی دعا کے اثر کا انتظار کرنے لگے۔
فتاویٰ عالمگیری کا مسودہ شاہ عبدالرحیمؒ کے سامنے نظر ثانی کے لیے رکھا گیا تو اس میں کسی مسئلے کو پیچیدہ کردیا گیا تھا۔ فتاویٰ کے مرتب اعلیٰ نے اس مسئلے کو کئی کتابوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی تھی اور ہر کتاب کے مفہوم کو ایک دوسرے میں خلط ملط کر کے بیان کرنے کی کوشش میں اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے اس کو پڑھا تو طبیعت مکدر ہوگئی اور اس کے پاس ہی ایک نوٹ لکھ دیا۔
ترجمہ: (جو دین کی سمجھ نہیں رکھتا اس نے یہاں گڑبڑ کردی ہے اور صحیح اس طرح ہے)
ان دنوں اورنگ زیب اس کام پر بڑی توجہ دے رہا تھا اور اکبرآباد میں موجود ہونے کی وجہ سے وہ اس کے مسودے روز پڑھوا کر سنتا تھا۔ سنانے کا کام ملا نظام کے سپرد تھا۔ ایک دن جب مسودہ پڑھ کر سنایا تو شاہ عبدالرحیمؒ کے نوٹ کو اصل متن کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور پوچھا۔ "کیا مطلب؟ وضاحت کی جائے۔"
ملا نظام گھبرا گئے اور عرض کیا۔ "حضور والا! میں نے اس حصے کو پہلی بار پڑھا ہے اور اس پر نظر ثانی کا کام ابھی نہیں ہوا کل اس کا مطلب عرض کرسکوں گا۔" بادشاہ نے اجازت دے دی۔
ملا نظام غصے میں لال پیلے ہوتے ہوئے گھر پہنچے اور شیخ حامد کو طلب کیا۔ ان کے آتے ہی ملا نظام نے انہیں برا بھلا کہنا شروع کردیا، کہا۔ "شیخ صاحب میں نے اس کام میں آپ پر اعتماد کیا اور آپ نے مجھے خوار کردیا۔ آخر یہ حاشیہ کس کی ایجاد ہے؟"
شیخ حامد نے جواب دیا۔ "میں نے نظر ثانی کا کام شاہ عبدالرحیمؒ کے سپرد کر رکھا ہے۔ ان سے معلوم کر کے کچھ عرض کرنے کے قابل ہوسکوں گا۔"
ملا نظام نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس طرح شاہ عبدالرحیمؒ بادشاہ پر اپنی علمیت اور دینداری کا سکہ جمانا چاہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاہ صاحب ہم سب پر سبقت لے جائیں گے اور بہت ممکن ہے کہ انہیں اس کام کا نگران مقرر کردیا جائے۔"
شیخ حامد نے شرمندگی اور خجالت سے اپنا سر جھکا لیا بولے۔ "میں انہیں یہیں بلوا لیتا ہوں اور آپ کے سامنے بات کرتا ہوں اگر آپ کی بات سچ ثابت ہوجائے تو پھر آپ کو یہ اختیار ہوگا کہ انہیں اس کام سے الگ کردیجیے۔"
ملا نظام شیخ حامد کی تجویز سے مطمئن ہوگئے اور کہا۔ "انہیں یہیں اسی وقت بلوا لو۔"
شیخ حامد نے ایک آدمی شاہ صاحب کے گھر روانہ کردیا کہ وہ جس حال میں بھی ہوں انہیں اپنے ساتھ لے آؤ اور ان پر واضح کردو کہ ان کی یہ طلبی بادشاہ کے حکم پر ہوئی ہے۔

آدمی شاہ صاحب کے گھر پہنچا اور اپنے ساتھ لیے چلا آیا۔
ملا نظام نے اس عرصے میں دوسرے علما کو بھی بلا لیا تھا۔ ان سب کے سامنے ملا نظام نے شاہ عبدالرحیمؒ سے پوچھا۔ "جناب! آپ نے یہ کیسا حاشیہ لگا دیا کہ جو دین کی سمجھ نہیں رکھتا اس نے یہاں گڑبڑ کر دی ہے اور صحیح اس طرح ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"
شاہ عبدالرحیمؒ نے متعلقہ مسئلے پر گفتگو شروع کر دی اور ذرا سی دیر میں اس کے ابہام کو دور کر دیا۔ جملہ مفتی لاجواب ہو گئے اور مسئلے کے تیکنیک پن کے قائل ہو گئے لیکن ان سب میں حسد پیدا ہو گیا۔
دوسرے دن ملا نظام نے اورنگ زیب سے شاہ عبدالرحیمؒ کی شکایت کر دی اور کہا۔ "اس سید زادے کو اپنے علم و دانش پر بڑا غرور ہے اور میری ناچیز رائے میں اگر اس جیسے کچھ اور اس کام میں شامل ہو جائیں تو پھر یہ کام کبھی بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے۔"
اورنگ زیب نے پوچھا۔ "اس کو اس کام میں شریک کس نے کیا؟"
ملا نظام نے جواب دیا۔ "شیخ حامد نے، لیکن اب وہ اپنی اس غلطی پر نادم ہے۔"
اورنگ زیب نے کہا۔ "مجھے وہ فہرست دکھائی جائے جو فتاویٰ عالمگیری پر کام کرنے والوں سے تعلق رکھتی ہے۔"
ملا نظام نے اسی وقت فہرست بادشاہ کے روبرو رکھ دی۔ بادشاہ ہر ایک کے بارے میں سوالات کرتا رہا اور آخر میں چند ناموں پر ضرب کا نشان لگا دیا ان میں شاہ عبدالرحیم کا نام بھی شامل تھا۔ جب یہ خبر شاہ صاحب کے پاس پہنچی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ ایک ایسے کام سے نجات مل گئی جو ان کے پیر و مرشد خلیفہ ابوالقاسمؒ اور خود ان کی مرضی کے خلاف تھا۔ شام کو خلیفہ کے پاس پہنچ گئے اور خوش خوش ایک طرف بیٹھ گئے۔ خلیفہ ابوالقاسمؒ نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور کہا۔ "میاں صاحبزادے! کام اسی کو کہتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

☆☆☆

خلیفہ ابوالقاسمؒ شاہ عبدالرحیمؒ کو بلوا کر کہنے لگے۔ "صاحبزادے! شہر کے درویشوں کی زیارت کرتے رہا کرو۔"
شاہ صاحب نے پس و پیش سے عرض کیا۔ "حضرت! میں اپنے آپ کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر ناکام رہتا ہوں کیونکہ کسی اور بزرگ میں وہ کشش ہی نہیں پاتا جو آپ کی ذات میں ہے۔"
خلیفہ نے تاکید کی۔ "لیکن میں جو کہہ رہا ہوں اس پر تمہیں بہرحال عمل کرنا ہے۔"
شاہ صاحب بھی اڑ گئے، کہا۔ "اگر میں نے کسی اور میں آپ جیسی بات محسوس کی تو بے چون و چرا چلا جاؤں گا۔ ورنہ یہیں اسی در پر پڑا رہوں گا۔"
خلیفہ ابوالقاسمؒ نے اپنے خادم کو آواز دی۔ "ذرا ادھر تو آنا۔"
جب خادم آ گیا تو اس کو حکم دیا۔ "شاہ صاحب کی مشائخ چشت کے مشہور بزرگ سید عظمت اللہ کی خدمت میں لے جا ان سے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ ایک درویش کو آپ کی ملاقات کے لیے بھیج رہا ہوں۔"
خادم انہیں لے کر اس محلے میں پہنچ گیا جہاں وہ بزرگ رہتے تھے۔ وہ ان بزرگ کا مکان ہی بھول گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ ادھر ادھر تلاش کرتا رہا۔ اس دوران شاہ عبدالرحیمؒ کی نظر محلے کے ان بچوں پر پڑی جو کھیل کود میں مشغول تھے۔ شاہ صاحب نے ایک بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بچہ تو بزرگ زادہ لگتا ہے، اس سے ان بزرگ کا پتا پوچھو جن سے ہمیں ملنا ہے۔"
خادم نے اس بچے سے سید عظمت اللہ کا پتا پوچھا تو وہ مسکرانے لگا، بولا۔ "میں انہی کا بیٹا ہوں۔"
اس کے بعد وہ ان دونوں کو اپنے گھر لے گیا اور دروازے پر کھڑا کر کے اندر چلا گیا کچھ دیر بعد واپس آیا اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "باوا جان فرما رہے ہیں کہ میں تو بستر علالت پر پڑا ہوں، چلنے پھرنے کی طاقت سلب ہو چکی ہے اور گھر خاندان کی عورتوں سے بھرا ہوا ہے، میں انہیں ہٹا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے سر دست ملاقات نہیں ہو سکتی۔"
ابھی بچے نے یہ جواب دیا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک دوسرا آدمی بھاگا ہوا آیا اور عرض کی۔ "سید صاحب فرما رہے ہیں کہ حضرت خلیفہ کے درویشوں کو بٹھایا جائے، وہ تشریف لا رہے ہیں۔"
اس پیغام کے ذرا دیر بعد ان دونوں نے دیکھا کہ سید عظمت اللہ کی چارپائی دو خادم اٹھا کر لیے چلے آ رہے ہیں، ان دونوں کے پاس چارپائی رکھ دی گئی۔ سید عظمت اللہ لیٹے ہوئے تھے۔ شاہ عبدالرحیمؒ اور خلیفہ کے خادم نے انہیں سلام کیا۔ عظمت اللہ نے

انہیں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''حضرات! میں معذور ہوں جیسا کہ آپ دونوں نے خود ہی ملاحظہ کرلیا ہوگا مگر مجھے بعد میں خیال آیا کہ حضرت خلیفہؒ نے آپ دونوں کو خالی از حکمت نہیں بھیجا ہوگا۔ شاہ عبدالرحیمؒ صاحب! ذرا اپنا حسب نسب تو بتانا۔''

سید عظمت اللہ کا اپنا سلسلہ شیخ عبدالعزیز شکر بار تک پہنچتا ہے اور شیخ عبدالعزیزؒ شکر بار شاہ عبدالرحیمؒ کے جد بزرگوار تھے۔ انہوں نے سید عظمت اللہؒ کو اپنے جد بزرگوار کا نام نہیں بتایا کیونکہ شاہ عبدالرحیمؒ خوب جانتے تھے کہ اگر انہوں نے بتادیا تو سید عظمت اللہؒ ان کی بے حد تعظیم کریں گے اور اس بیماری میں خدمت اور تواضع سے باز نہیں آئیں گے۔

سید عظمت اللہؒ نے شاہ صاحب کے سامنے چند علمی سوال پیش کیے اور کہا۔ ''شاہ صاحب! مجھے ان کے جواب درکار ہیں مرحمت فرمائیں۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں تو آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے فائدے حاصل کروں نہ کہ اس لیے کہ آپ کو فائدہ پہنچاؤں۔''

سید عظمت اللہؒ نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہمیں ان سوالوں پر مامور کیا گیا ہے اور میں اس پر مجبور ہوں کہ ان کے جواب تم سے لوں۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے سوالوں کے جوابات اتنے شاندار دیے کہ سید عظمت اللہ دنگ رہ گئے۔ ان کے جسم کو حرکت ہوئی اور وہ چارپائی کے ایک طرف کھسکنے لگے۔ کھسکتے کھسکتے کنارے تک پہنچے اور پھر پھسل کر نیچے گر گئے اور خود کو شاہ عبدالرحیمؒ کے قدموں میں ڈال دیا اور عاجزی سے کہا۔ ''میں آپ کے احترام کا پابند ہوں، پہلے میں آپ کے نسبی مقام سے واقف نہیں تھا۔ نادانی میں مجھ سے کوتاہی سرزد ہوگئی۔'' پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔ ''آپ کو معلوم نہیں کہ شیخ عبدالعزیز شکر بار قدس سرہ نے میرے دادا کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر میری اولاد میں سے کوئی آپ کے پاس آئے اور ان علمی سوالوں کا یوں جواب دے تو میری امانت اس کے حوالے کردینا چنانچہ آج وہ سب میں آپ کے حوالے کردیتا ہوں۔''

شاہ عبدالرحیمؒ نے دریافت کیا۔ ''اس امانت میں کیا کیا ہے؟''

سید عظمت اللہؒ نے جواب دیا۔ ''چند تبرکات اور اجازت طریقہ۔ میرے جد محترم زندگی بھر تلاش میں رہے وہ ناکامی کے بعد میرے والد کو وصیت فرما گئے۔ والد محترم بھی تلاش و تجسس کے باوجود ناکام رہے اور یہ کام میرے سپرد کردیا، میں بھی آپ کی تلاش میں رہا۔ اس وقت مجھے یہی غم کھائے جارہا ہے کہ اپنی ناکامی کس کے حوالے کر جاؤں، میرا کوئی بالغ فرزند بھی نہیں جس کے حوالے یہ کام کیا جائے۔ لیکن اب میں خوش ہوں صاحب امانت خود ہی خوبی قسمت سے میرے پاس آگیا۔''

اس کے بعد شاہ عبدالرحیمؒ کے سر پر اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھا، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا۔ شاہ عبدالرحیمؒ نے کہا۔ ''حضرت! یہ سارا فیض حضرت خلیفہ ابوالقاسمؒ کا ہے۔ کیونکہ میں یہاں تک انہی کی ہدایت پر پہنچا ہوں اور اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ یہاں تک پہنچانے پر کیوں مصر تھے۔''

شاہ عبدالرحیمؒ یہاں سے اٹھ کر خلیفہ ابوالقاسمؒ کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ عرض کردیا۔ انہیں جو کچھ ملا تھا اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کردیا لیکن خلیفہ نے کچھ بھی نہیں لیا۔ فرمایا۔ ''صاحبزادے! نقد ظاہری جو ملا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کبھی پریشان نہیں رہو گے۔ خوش حالی تمہارا مقدر بن گئی۔ عمامہ کا مطلب یہ ہے کہ سکون قلب کی دولت بھی تمہیں دے دی گئی اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں کوئی کسی کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔''

اس کے بعد خلیفہ نے کچھ شیرینی منگوا کر تقسیم کرادی۔

شاہ عبدالرحیمؒ کو سید عظمت اللہؒ سے تبرکات دلانے کے بعد خلیفہ ابوالقاسمؒ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ گویا ان کے ذمے ایک فرض تھا جس کو پورا کرنا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جب یہ نصب العین حاصل ہوگیا تو وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے اور خالقِ حقیقی سے جاملے۔

ماخذ

سفینۃ الاولیا، شہزادہ داراشکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
تذکرۃ الاولیاء، شیخ فریدالدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔
خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

دیو محل کا قلندر

رحمۃ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی

معلوم نہیں، کیوں اقتدار سے دل بھر گیا اور شان و شوکت اور نمود و نمائش سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ تبریز کی حکومت بیٹے کے حوالے کی اور بہت سارا مال و منال لے کر شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ سب ان کے سامنے رکھ کر دست بستہ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے اور عرض کیا "حضورؒ! آپ کا غلام جلال الدین تبریزی حاضر ہے۔ اس نے حکومت و اقتدار پر لات مار کر حضورؒ کی غلامی کی نیت کر لی ہے۔ آپ اسے عشقِ الٰہی کی آگ میں پھونک دینے کے کرم سے سرفراز فرمائیں!"

شہاب الدین سہروردیؒ کے ارادت مندوں نے اس نووارد کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تبریز کا حاکم اور فقر و فاقے کی زندگی! کتنی متضاد اور محال بات ہے۔ شہاب الدین سہروردیؒ نے انھیں حکم دیا "یہ مال و زر ہم لے کر کیا کریں گے! اسے حاجت مندوں میں خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کر دو!"

جلال الدین نے اپنے مرشد کے حکم کی فوراً تعمیل کر دی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ دونوں ہاتھوں سے لٹا کر فراغت حاصل کر لی۔ دونوں ہاتھ جھاڑ کر مرشد کے روبرو مؤدب کھڑے ہو گئے اور عاجزی سے دریافت کیا "حضرت! غلام نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی، کوئی اور حکم؟"

مرشد نے اس طالبِ عشقِ الٰہی میں معلوم نہیں کیا چیز محسوس کی کہ ارشاد فرمایا "جلال الدین! تجھ میں اب بھی حکومت کی بُو باقی ہے، پہلے اس کا علاج کر، اس کے بعد تو کچھ حاصل کر سکے گا۔"

جلال الدین نے عرض کیا "یہ غلام ہر آزمائش اور ہر کسوٹی سے گزرنے کو تیار ہے بس آپ کے اشارے کی دیر ہے!"

شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا "جلال الدین! تیرے سپرد نمازیوں کے لیے وضو کے پانی اور استنجے کے ڈھیلوں کی فراہمی کی خدمت کی جا رہی ہے اور یہ کام تجھے پورے چار سال تک انجام دینا ہے!"

جلال الدین کی پیشانی پر ناگواری یا کراہت کی خفیف سی شکن تک نہ پڑی۔ پُرشوق لہجے میں جواب دیا "منظور، بہ دل و جان منظور!"

حکم اور حکومت کا خوگر اپنے سرکش اور مغرور نفس کو، مرشد کی طرف سے مفوضہ خدمات انجام دے کر کچلنے لگا۔ شہاب الدین سہروردیؒ نہایت گہری نظروں سے جلال الدین کی لگن کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انھیں زود ہضم اور گرم گرم غذائیں پسند تھیں۔ جلال الدین کو جب اپنے مرشد کی اس پسند کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے سر ایک خدمت اور لے لی۔ بازار سے ایک انگیٹھی خریدی اور ایک بڑے سے تھیلے میں مرشد کی پسندیدہ چیزیں بھر لیں۔ پھر انگیٹھی میں آگ جلائی، اشیا کا تھیلا شانے سے لٹکا لیا اور انگیٹھی سر پر رکھ لی۔ جہاں جہاں شہاب الدین سہروردیؒ جاتے یہ ان کے پیچھے پیچھے خادم کی طرح چلتے۔ اس عجیب حُلیے میں پیر مرشد نے جو دیکھا تو دریافت کیا "جلال الدین! تو نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے خیریت تو ہے؟"

جلال الدین نے جواب دیا "حضورِ والا! غلام نے آپ کی مریدی اور خدمت کا جو جوا اپنی گردن میں ڈالا ہے، ہر طرح اس کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں کس وقت آپ کو کھانے کی اشتہا ہو، اسی خیال

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تذکرۂ صوفیائے بنگال — سوانح عمری خواجگانِ چشت — خواجگانِ چشت — سفرنامہ ابن بطوطہ — انوار الاصفیا

[illegible]

سے یہ ناچیز کھانے کی اشیاء اور روشن انگیٹھی ساتھ لیے پھرتا ہے کہ بوقت طلبی آپ کو گرم گرم کھانا پیش کیا جاسکے۔"

مُرشد نے اس جذبۂ خدمت کو دل ہی دل میں سراہا لیکن زبان سے اظہار نہ کیا۔ ہر وقت جلتی ہوئی انگیٹھی سر پر رکھنے سے بال اور گلے میں لٹکانے سے سینے کے بال اور کھال دونوں جھلس گئے۔

شہاب الدین سہروردیؒ ہر سال حج ضرور کرتے تھے۔ مُریدی اختیار کرنے کے بعد جلال الدین تبریزی بھی ساتھ رہنے لگے۔ دورانِ سفر مُرشد تو اُونٹ پر سوار ہوتے اور جلال الدین پاسِ ادب سے پیدل چلتے رہتے۔ گرم ہواؤں کے تھپیڑے، آگ کی طرح جلتے ہوئے ریت کے ذرات اور کھلے آسمان پر آگ کے گولے کی طرح جہنم کی آگ برساتا سُورج، مکّے اور مدینے کے زائرین کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیتے۔ اس عالم میں کس کی مجال تھی جو پیدل سفر کرسکتا، لیکن جلال الدین نے اس مشکل مشقت کو بھی اپنے جذبۂ شوق سے گلے لگالیا اور اس امتحان میں پُورے اُترے۔ منزل تک پہنچتے پہنچتے پیروں میں چھالے پڑ پڑ کر پھوٹ جاتے اور پیروں کے تلوے اور پنجے خون اور آبلوں کے پانی سے پوری طرح بھیگ جاتے اور جب جلال الدین اس امتحان میں بھی پُورے اُترتے تو شہاب الدین سہروردیؒ کی دُعاؤں سے ان کے دونوں پیر بالکل صحیح حالت میں آجاتے۔

حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے بعد شہاب الدین سہروردیؒ کا قافلہ بغداد میں داخل ہُوا تو انھیں ان کے عقیدت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور فرطِ عقیدت میں تحائف پیش کرنے لگے۔ صبح سے شام تک قیمتی تحائف کا ڈھیر لگ گیا۔ ان ارادت مندوں میں ایک بڑھیا بھی شامل تھی۔ اس نے حضرت سہروردیؒ کی خدمت میں ایک درم پیش کیا۔ رات کو عشا کے بعد آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ "جو تحائف جمع ہوئے ہیں، ان میں جو جس کو پسند آئے اپنے گھر لے جائے کیونکہ وہ احتکار کے قائل نہیں ہیں!"

تمام مرید قیمتی تحائف پر ٹوٹ پڑے لیکن بے غرض، طمع اور حرص سے پاک جلال الدین نے بڑھیا کے ایک درم پر ہی قناعت کرلی۔ آخر میں حضرت سہروردیؒ نے اس کا جائزہ لیا اور کس کے حصے میں کیا آیا۔ آپ نے کسی مُرید سے پُوچھا: "تحائف کے اس انبار سے جلال الدین کے حصے میں کیا آیا؟"

مُرید نے ہنس کر جواب دیا: "صرف ایک درم، جو بڑھیا لے کر آئی تھی۔"

آپ نے جلال الدین کو طلب کیا اور فرمایا: "جلال الدین! اگرچہ بظاہر تو نے ایک درم اٹھایا ہے لیکن لوگ نہیں جانتے کہ زر و جواہر کے اس انبار میں سب سے زیادہ قیمتی بھی ایک درم تھا۔ اللہ تعالیٰ کمی بیشی کو نہیں دیکھتا دل کے اخلاص کو دیکھتا ہے۔ اس نیک بڑھیا نے اس درم کو پورے خلوص اور جوش کے ساتھ پیش کیا تھا اور اس سارے انبار میں جو کچھ تھا وہ ایک درم تھا۔ تو نے وہ درم اٹھا کر دُوسروں کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔"

مُرشد کی زبان سے کلماتِ خیر سُن کر جلال الدین کی آنکھیں نم ہوگئیں اور ان کا دل بھر آیا۔

یہیں ان کی ملاقات ایک ہندی درویش سے ہُوئی۔ ان کا نام بہاء الدین زکریا تھا اور یہ ملتان سے تشریف لے گئے تھے۔ جلال الدین تبریزی ان سے مل کر بہت خوش ہُوئے۔ رفتہ رفتہ ان کی دوستی اتنی بڑھی کہ دونوں علیحدگی میں ایک دُوسرے کی کمی محسوس کرنے لگے۔

مُرشد کی خدمت میں سات سال رہ کر جلال الدین مرتبۂ کمال کو پہنچ گئے اور ان کے رُوحانی کمالات کا چرچا ہونے لگا۔ اسی دوران بہاء الدین زکریا کو حکم ملا کہ ملتان واپس جاؤ اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دو۔

جلال الدین اس خبر سے ملول ہوتے اور خواہش کی کہ انھیں بھی بہاء الدین کے ساتھ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ مُرشد نے اجازت عطا فرمادی اور دونوں دوست ہندوستان روانہ ہوگئے۔

دونوں کا گزر نیشاپور میں ہُوا وہاں مولانا عطار رومی کا قیام تھا اور یہ حلوتِ مرتبت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ جلال الدین تبریزی نے ان سے ملاقات کی لیکن بہاء الدین زکریا ان سے نہیں ملے۔ جب یہ مل کر اپنے دوست بہاء الدین کے پاس پہنچے تو انھوں نے جلال الدین سے پوچھا: "جلال الدین! شیخ عطار سے مل لیے؟"

جلال الدین نے جواب دیا: "ہاں مل لیا" اور خوشی سے ان کا چہرہ تمتما گیا۔

بہاء الدین نے اشتیاق سے پُوچھا: "کیسے ملاقات کے بعد کس درویش کو بہتر پایا؟ اپنے مُرشد شہاب الدین سہروردیؒ کو یا شیخ فریدالدین عطار کو؟"

Scanned with CamScanner

جلال الدین نے خلافِ توقع جواب دیا: "شیخ فرید الدین عطارؒ"۔

بہاء الدین نے حیرانی سے پوچھا: "ان سے کیسی صحبت رہی؟"

جلال الدین نے جواب دیا: "شیخ عطار نے مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ میں نے جواب دیا، بغداد سے۔ انھوں نے سوال کیا۔ وہاں کون درویش مشغولِ حق ہے؟ میں ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا اور خاموش کھڑا رہا۔"

بہاء الدین نے کہا: "تم نے اپنے مرشد حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کا نام کیوں نہیں لیا؟"

جلال الدین نے سچائی کا سہارا لیا، بولے: "میں اس وقت شیخ عطار کی عظمت سے اتنا مرعوب اور متاثر ہو چکا تھا کہ میرا یارائے گفتگو جاتا رہا اور میں بدقسمتی سے اپنے مرشد کو بھی بھلا بیٹھا۔"

بہاء الدین نے افسوس سے کہا: "خوب! جلال الدین! اب ہم دونوں نہ تو ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ ساتھ ساتھ سفر کر سکتے ہیں تم نے خاموش رہ کر پیر و مرشد کی بے عزتی کی ہے جو ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے اور ہم اسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتے!"

جلال الدین نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ بولے: "بابا بہاء الدین! اگر تم علیحدگی پر ہی مُصر ہو تو تمھاری مرضی، ورنہ میں اپنی اس کوتاہی کے عذر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شیخ عطار نے اس وقت میری قوتِ گویائی سلب کر لی تھی اور میں نے ان کے سوال کے جواب میں وہی روش اختیار کی، جس کے وہ خواہش مند تھے۔"

دونوں درویش ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ بہاء الدین زکریا ملتان چلے گئے اور جلال الدین نے دہلی کا رُخ کیا۔ یہ دہلی کے اس عہد کی بات ہے جب یہاں سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی اور حضرت بختیار کاکیؒ کا روحانی فیض ایک نورانی ہالے کی طرح پھیل کر دہلی اور اس کے گرد و نواح پر محیط ہو چکا تھا۔

دہلی پہنچتے پہنچتے انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ حضرت بختیار کاکیؒ ان کے منتظر تھے اور سلطان شمس الدین التمش ان کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے مضطرب اور مستعد تھا۔ جب جلال الدین تبریزی دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستان کے بادشاہ کو استقبال کے لیے موجود پایا۔ التمش نے بڑے جوشِ عقیدت سے انھیں خوش آمدید کہا۔ التمش کے ساتھ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ بھی تھا۔ اس نے جلال الدین تبریزی کی غیر معمولی آؤ بھگت کو حاسدانہ محسوس کیا۔ التمش انھیں شاہی محل تک نہایت اعزاز و احترام سے لایا۔ اس کے بعد اس نے شیخ الاسلام سے مشورے کے طور پر پوچھا: "حضرت تبریزی کو کہاں ٹھہرانا چاہیے؟"

شیخ الاسلام نے حسد سے جواب دیا: "بیت الجن میں!"

سلطان نے کہا: "بیت الجن میں کیوں؟ اس مکان میں جو جن اقامت گزیں ہیں وہ کس طرح حضرت تبریزی کو سکون سے رہنے دیں گے؟"

شیخ الاسلام نے کہا: "اگر جلال الدین تبریزی مردِ کامل ہیں تو جن انھیں نہیں ستا سکیں گے اور اگر یہ سب کچھ ڈھونگ ہے اور ان کا ظاہری فقیری لوگوں کو ٹھگنے کا جال ہے تو انھیں ان کی ریاکاری کی سزا ضرور ملنی چاہیے اور بیت الجن کے اجنہ خود ہی انھیں سزا دے لیں گے۔"

بادشاہ نے کسی حد تک شیخ الاسلام کی بات سے اتفاق بھی کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ: "جلال الدین ہمارے مہمان ہیں ہمیں ان سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔"

شیخ الاسلام نے خاموشی اختیار کی۔ بادشاہ اور شیخ الاسلام کی بات چیت انتہائی رازدارانہ ہو رہی تھی اور اس کا کسی اور کو ذرا بھی علم نہ تھا۔ ابھی دونوں خاموش ہی بیٹھے تھے کہ جلال الدین تبریزی ان دونوں کے پاس آئے اور شیخ الاسلام سے کہا: "نجم الدین! بیت الجن مقفل ہے، اس کی چابی کہاں ہے، لاؤ، ہم اس میں قیام کریں گے!"

بادشاہ معنی خیز انداز میں شیخ الاسلام کی شکل دیکھنے لگا۔ شیخ الاسلام نے بیت الجن کی چابی تبریزی کے حوالے کر دی۔ تبریزی نے یہ چابی اپنے ایک ساتھی درویش کی طرف بڑھا دی اور اسے حکم دیا: "تراب! یہ کنجی لو اور بیت الجن چلے جاؤ۔ اسے کھولو اور دروازے پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند یہ کہہ دو کہ اے قومِ اجنہ! اس مکان میں تم ایک عرصے سے رہ رہے ہو، اب اسے خالی کر دو کیونکہ اس میں جلال الدین تبریزی رہنا چاہتا ہے۔"

تراب نے چابی لی اور بیت الجن کا قفل کھول دیا۔ تراب نے دروازے کے اندر قدم رکھ کر تبریزی کا پیغام بآوازِ بلند سنا دیا اور گلے میں پڑی ہوئی حمائل شریف بیت الجن کی ایک کھونٹی میں لٹکا دی۔ اس کے بعد جلال الدین تبریزی بھی بیت الجن میں داخل ہو گئے اور

اطمینان سے رہنے لگے۔

عام شاہراہ کو چھوڑ کر جلال الدین نے چھوٹی چھوٹی گلیاں اختیار کیں، وہ حضرت بختیار کاکیؒ سے ملاقات کرنے جا رہے تھے۔ انھوں نے عام شاہراہ اس خیال سے ترک کی تھی کہ بڑے اور معروف راستوں میں ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم تھا اور وہ ہجوم سے گھبراتے تھے۔ اسی غیر معروف اور سنسان راہ میں ایک جگہ حضرت بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہو گئی۔ جلال الدین تبریزی ان کے گلے لگ گئے اور پوچھا "بابا بختیار! ہم تم سے ہی ملنے جا رہے تھے، تم کہاں؟"

حضرت بختیار کاکیؒ نے جواب دیا: "ہمیں تمھارے ارادے کی اطلاع ہو گئی تھی اس لیے ہم تمھارے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور تمھیں اس جگہ پالیا!"

دونوں دوست ہنسنے لگے۔

ان واقعات اور جلال الدین کی عزت افزائی کی خبریں برابر شیخ الاسلام کو پہنچ رہی تھیں۔ وہ حسد کی آگ میں بُری طرح جل بھن رہا تھا۔ اس کا دماغ جلال الدین تبریزی کے خلاف سازش کرنے میں مصروف تھا۔ رات بے چینی میں گزارنے کے بعد شیخ الاسلام شاہی محل کی مسجد میں نماز پڑھانے پہنچا۔ یہ مسجد بالائی حصے میں واقع تھی اور یہاں سے جلال الدین کی قیام گاہ کا اندرونی حصہ صاف نظر آتا تھا۔ شیخ الاسلام نے دیکھا کہ جلال الدین نماز کی غرض سے مسجد میں نہیں آئے اور وہ اپنے مکان کے صحن میں نہایت اطمینان سے لیٹے ہوتے تھے اور ایک غلام ان کے پیر دبا رہا تھا۔ غلام نوعمر اور حسین تھا۔ شیخ الاسلام نے یہ ہوش رُبا منظر دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ اس وقت بادشاہ بھی آچکا تھا۔ شیخ الاسلام نے انگشت سے جلال الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "حضور! ذرا ملاحظہ فرمایئے، یہ ہے وہ شخص جس کے زہد اور تصوف کا دُور دُور چرچا ہے۔ مجھے تو یہ شخص بس یُوں ہی سا نظر آتا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا: "شیخ الاسلام! تم تبریزی کے پیچھے مت پڑو کیونکہ ایسا کرنے میں کسی بڑے نقصان کا احتمال موجود ہے!"

اسی دوران مکان کے اندر سے بآوازِ بلند جلال الدین تبریزی کی آواز گونجی، آپ نے فرمایا: "شیخ الاسلام! ابھی تو نے کیا دیکھا ہے اگر ذرا دیر پہلے آجاتا تو تجھے یہ غلام پیر دابتا ہوا نہ ملتا بلکہ یہ ہماری آغوش میں ہوتا۔"

دونوں کی گفتگو بادشاہ نے بھی سُن لی۔ اس نے شیخ الاسلام کو ڈانٹا: "شیخ الاسلام! تم ضرور کوئی ہنگامہ کھڑا کرو گے، ہم تمھیں یہ بات کس طرح بتائیں کہ جلال الدین ایک غیر معمولی انسان ہے اسے چھیڑو مت۔"

لیکن شیخ الاسلام انتہا پسند تھا۔ اس نے اپنے اصل ارادے کو چھپائے رکھا۔

تقریباً دوپہر سے ذرا پہلے گوہر نامی نہایت مشہور گانے والی شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچی۔ شیخ الاسلام گوہر سے بات کرنے لگا۔ شیخ الاسلام بات تو گوہر سے کر رہا تھا لیکن اس کا دماغ ایک خطرناک سازش کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار کچھ کہنے کیلیے زبان کھولنا چاہی لیکن نہیں کھُلی۔ آخر کار ہمت کر کے شیخ الاسلام نے حرفِ مدعا بیان کیا: "گوہر! ہم تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں کیا تو اسے گوارا کرے گی اور اس بات کا حلف اٹھائے گی کہ جو کچھ ہم کہیں گے تو اسے اپنے دل میں کسی کی امانت کی طرح محفوظ رکھے گی!"

گوہر نے جواب دیا: "حضور! حکم تو فرمائیں، پھر دیکھیے گا آپ کی یہ کنیز بجا آوریِ حکم اور اطاعت میں کتنی مستعد اور محتاط نکلتی ہے!"

شیخ الاسلام نے ڈھائی سو سُرخ دینار اس کی خدمت میں پیش کر دیے اور مسکراتے ہوئے کہا: "گوہر! یہ حقیر سا نذرانہ ہے بقیہ ڈھائی سو ہم احمد اشرف نامی بقال کے پاس رکھوائے دیتے ہیں اور ہم نے اسے یہ ہدایت کر دی ہے کہ جب تو اپنا کام انجام دے چکے تو وہ تجھے بقیہ ڈھائی سو دینار بھی دے دے!"

گوہر نے پریشان ہو کر پُوچھا: "وہ کام تو بتایئے پہلے!"

شیخ الاسلام نے اس کے کان میں کہا: "تو دو چار بار جلال الدین تبریزی کے پاس بھی جا اور انھیں اپنی آواز سے دیوانہ بنا دے۔ تو جلال الدین سے اس طرح ملتی جلتی رہ گویا تیری ان سے قدیم سے راہ و رسم چلی آ رہی ہے۔ پھر ایک دن تو جلال الدین پر یہ الزام لگائے گی کہ انھوں نے خلوت میں تیری عزت آبرو پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ تجھے یہ تہمت فریادی بن کر بادشاہ کے سامنے دُہرانی ہو گی اور تیری گواہی احمد اشرف بقال بھی دے گا۔"

گوہر نے چند سکوت اختیار کیا پھر کہا: "اچھا جناب! بندی کوشش کرے گی کہ اس ناٹک میں اپنا کردار نہایت ہوشیاری اور

عقل مندی سے ادا کرے۔"

گوہر ڈھائی سو دینار سرخ لے کر چلی گئی۔ شیخ الاسلام نے دوسرے ہی دن سے جلال الدین تبریزی کے خلاف یہ افواہ پھیلانا شروع کر دی کہ وہ گوہر نامی مطربہ سے ملوث ہونے کے مرتکب ہو چکے ہیں وہ درویش نہیں بہروپیے ہیں۔"

جلال الدین نے جب یہ افواہ سنی تو بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ نے انھیں تسلی دی اور کہا: "آپ پریشان نہ ہوں ہم خود اس معاملے کی تحقیق کریں گے۔"

جلال الدین چلے آئے تو بادشاہ نے گوہر کو طلب کیا۔ دو سپاہیوں کے درمیان وہ التمش کے سامنے پہنچی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی ہے۔ بادشاہ نے اسے غور سے دیکھا تو اس نے سر جھکا لیا۔ قریب ہی شیخ الاسلام بھی موجود تھا۔

بادشاہ نے شیخ الاسلام سے کہا: "نجم الدین! مطربہ روتی ہے! کیا واقعی ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ جلال الدین جیسا پاکباز درویش ایسی مذموم اور ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہوا ہو؟"

شیخ الاسلام نے جواب دیا: "حضور! گوہر سے دریافت فرما لیں ظاہر ہے یہ جھوٹ کیوں بولے گی؟"

بادشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "مطربہ کی سوگواری نے ہمیں شک و شبے میں ڈال دیا ہے اور ہمیں کچھ کچھ یہ خیال ہو چلا ہے کہ یہ سب کچھ کسی سازش کے ماتحت ہو رہا ہے۔"

شیخ الاسلام گھبرا گیا لیکن جبر کر کے اس کا کوئی اثر نہ آنے دیا۔ پوچھا: "حضور کو کس قسم کا شبہ کس بات پر ہوا؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "یہ ایک مطربہ ہے، بدنام فاحشہ۔ اگر جلال الدین واقعی اس سے ملوث ہو چکے ہوتے تو اسے اتنا شور نہیں مچانا چاہیے تھا کیونکہ یہ ایک پیشہ ور زنِ بازاری ہے!"

چالاک شیخ الاسلام نے کہا: "حضور! اسے ملال تو اس بات کا ہے کہ وہ ایک درویش کی سالہا سال کی عبادت اور تقوے کی بربادی کا سبب بن گئی ہے!"

بادشاہ نے گوہر سے پوچھا: "مطربہ! تو اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟"

مطربہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے عرض کیا: "حضور! میں یوں ہی کیا کم گناہگار تھی کہ جلال الدین نے مجھے اور زیادہ تباہ کر دیا۔ کل ـــــ قیامت میں اپنے اللہ کو کیا جواب دوں گی؟"

بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا: "سارا معاملہ صاف صاف بیان کر کیونکہ اس نازک مقدمے میں اشاروں کنایوں سے باتیں نہیں کی جا سکتیں!"

مطربہ نے روتے ہوئے عرض کیا: "حضور! مجھے جلال الدین نے عشا کے بعد طلب کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ سننا چاہتے تھے۔ میں چلی گئی، انھوں نے دروازے بند کر لیے اور تخلیے میں مجھ سے ایک ایسی شے کے طالب ہوئے کہ میں حواس باختہ ہو گئی۔ جب میں نے ان سے یہ کہا کہ یہ آپ کیا چاہ رہے ہیں، اس طرح تو آپ کا زہد و تقویٰ اور درویشی سب خاک میں مل جائیں گے تو شیخ نے جواب دیا کہ میرے اعمال کی تم فکر نہ کرو، خدا کے سامنے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہو گا۔ میں نے اس پر بھی مزاحمت کی لیکن جلال الدین کے طاقت ور بازوؤں نے وہ سب کر دیا جو انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سانحے کے بعد میں ایک لمحے کا سکون بھی نہیں حاصل کر سکی ہوں۔ اندر سے کوئی شے مجھے کچوکے لگاتی رہتی ہے!"

اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔



کے سامنے ایک نہایت خوبصورت گھوڑا پیش کیا گیا۔

ابومسلم نے حاضرینِ صحبت سے پوچھا: "اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے؟"

ایک مصاحب نے جواب دیا: "اس کو جہاد میں استعمال کرنا چاہیے۔"

دوسرا مصاحب بولا: "نہیں، جہاد کے لیے نہیں یہ چوگان بازی کے لیے بہت اچھا رہے گا!"

تیسرا بولا: "غلط، یہ شکار میں بہت کام دے گا!"

ان میں ایک فلسفی بھی موجود تھا جسے اس کے جاہل اور بداخلاق ہمسائے نے بہت ستا رکھا تھا۔ ابومسلم نے اس سے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے؟"

فلسفی نے جواب دیا: "اس کا بہترین استعمال یہ ہے کہ آدمی اس پر بیٹھ کر اپنے برے اور بداخلاق ہمسائے سے کہیں دور بھاگ جائے"

بادشاہ نے فکرمند آواز میں کہا: "نجم الدین! مطربہ نے جرم کا اقرار کرلیا ہے، یہ تعزیر کی مستحق ٹھیرتی ہے لیکن جلال الدین تبریزی پر اس وقت تک حکم تعزیر جاری نہیں ہوسکتا جب تک وہ واقعی اس جرم کے مرتکب نہ ٹھیر جائیں۔"

شیخ الاسلام نے کہا: "گوہر کے بیان کے بعد کیا کسی اور گواہی کی ضرورت باقی رہتی ہے، اس ناچیز کی رائے میں اگر گوہر اس سلسلے میں اپنا ایک گواہ پیش کردے تو اس مقدمے کا فیصلہ بآسانی سنایا جا سکتا ہے!"

بادشاہ نے مطربہ سے پوچھا: "اس سلسلے میں تیرا کوئی گواہ؟"

مطربہ نے جواب دیا: "جب میں آبرو باختگی کے بعد باہر نکلی تھی تو دروازے پر احمد اشرف بقال سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ بابا جلال الدین تبریزی کی خدمت میں حاضری دینے آیا تھا لیکن جب اس نے میری داستان سُنی تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر واپس ہولیا اور توبہ استغفار کرنے لگا۔"

شیخ الاسلام نے کہا: "اگر جہاں پناہ اجازت دیں تو ناچیز جلال الدین تبریزی کے خلاف اپنا شرعی فیصلہ سُنا دے!"

بادشاہ نے جواب دیا: "نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس مقدمے کے مدّعی تم خود ہو اور مدّعی خود اپنے مقدمے کا فیصلہ کس طرح سُنا سکتا ہے؟ ہمیں اس مقدمے کے لیے دُوسرے حاکم مقرر کرنا پڑیں گے۔"

اس کے بعد گوہر کو رخصت کردیا گیا اور بادشاہ نے ہندوستان کے بڑے بڑے علماء اور شیوخ کو دربار میں حاضری کا فرمان جاری کر دیا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھیں علوم ظاہری کے ساتھ ہی باطنی علوم بھی حاصل تھے۔ یہ دوسوے زاہد تھے اور ان میں بہاءالدین زکریا ملتانی بھی شامل تھے۔

پُورے ملک کے علماء اور شیوخ بادشاہ کے پاس پہنچ گئے انھیں جامع مسجد میں جمع کیا گیا۔

بادشاہ نے شیخ الاسلام سے کہا: "نجم الدین! تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ تم اپنے حکم سے ان علما اور شیوخ میں سے ایک حکم مقرر کردو تاکہ وہ اس افسوس ناک مقدمہ کی کارروائی کرے اور اپنا فیصلہ سنا دے!"

شیخ الاسلام، جلال الدین تبریزیؒ اور بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کی باہمی رنجش سے آگاہ تھا، اس نے فوراً حضرت زکریا ملتانیؒ کا نام لیا، بولا: "میں بہاءالدین کو اس مقدمے کا حکم بناتا ہوں، وہ کارروائی شروع کریں!"

نمازِ جمعہ کے بعد مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ بادشاہ خود بھی ان سب کے درمیان موجود تھا۔ شیخ الاسلام نے ایک خدمت گار کو حکم دیا: "مطربہ کو حاضر کیا جائے!"

خدمت گار باہر گیا اور مطربہ کو لے کر واپس آگیا۔ اس کے پیچھے ہی جلال الدین تبریزیؒ بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے جوتے ہاتھ میں لے لیے اور ننگے پیر مسجد کے صحن کی طرف بڑھے۔ تمام علماء اور صوفیاء ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے۔ بہاءالدین زکریاؒ تیزی سے آگے بڑھے اور جلال الدین تبریزیؒ کے جوتے نہایت ادب سے خود لے لیے اور انھیں شانے سے پکڑ کر اپنی نشست گاہ تک لائے اور اپنے برابر بٹھالیا۔

بادشاہ نے کہا: "بس جناب ہوچکا فیصلہ۔ اب فیصلے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ شیخ الاسلام نے جس ذات کو اس مقدمہ کا حکم بنایا ہے وہ خود جلال الدینؒ کی اس قدر تعظیم بجا لا رہا ہے!"

بہاءالدین زکریاؒ نے جلال الدین تبریزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "جناب والا! یہ تو اس کے مستحق ہیں کہ میں ان کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بناؤں۔ یہ مسلسل سات سال تک حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کے سفر و حضر میں جس طرح ساتھ رہے اس سے ان کے زہد و تقا کی کوئی دُوسری مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے تبریز کی حکومت اور حکومت کے تعیشات کو لات مار دی۔ اس لیے ہم سب پر ان کی تعظیم واجب ہے!" اس کے بعد انھوں نے.......

شیخ الاسلام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ نجم الدین کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہم نے جلال الدین کی تعظیم کے پردے میں ان کا عیب چھپالیا۔" پھر مسجد میں موجود تمام علماء اور صوفیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ہمیں یقین ہے کہ یہاں جتنے بھی عالم اور صوفی موجود ہیں وہ جلال الدین کے مرتبے سے خوب اچھی طرح واقف ہیں!" مسجد میں سناٹا طاری ہوگیا۔ بہاءالدین زکریاؒ اچانک گوہر مطربہ سے مخاطب ہوتے، کہنے لگے: "مطربہ! ہمیں تیری شکایت کا علم ہوچکا

ہے اور تو یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ہم اور دُوسرے صوفیائے کرام جو اس وقت مسجد میں موجود ہیں، باطنی علوم بھی رکھتے ہیں اور انھوں نے جلال الدین کو جس طرح تعظیم دی ہے وہ ریاکاری کی تعظیم نہیں ہے۔ تجھ پر یہ فرض ہے کہ یہاں جو کچھ بھی کہے سچ سچ کہے ورنہ جھوٹ میں تباہ کاری اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

مطربہ پہلے ہی بدحواس ہو رہی تھی۔ وہ اہل اللہ کی تیز نظروں کی تاب نہ لا سکی، سر جھکا کے بآوازِ بلند اس نے جواب دیا۔

"میرا خدا بہتر جانتا ہے کہ بابا جلال الدین پر یہ صریح تہمت اور بہتان ہے اور یہ سارا کھیل شیخ الاسلام کا تیار کیا ہوا ہے!"

اس کے بعد اس نے ساری تفصیل بتا دی، اس نے ڈھائی سو دینار بھی وہیں ڈھیر کر دیے۔ اسی لمحے احمد اشرف اقبال کو بھی طلب کر لیا گیا۔ اس نے مطربہ کے بیان کی تائید کی اور بقیہ ڈھائی سو دینار بھی پیش کر دیے۔ شیخ الاسلام نے سازش کا بھانڈا پھوٹتے جو دیکھا تو بدحواس ہو گئے اور ان کے اعصابی نظام میں انتشار پیدا ہو گیا۔ وہ تھرتھرا کے مسجد کے صحن میں گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ بادشاہ نے انھیں اسی وقت معزول کر دیا اور بہاء الدین زکریا کو شیخ الاسلام کا منصب بخشا۔

اس واقعے نے جلال الدین کو بے حد ملول کر دیا اور انھوں نے دہلی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا دُوسرا مستقر بدایوں قرار پایا لوگوں نے آپ کو روکنا چاہا لیکن آپ نے یہ کہہ کر ان کی درخواست مسترد کر دی کہ "جب میں اس شہر میں آیا تھا تو خالص سونا تھا لیکن اب چاندی رہ گیا ہوں، آیندہ معلوم نہیں کیا ہو!"

جلال الدین بدایوں چلے گئے۔ وہاں جس مکان میں آپ کا قیام تھا آپ وہاں اکثر دروازے پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایک دن صبح ہی صبح ایک ہندو سر پر دہی کا مٹکا لیے سامنے سے گزرا۔ یہ شخص موضع کنہر کا ڈاکو تھا جو دن میں تو دہی بیچتا تھا اور رات میں ڈاکے ڈالتا تھا جلال الدین نے اسے گھور کر دیکھا، اس کی نظریں بھی ٹکرائیں، وہ کھنچا ہوا آپ کے قریب پہنچا اور بے اختیاری میں کہا: "تم مسلمان ہو؟ محمد کی اُمت میں؟"

آپ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور نظریں اس کے چہرے اور آنکھوں کی راہ سے دل میں اُترتی چلی گئیں۔ اس شخص نے کہا: "حضرت! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں مجھے مسلمان کر لیجیے!"

آپ نے اسے مسلمان کر لیا اور اس کا نام علی رکھا، بعد میں یہ شخص بزرگی اور فضیلت کے اس مرتبے تک پہنچا کہ محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کی دستارِ فضیلت اسی نے باندھی۔

علی نے ایک لاکھ جیتل آپ کی خدمت میں پیش کیے اور عرض کیا: "حضرت! آپ انھیں جہاں چاہیں خرچ کریں!"

آپ نے جواب دیا: "انھیں تم اپنے ہی پاس رکھو اور جس کے لیے جتنے کا ہم حکم دیں تم خرچ کر دینا۔"

چنانچہ اس کے بعد جو حاجت مند بھی آیا، آپ ان جیتلوں میں سے کچھ نہ کچھ دلوا دیتے۔ اس تقسیم میں یہ خاص بات تھی کہ کسی حاجت مند کو بھی آپ نے سو سے زیادہ اور پانچ سے کم نہیں دیے آخر میں کچھ ایسا ہوا کہ کسی طرح بس ایک جیتل باقی رہا۔ علی نے سوچا کہ اب جو حاجت مند آئے گا اور بابا جلال الدین اس کو پانچ جیتل دینے کا حکم دیں گے تو بقیہ چار کہاں سے لائیں گے۔ علی ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک حاجت مند آ گیا۔ بابا جلال الدین نے اسے حکم دیا۔

"علی! تمھارے پاس جو ایک جیتل باقی بچا ہے وہ اس شخص کو دے دو۔"

علی نے جیتل تو حاجت مند کے حوالے کیا اور فرطِ عقیدت سے بابا جلال الدین کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔

بدایوں کے حاکم قاضی کمال الدین کی جلال الدین تبریزی سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دُوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دن جلال الدین قاضی سے ملنے جو گئے تو قاضی کے خادم نے انھیں بیٹھک میں بٹھا دیا اور کہا: "حضرت تشریف رکھیں، قاضی صاحب اس وقت نماز میں مشغول ہیں!"

بابا تبریزی نے فرمایا: "خوب! کیا قاضی بھی نماز پڑھنی جانتا ہے؟" اور آپ وہاں رُکے نہیں، اپنے گھر واپس چلے آئے۔ خادم نے بابا تبریزی کی آمد اور ان کا جملہ قاضی کے سامنے بیان کر دیا۔ قاضی کو اس سے تکلیف پہنچی وہ سیدھا جلال الدین کے پاس پہنچا اور رعبِ شان سے گردن ٹیڑھی کر کے پوچھا: "کیا آپ نے میرے خادم سے یہ فرمایا تھا کہ کیا قاضی بھی نماز پڑھنی جانتا ہے؟"

قاضی کا خیال تھا کہ شاید اس طرح جلال الدین اس کے رعب

Scanned with CamScanner

میں آجائیں گے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ صاف صاف کہہ دیا: "ہاں میں نے یہ کہا تھا۔"

قاضی نے طنزاً کہا: "خوب! میں قاضی ہوں اور میرا علم و فضل مانا ہوا ہے۔ اگر میں نماز پڑھنی نہیں جانتا تو پھر اس شہر میں کون ہے جو نماز پڑھنی جانتا ہے۔"

جلال الدین نے نرمی سے فرمایا: "قاضی! تم میرا مطلب نہیں سمجھے، علما کی نماز اور ہوتی ہے اور فقرا کی اور! تم اس سلسلے میں مجھ سے مت اُلجھو!"

قاضی نے غصے میں کہا: "کیوں نہ اُلجھوں، تم باتیں ہی اُلٹی سیدھی کر رہے ہو، نماز میں جو سورتیں پڑھی جاتی ہیں کیا وہ الگ الگ ہوتی ہیں کیا علما کا قرآن اور ہوتا ہے اور فقرا کا قرآن کوئی اور؟ کیا ان دونوں کے رکوع اور سجود میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟"

آپ نے بدستور تحمل سے جواب دیا: "قاضی! تم میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو، بے شک قرآن اور نماز کا طریقہ دونوں کا ایک ہی ہے لیکن دونوں کی نمازوں میں فرق اتنا ضرور ہوتا ہے کہ علما قبلہ کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور فقرا جب تک کعبے کو دیکھ نہیں لیتے، تکبیر تک نہیں کہتے۔ فقرا کی معمولی نماز یہ ہے کہ وہ عرش پر پڑھی جائے!"

قاضی ان کی بات سے متفق نہ ہوا اور اسے گمان گزرا کہ اس طرح جلال الدین شاید اپنی کرامت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ میں نماز میں کعبے کو دیکھتا رہتا ہوں اور عرش پر نماز ادا کرتا ہوں۔ دوستانہ تعلقات کا خیال کر کے قاضی نے خاموشی اختیار کی اور چپ چاپ واپس آ گیا۔

رات کو خواب میں قاضی نے دیکھا کہ بابا جلال الدین تبریزی عرش معلیٰ پر جا نماز بچھائے نماز ادا کر رہے ہیں!

دوسرے دن اتفاق سے دونوں ایک ضیافت میں یکجا ہو گئے۔ جب قاضی وہاں پہنچا تو بابا جلال الدین لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ قاضی پر نظر پڑتے ہی آپ نے کہا: "علما کی معراج یہ ہے کہ وہ متولی یا مدرس بن جائیں، زیادہ پڑھ لیں تو قاضی بن جائیں اس سے زیادہ ترقی کریں تو صدر الصدور کا عہدہ سنبھال لیں اور یہ ان کی انتہا ہے لیکن فقرا کے مرتبے کی کوئی حد نہیں، ان کا پہلا مرتبہ وہ ہے جس کا قاضی نے رات کو خواب میں مشاہدہ کیا!"

قاضی کا سارا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں کھڑا ہوا اور بے ساختہ بڑھ کر بابا جلال الدین کے قدموں میں سر رکھ دیا اور معافی مانگنے لگا۔

بابا جلال الدین نے ایک مسجد کی تعمیر کا کام شروع کرایا تو قبلے کی سمت کا مسئلہ زیر غور آیا۔ آپ نے معماروں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "لو ادھر دیکھو، کچھ نظر آیا؟"

معماروں کے سامنے کعبہ موجود تھا۔ ہلکے دھوئیں کی چادر کے اُس پار خانۂ کعبہ صاف نظر آ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: "اس سے کعبے کی صحیح سمت کا تعین کر لو!"

ایک دن آپ ندی کے کنارے دوستوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور دوستوں سے کہا: "دوستو! اٹھو اور وضو کر لو تاکہ نجم الدین صغریٰ کی نماز جنازہ پڑھ لیں۔" پھر خود بھی وضو کرنے لگے۔ ساتھ میں دوسروں نے بھی وضو کیا۔ وضو کر چکنے کے بعد آپ نے فرمایا: "گو کہ ہمیں نجم الدین کی شرارتوں ہی کی وجہ سے دہلی چھوڑنی پڑی لیکن اب جبکہ وہ ملک عدم سدھار چکا ہے ہمیں اس کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے!"

آپ نے باقاعدہ نماز جنازہ پڑھی۔ چند دنوں بعد نجم الدین کے انتقال کی باقاعدہ خبر بھی آ گئی اور حساب لگانے پر پتہ چلا کہ ٹھیک اسی وقت انتقال ہوا تھا جب بابا تبریزی ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی تیاری کر رہے تھے۔

آپ کا بدایوں سے دل اکتایا تو اودھ کا رُخ کیا اور اودھ سے بہار روانہ ہو گئے۔ بہار سے بنگال پہنچے۔ بنگال کا لکھنوتی مسلمانوں کا صدر مقام تھا۔ آپ نے لکھنوتی سے کچھ فاصلے پر پنڈوہ نامی جگہ پر ایک درخت کے سائے میں قیام فرمایا۔ یہاں مندروں کی کثرت تھی۔ مندروں سے ناقوسوں اور گھنٹیوں کی آوازیں ہر وقت فضا میں گونجتی رہتی تھیں۔ چند دنوں بعد پجاریوں اور ہندوؤں نے انھیں ایک درخت کے نیچے آرام کرتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ ہندو ان کی نگرانی کرنے لگے۔ آپ کو جب بھوک لگتی تو درخت کے پتے کھا لیتے۔ کپڑے میلے ہوتے تو خود دھو لیتے۔ جب یہ اپنے کپڑے دھونے تالاب پر پہنچتے تو ہندو بڑا شور کرتے لیکن آپ ان کی پروا

کیے بغیر اپنے کام میں معروف رہتے۔ کئی پجاری آپ کے اس فعل میں مزاحم ہوئے لیکن آپ کو باز نہ رکھ سکے۔ جب کسی اور طرح بابا جلال الدین تبریزی کو قائل نہ کر سکے تو انھوں نے مناظرے شروع کر دیے اور مناظروں کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ کچھ ہی عرصے میں آپ کی تعلیمات اور قوتِ رُوحانی کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنڈوے کی بیشتر آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ مسجدیں تعمیر ہونے لگیں، کل تک جو پجاری ناقوس پھونکا کرتے تھے اور گھنٹے بجاتے تھے اب مسجدوں میں امامت کرتے نظر آتے تھے۔ لوگ پنج وقتہ نماز کی حاضری دینے لگے تھے اور پھر لوگوں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ پنڈوے سے مندر غائب ہو گئے اور مسجدیں شمار سے باہر ہو گئیں۔ وہاں کی پوری آبادی مسلمان ہو چکی تھی اور جو اسلام قبول نہ کر سکے تھے انھوں نے راہِ فرار اختیار کی تھی اور پنڈوے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا۔ بنگال کا اسلام بابا تبریزی کا رہینِ منت ہے۔ پنڈوے سے آپ بندرگاہ دیو محل تشریف لے گئے اور وہاں بھی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ یہاں ایک بہت بڑا بُت خانہ تھا، بابا تبریزی کی کوشش اور تصرفِ باطنی سے یہاں بھی اسلام پھیلنے لگا۔ آپ نے یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ دیو محل کے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

آپ کی عمر ایک سو پچاس سال ہو چکی تھی۔ آپ کے گرد و پیش عقیدت مندوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ یکایک آپ نے مراقبے سے سر اٹھایا اور اپنے چار عقیدت مندوں سے کہا: "لوگو! ذرا شمال مغرب کی راہ پر جانا تو، طنجہ (افریقہ) کا ایک سیاح ہماری محبت کو دل میں چھپائے ہم سے ملنے آ رہا ہے، ذرا اس کا استقبال تو کرنا!"

چاروں عقیدت مندوں نے دو منزل چل کر طنجہ کے اس سیاح کا شاندار استقبال کیا۔ یہ مشہورِ عالم سیاح ابنِ بطوطہ تھا جو شیخ تبریزی کی شہرت سن کر ان سے ملاقات کرنے آ رہا تھا۔ اسے اپنے استقبال کو پہنچنے والوں کی زبان سے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ بابا تبریزی نے انھیں ابنِ بطوطہ کے استقبال کی غرض سے بھیجا ہے۔

ابنِ بطوطہ والہانہ جلال الدین تبریزی کی خدمت میں پہنچا اس نے دیکھا ایک ڈیڑھ سو سالہ دبلا پتلا، کشیدہ قامت، نورانی چہرے کا باعظمت انسان ابنِ بطوطہ کا منتظر ہے۔ ابنِ بطوطہ نے انھیں سلام کیا، آپ نے جواب دے کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ابنِ بطوطہ نے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اس وقت جلال الدین تبریزی کے جسم پر ایک نہایت قیمتی عمدہ جُبّہ تھا۔ ابنِ بطوطہ نے دل میں سوچا کہ اے کاش شیخ تبریزی اپنا یہ جُبّہ مجھے مرحمت فرما دیں!"

پھر لوگوں نے یہ دیکھا کہ آپ فوراً اندر تشریف لے گئے اور ایک دُوسرا جبّہ پہن کر، قیمتی جبّہ ہاتھ میں لیے دوبارہ نمودار ہوئے آپ نے یہ جبّہ ابنِ بطوطہ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا: "یہ جبّہ تجھے پسند ہے تو لے لے، لیکن یہ تیری قسمت کا نہیں ہے، اسے میں نے اپنے بھائی کے لیے تیار کروایا تھا، خیر تُو لے جا، یہ جبّہ تیرے پاس رہے گا نہیں، یہ تجھ سے چھن جائے گا، ایک غیر مسلم بادشاہ اس جبّے کو جبراً چھین لے گا لیکن یہ رہے گا اس کے پاس بھی نہیں۔ یہ آخرکار میرے بھائی کے پاس پہنچ جائے گا۔"

ابنِ بطوطہ نے شکریے کے ساتھ یہ جبّہ قبول کر لیا اور دل میں یہ ارادہ کر لیا کہ وہ یہ جبّہ کسی حکمران کے سامنے پہن کر ہرگز نہ جائے گا۔ چند دن بابا تبریزی کی خدمت میں گزار کر ابنِ بطوطہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر چین روانہ ہو گیا۔

دریائے ہوانگ ہو کے جنوبی حصے میں کنگ نے نامی نہایت خوب صورت شہر آباد تھا اسے عرب خنسا کہتے تھے۔ کنگ نے یہاں کا دار الخلافہ تھا۔ ابنِ بطوطہ کنگ نے میں ایک سیاح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور بادشاہ سے ملنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ ابنِ بطوطہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوم پھر کر کنگ نے کے بازاروں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ شاہی محل چوک میں واقع تھا یہاں تین نہریں رواں تھیں ایک نہر کے قریب چوک میں شاہی محل کھڑا تھا، ابنِ بطوطہ نے دُور سے اس محل کا مشاہدہ کیا، ابھی وہ مشاہدے میں کھویا ہوا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ گئے اور ابنِ بطوطہ تنہا رہ گیا، اس وقت بابا تبریزی کا جبّہ اس کے جسم پر تھا۔ ایک اجنبی ابنِ بطوطہ کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ابنِ بطوطہ نے اِدھر اُدھر اپنے ساتھیوں پر نظریں دوڑائیں تو کوئی نظر نہ آیا۔ پریشان ہو کر واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اجنبی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پوچھا: "کیا تم اجنبی ہو؟"

ابنِ بطوطہ نے جواب دیا: "ہاں میں سیاح ہوں!"

اجنبی نے پوچھا: "تم کہاں سے آئے ہو؟"

ابنِ بطوطہ نے جواب دیا: "میں بہت سے ملکوں کی سیاحت کرتا ہوا یہاں آیا ہوں ورنہ یوں میرا وطن طنجہ ہے جو افریقہ کے انتہائی مغربی بحر پر سمندر کے کنارے آباد ہے۔"

اجنبی نے خوشی کا اظہار کیا، بولا: "میں یہاں کا وزیر ہوں، میرے ساتھ آؤ!"

ابنِ بطوطہ کے جسم پر بابا تبریزی کا چغہ تھا۔ وہ وزیر کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا لیکن وزیر اسے جبراً شاہی محل میں لے گیا۔ بادشاہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور دیر تک مسلمان بادشاہوں کا حال پوچھتا رہا۔ بادشاہ کی نظریں ابنِ بطوطہ کے چغے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا: "سیاح! یہ چغہ ہمیں بہت اچھا لگ رہا ہے کیا تم اسے بطور تحفہ ہماری خدمت میں پیش کرو گے؟"

ابنِ بطوطہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے لیکن اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ بابا تبریزی کی پیش گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ ابھی ابن بطوطہ نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ وزیر نے اسے حکم دیا: "اپنا چغہ اُتار کر ادب سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرو!"

ابنِ بطوطہ نے حکم کی تعمیل کر دی۔ بادشاہ نے اس تحفے کے صلے میں دس خلعتیں، ساز و سامان سے لیس ایک گھوڑا اور سفر خرچ مرحمت فرمایا۔ ابن بطوطہ نے نہایت اذیت کے ساتھ یہ چیزیں وصُول کیں۔

ابنِ بطوطہ ایک سال تک اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ اس کے بعد وہ خان بالغ (قاآن کے شہر یعنی پیکن) چلا گیا، یہاں اسے کے رہنما نے شیخ برہان الدین صاغرجی نامی بزرگ کی خانقاہ میں پہنچا دیا۔

جب ابنِ بطوطہ خانقاہ میں داخل ہوا، شیخ برہان الدین کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے اور ان کے جسم پر وہی چغہ تھا جسے بابا تبریزی نے عطا فرمایا تھا اور جسے ابن بطوطہ سے کنگ نزے کے حکمران نے جبراً تحفے میں قبول کر لیا تھا۔

ابنِ بطوطہ آگے بڑھا اور چغے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شیخ برہان الدین نے سوال کیا: "تو اسے اُلٹ پلٹ کر کیوں دیکھ رہا ہے، کیا اس چغے کو پہچانتا ہے؟"

ابنِ بطوطہ نے جواب دیا: "ہاں خُوب پہچانتا ہوں، خنسا کے بادشاہ نے اسے جبراً مجھ سے لے لیا تھا!"

شیخ برہان الدین نے کہا: "نادان سیاح! شیخ جلال الدین نے یہ چغہ میرے لیے تیار کرایا تھا اور مجھے خط کے ذریعے مطلع کر دیا تھا کہ یہ دو واسطوں سے تیرے پاس تک پہنچ جائے گا۔"

اس کے بعد شیخ برہان الدین نے خانقاہ کی طاق میں رکھی ہوئی ایک کتاب سے بابا جلال الدین تبریزی کا خط نکال کر ابنِ بطوطہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"بابا برہان الدین! تمھارا چغہ تیار ہے، اسے میں ایک مغربی سیاح کے ذریعے روانہ کر دُوں گا۔ یہ چغہ سیاح سے چین کا ایک بادشاہ جبراً تحفے میں لے لے گا اور وہ بادشاہ اسے تمھاری خدمت میں روانہ کر دے گا۔"

ابنِ بطوطہ خط پڑھتا جاتا تھا اور حیران و پریشان ہوتا جاتا تھا۔ برہان الدین اس کے چہرے کے تاثرات سے اندرونی کش مکش اور حیرت کا اندازہ لگا رہے تھے۔ انھوں نے کہا۔

"سیاح! تو پریشان یا حیران کیوں ہو رہا ہے، میرے بھائی جلال الدین تبریزی کا مرتبہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے، جتنا تُو نے سمجھ رکھا ہے۔ انھیں دُنیا کے معاملات میں حیرت انگیز دخل حاصل ہے۔ کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ ہر روز صبح کی نماز مکہ معظمہ میں ادا فرماتے رہے ہیں اور ہر سال حج پر تشریف لے جاتے ہیں۔ عرفہ اور عید کے دن وہ اپنی خانقاہ میں موجود نہیں ہوتے؟" پھر ذرا دُکھ سے کہا: "لیکن افسوس کہ جب تو اُن سے رخصت ہوا تھا اس کے چند دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور اب وہ اپنے جسمِ خاکی کے ساتھ اس دُنیا میں موجود نہیں ہیں۔"

ابن بطوطہ کو سکتہ لگ گیا اور شیخ کے وصال کی خبر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کہتے ہیں آپ کا مزار دیو محل میں ہے۔ آپ کا عرس ہر جب کو ہوتا ہے۔ ہر روز شام کو یہاں سے غربا و مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ مرورِ زمانہ سے مزار کا سائبان ٹوٹ گیا تھا لیکن کسی عقیدت مند نے اسے دوبارہ تعمیر کرا دیا۔

وہ شخص جو ایران کے شہر تبریز میں ایک حکمران گھرانے میں پیدا ہوا تھا، حضرت ابراہیم بن ادھم کی طرح حکومت پر لات مار کر درویش بن گیا اور عبادت و ریاضت سے وہ بلند مرتبہ حاصل کیا کہ شاہانِ وقت اس کے استقبال کے لیے حاضری دینا فخر کی بات سمجھنے لگے۔ جس نے ہندوستان کے دُور افتادہ علاقے بنگال میں اسلام پھیلایا اور آج وہیں محوِ استراحت ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

❋

روشن چراغ دہلی

ضیاء تسنیم بلگرامی

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یک سوئی اور توجہ الی اللہ کی خاطر جس خانقاہ میں سکونت اختیار کر رکھی تھی وہ دہلی میں کیلوکھڑی نامی جگہ پر واقع تھی۔ آپ خانقاہ کی بالائی منزل میں قیام فرماتے تھے۔ آپ کے مرید خانقاہ کے نچلے حصّے میں موجود رہتے اور اپنے مرشد کی کچھ اس طرح عزت و تکریم کرتے کہ کیا کوئی زرخرید غلام اپنے آقا کی عزت اور خدمت کرتا ہوگا۔

صبح ہو چکی تھی اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ مُرغ بانگ دے کر کب کے خاموش ہو چکے تھے۔ مندروں کی گھنٹیاں اور گھنٹوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر دُور دُور اُڑی پھر رہی تھیں۔ مؤذن اذان دے چکے تھے اور تسلیم و رضا کے پیکر خدا کی بارگاہ میں دست بستہ کھڑے اپنے عجز و بے بسی اور نیازمندی کا مؤدبانہ اظہار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جب مؤذن نے "نماز نیند سے بہتر ہے" کا پُر رفعت اعلان کیا تھا تو اس صدا نے بارگاہِ ایزدی کے نیازمندوں کے دلوں کو گرما دیا تھا اور اب یہی گرمی مسجدوں کی صفوں میں ارکان نماز کی ادائیگی کی صورت میں جلوہ نما تھی۔ جس میں لوگوں کا یقین اور اعتماد سیال مادے کی طرح اِدھر اُدھر متحرک اور سرگرم عمل تھا۔

نماز سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ خانقاہ کی بالائی منزل میں اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے غسل کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ نہانے والوں نے اپنے کپڑے ساحل پر ہی چھوڑے اور خود پانی میں اُتر گئے۔ ان نہانے والوں میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے وہ معزز مہمان بھی تھے جو ملتان سے تشریف لائے تھے اور جو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے قرابت داری کا شرف رکھتے تھے۔ یہ حضرات نہاتے نہاتے نتھنوں کو انگلیوں سے داب کر ڈبکی لگاتے اور جب دوبارہ اُبھرتے تو سر کو جھٹکا دے کر نتھنے کھول دیتے اور جلدی جلدی سانسیں لینے لگتے۔ اسی عالم میں ایک درویش جو پانی کی سطح پر اُبھرا اور آنکھیں کھول کر ساحل پر رکھے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ ایک اُچکا ان کا لباس لیے بھاگا جا رہا ہے۔ درویش نے پانی کے اندر ہی سے شور و غل مچانا شروع کر دیا: "لوگو! دوڑنا، پکڑنا، کمبخت میرے کپڑے لیے جا رہا ہے۔"

لوگ دوڑے لیکن شاطر اٹھائی گیرا کپڑے لے کر معلوم نہیں کہاں نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ درویش نے ساحل پر پہنچ کر ہائے واویلا شروع کر دی اور زور زور سے اٹھائی گیرے کو بُرا بھلا کہنے لگا ذرا سی دیر میں وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ ان کی چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں بہت ساری شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونجنے لگیں۔ جس سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے ذکر و فکر میں خلل واقع ہونے لگا۔ خانقاہ کے ایک مُرید خاص نصیر الدینؒ سے یہ ہنگامی حالت دیکھی نہ گئی۔ شور و غل سن کر یہ خانقاہ سے باہر نکلے اور ہجوم میں داخل ہو کر دریافت کیا: "لوگو! کیا بات ہے۔ یہ شور و غل کیسا مچا رکھا ہے؟"

درویش آگے بڑھا اور ناگواری کی شکنیں ڈالتا ہوا بولا۔ "حضرت! یہاں کے لوگ کیسے ہیں کہ غسل کے دوران لوگوں کے لباس لے بھاگتے ہیں، ایک اٹھائی گیرا میرا لباس لے بھاگا!"

درویش بھیگے ہوئے تہمد میں برہنہ کھڑا ہجوم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ تہمد کا پانی ٹپک ٹپک کر اس کے قدموں میں جمع ہو رہا تھا اور زمین کی خشک اور پیاسی مٹی اُسے نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

سوانح عمری خواجگان چشت ❖ انوار الاصفیا ❖ آثار الصنادید ❖ خیر المجالس ❖ تاریخ فیروز شاہی

سید مرزبان علی بسمل ❖ غلام علی اینڈ سنز ❖ سرسید احمد خان ❖ ملفوظات حضرت چراغ دہلی ❖ شمس سراج عفیف

نصیر الدین نے کہا: "بھائی! تمھارے شور وغل سے حضرت پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل واقع ہو رہا ہے، تم ذرا توقف کرو!"

درویش نے بے زاری سے پوچھا: "کیا ذرا سے توقف سے میرے کپڑے واپس مل جائیں گے؟"

نصیر الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "ہاں تم کپڑوں کی فکر نہ کرو، تمھیں کپڑے بھی مل جائیں گے مگر شرط یہ ہے کہ اپنے شور وغل سے باز آجاؤ!"

درویش چپ ہو گیا۔ نصیر الدین "ذرا ٹھہرو!" کہتے ہوئے خانقاہ میں واپس چلے گئے اور جب تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو اس حلیے میں کہ جسم پر ایک تہبند کے سوا کپڑے کا ایک تار بھی نہ تھا۔ ان کا اپنا لباس ان کے ہاتھوں میں تھا۔ پھٹا پرانا تہبند باندھ کر، مضبوطی سے کمر سے لپٹا ہوا تہبند کرتے کے ساتھ ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اپنا لباس درویش کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو اس لباس کو پہن لو!"

درویش نے حیرت سے پوچھا: "آپ اپنا لباس کیوں دے رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "اس لیے کہ تمھارے نقصان کی تلافی ہو جائے اور تم شور وغل سے باز آجاؤ، تمھارے شور وغل سے پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل پڑ رہا ہے۔"

درویش کچھ دیر لینے نہ لینے کے تذبذب کا شکار رہا لیکن جب نصیر الدین نے ذرا زور دے کر کہا: "لے لو، سوچتے کیا ہو، تم ہمارے مہمان ہو، ملتان جا کر یہی کہو گے نا کہ کیلوکھڑی میں اٹھائی گیرے بستے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ کیلوکھڑی میں حضرت نظام المشائخ اور ان کے نیاز مند بھی رہتے ہیں جو اٹھائی گیروں سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کر دیتے ہیں۔"

درویش نے کپڑے لے لیے اور نصیر الدین خانقاہ میں واپس چلے گئے۔ مجمع نصیر الدین کے رویے پر تحسین آمیز تبصرے کرنے لگا۔

دریا کے کنارے کیا ہو رہا تھا اور یہ ہنگامہ کس طرح ختم ہوا، خانقاہ کے لوگ بھی پوری طرح باخبر نہ ہو سکے۔ جب نصیر الدین خانقاہ میں واپس پہنچے تو بعض پیر بھائیوں نے اس عجیب حلیے کی بابت سوالات کرنے شروع کر دیے۔ نصیر الدین اس کا چرچا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح چھپاتے رہے۔ اُدھر محبوبِ الٰہیؒ نمازِ چاشت ادا فرما رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی آپ نے نصیر الدین کو طلب فرمایا۔ نصیر الدین کو برہنہ حالت میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔ لیکن مرشد کے حکم کو ٹال بھی نہ سکتے تھے۔ وہ حالتِ گومگو میں مبتلا ہی

قطعی فیصلے پر نہ پہنچے تھے کہ دوبارہ حکم آیا: "جس حالت میں ہو، اسی میں چلے آؤ!"

یہ بدرجۂ مجبوری ندامت اور خجالت کی تصویر بنے ہوئے شیخ کی بارگاہ میں پہنچے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ نظام المشائخؒ نے سر اٹھایا اور مسکرا کر پوچھا: "نصیر الدین! تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

جھوٹ بولنے کی ہمت نہ تھی اور سچ بولنے میں اس تعلّی اور غرور کا خدشہ تھا کہ نصیر الدین نے اپنے پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل انداز ہونے والے واقعے کو اپنے لباس کی قربانی دے کر دور کیا۔

نظام المشائخؒ نے ارشاد فرمایا: "ہم تمھارے تامّل سے آگاہ ہیں، اِدھر آؤ ہمارے قریب، تم ہمارے سعادت مند اور بلند مرتبہ مرید ہو، یہ لو اور اپنی برہنگی دور کرو!"

یہ کہتے ہوئے نظام المشائخؒ نے اپنا خاص لباس نصیر الدین کو مرحمت فرما دیا۔ اس واقعے اور اس عطیے نے نصیر الدین کا جو حال کر دیا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ حالتِ وجد اور سرخوشی میں انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے پیر و مرشد نے انھیں پوری کائنات بخش دی ہے اور نصیر الدین جیسا خوش نصیب انسان روئے زمین پر تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ مل سکے گا۔

نصیر الدین، حسنی سید، اودھ کے رہنے والے تھے۔ دادا کہیں باہر سے لاہور میں تشریف لائے اور یہیں نصیر الدین کے والد سید یحییٰ پیدا ہوئے۔ پھر یہ لوگ اودھ چلے گئے اور نصیر الدین اودھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ماں نے تعلیم و تربیت کا وہ حق ادا کیا کہ بہتوں کے باپ بھی اس طرح نہ ادا کر سکتے تھے۔ عبدالکریم شروانی نامی عالمِ بے بدل سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا افتخار الدین گیلانی نامی فاضل اجل سے علومِ ظاہری کی تکمیل کی۔ ترک و تجرید اور نفس کشی کے آثار نوعمری ہی سے ہویدا تھے۔ ہمیشہ روزے سے رہتے اور نماز باجماعت میں کبھی فرق نہ آتا۔ پھر ریاضت و مجاہدے میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور کسی درویشِ کامل کے ساتھ سات سال اس طرح گزارے کہ سوتے جاگتے اور اٹھتے بیٹھتے اس کی پاک صحبت کا فیضان حاصل رہتا۔ جب یہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں داخل ہوئے تو دہلی تشریف لے گئے اور حضرت نظام المشائخؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر مستقلاً وہیں رہنے لگے اور محبوبِ الٰہیؒ کی مریدی اختیار کی۔ اس مقدس چھاؤں میں نصیر الدینؒ کو جیسا سکون ملا، اس کا انھیں

پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ یہ ان کی آخری منزلِ مُراد تھی۔ ان کی بڑی بہن اب بھی اودھ ہی میں رہ رہی تھیں اور نصیرالدینؒ کو جب بہن کی محبت ستاتی تو حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے اجازت لے کر اودھ تشریف لے جاتے اور کچھ عرصہ رہ کر پھر واپس آجاتے۔

بہن کے پاس قیام فرما ہونے کے دوران انھیں شدت سے یہ احساس بھی ہوتا کہ لوگ انھیں گھیرے رہتے ہیں جس کا یہ نتیجہ نکلتا کہ ان کا بہت زیادہ وقت برباد ہو جاتا۔ جس کا انھیں بڑا قلق ہوتا۔ وقت کی اس بربادی سے بچنے کا یہ طریقہ سوچا کہ وہ علی الصباح نمازِ فجر کے بعد کسی ویرانے میں نکل جایا کریں اور وہاں اللہ اللہ کرتے رہیں۔ شاید وہ اس طریقے پر فوراً ہی عمل درآمد بھی شروع کر دیتے لیکن اس کے لیے پیر و مرشد کی اجازت لینی بہت ضروری تھی۔ انھوں نے اودھ سے کیلوکھڑی پہنچتے ہی حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی۔ بدرجہ مجبوری امیر خسرو کا سہارا لیا۔ امیر خسروؒ کو شیخ کی خدمت اور مزاج میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ نصیرالدین نے امیر خسرو سے کہا: "حضرت! آپ کسی مناسب موقع پر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں اس عاجز کی ایک درخواست پیش کر کے منظوری دلوادیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

امیر خسروؒ نے پوچھا: "کہیے لیکن درخواست ایسی نہ ہو جو حضرت پیر و مرشد کے مزاج پر گراں گزرے۔"

نصیرالدینؒ نے کہا: "آپ حضرت سے فرمائیں کہ جب نصیرالدینؒ اودھ میں اپنی بہن کے پاس جاتا ہے تو وہاں اس ناچیز کے گرد لوگوں کا مجمع لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی عبادت و ریاضت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے اور بہت سارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو جاتا ہے۔"

امیر خسروؒ نے جواب دیا: "آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی درخواست کسی مناسب موقع پر پیش کر کے منظور کرا دی جائے گی!"

عشا کی نماز کے بعد حضرت امیر خسروؒ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ ان کے پیر دابنے لگے۔ آپ اس جامع کمالات شخص کی صورت دیکھ رہے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے اور امیر خسروؒ یہ سوچ رہے تھے کہ نصیرالدین کی درخواست کے لیے اس سے بہتر وقت شاید نہ مل سکے۔

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے متبسم لہجے میں پوچھا: "خسرو! کیا سوچ رہے ہو؟"

خسروؒ نے جواب دیا: "حضور! نصیرالدین نے ناچیز کے توسط سے ایک زبانی درخواست حضورِ والا کی خدمت میں بھیجی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کر دی جائے؟"

آپ نے ارشاد فرمایا: "کہو، بیان کرو!"

خسروؒ نے عرض کیا: "حضرت! نصیرالدین کہتے ہیں کہ جب میں اودھ میں ہوتا ہوں تو عقیدت مندوں کا ہجوم بُری طرح عبادت و ریاضت میں مخل ہوتا ہے اور وقت برباد کرتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ان حالات میں نصیرالدین کسی ویرانے میں نکل جایا کرے اور وہاں عبادت و ریاضت کر لیا کرے۔"

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے ذرا بے چینی سے ایک پیر کھینچ لیا اور فرمایا: "خسرو! تم نصیرالدین سے کہہ دو کہ اسے خلق کے درمیان ہی رہنا ہے اور ان کے جور و ظلم اٹھانے پڑیں گے۔ خلقِ خدا اگر انھیں ستائے تو نصیرالدین کو اس کے جواب میں مسکرانا پڑے گا، لوگوں کے جور و ظلم کا جواب مہربانی، خوش اخلاقی اور اچھے سلوک سے دینا پڑے گا۔"

پھر فرمایا: "ذرا نصیرالدین کو بلانا تو!"

خسروؒ نے نصیرالدینؒ کو مطلع کیا کہ آپ کی درخواست حضرت کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے وہ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

نصیرالدینؒ نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا: "حضرت کا رویہ کیسا ہے! انھیں میری درخواست ناگوار تو نہیں گزری؟ ان کی مزاج میں برہمی کے آثار تو نہیں؟"

خسروؒ نے جواب دیا: "حضرت فرماتے تھے کہ آپ کو خلقِ خدا کے درمیان ہی رہنا ہوگا، ان کے جور و ظلم سہنے ہی پڑیں گے اور خلقِ خدا کی زیادتیوں کا جواب مہربانی، سلوک اور خوش اخلاقی سے دینا ہی پڑے گا۔"

نصیرالدینؒ ڈرے سہمے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور پیروں کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

آپ نے نصیرالدینؒ کو دیکھتے ہوئے فرمایا: "نصیرالدین! یہ تجھے کیا سوجھی ہے کہ ویرانے کا خیال اپنے دل میں لایا ہے، آخر جنگل میں رہنے سے تیرا مقصد کیا ہے؟"

نصیرالدینؒ نے جواب دیا: "اس سے اس ناچیز کا مقصد دُنیا اور علائقِ دُنیا سے برأت اور بے زاری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ترکِ دُنیا اور ترکِ لذات اس عاجز کا مقصد اور حضورِ والا کی مرضی اور خواہش کے مطابق گزرانِ حیات مقصدِ اولیٰ ہے۔"

آپ نے دریافت فرمایا: "نصیرالدین! تیرا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

سب رنگ

نصیر الدینؒ نے جواب دیا: "وہ روئی کے سوداگر تھے۔"
آپ نے کہا: "خوب، لوگوں کو گرمی پہنچایا کرتے تھے اور تو ان سے بچنا چاہتا ہے، ہم تجھے جنگل یا ویرانے میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے۔" پھر فرمایا: "بابا نصیر الدین! جب ہم اپنے پیر و مرشد بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہاں ہمارا ایک دوست بھی پہنچ گیا۔ یہ دُنیادار دوست ہمیں پھٹے پرانے لباس میں دیکھ کر کہنے لگا: نظام الدین! تم نے یہ کیسا حُلیہ بنا رکھا ہے؟ اگر تم پیری مریدی کی جگہ معلمی کا پیشہ اختیار کرتے تو نہایت آسودگی اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہوتے۔" ہم نے دوست کی اس دل آزار بات کا کوئی جواب نہ دیا اور تلخ دوا کی طرح حلق کے نیچے اتار گئے۔ اس گفتگو کے بعد جب ہم حضرت بابا کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے میری صُورت دیکھتے ہی دریافت فرمایا۔
"نظام الدین! ایک بات تو بتاؤ؟" ہم نے کوئی جواب نہ دیا تو بابا نے ارشاد فرمایا: "نظام الدین! اگر تیرا کوئی دوست یہ کہے کہ تو نے یہ کیا حُلیہ بنا رکھا ہے، اگر تو معلمی کا پیشہ بھی اختیار کرتا تو تیرا یہ حال نہ ہوتا اور تجھے خوش حالی اور آسودگی میسر ہوتی تو تو کیا جواب دیگا؟"
ہم بابا کے کشف پر حیران رہ گئے اور کہا: "جو حکم عالی ہو عرض کر دیا جائے۔"

بابا نے فرمایا:-

نہ ہمسری تو مرا خویش گیرد برو،
ترا سعادت باد مرا نگونساری،

(اپنے ساتھ میری برابری کا خیال بھی دل نہ لا۔ جا تجھے تیری خوش حالی مبارک ہو، میرے لیے میری عاجزی کافی ہے)

اس کے بعد بابا نے فرمایا: "کھانے کا خوان لا۔" میں کھانے کا خوان لے آیا۔ بابا نے فرمایا: "اسے اپنے سر پر رکھ اور تیرے جس دوست نے تیری تباہ حالی پر اظہار افسوس کیا تھا، اس کے پاس لے جا اور اسے بتلا کہ خوش حالی اور آسودگی ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے فقرا کو محروم رکھا گیا ہو بلکہ ہم خود ہی ان سے حذر کرتے ہیں۔" میں نے بابا کے حکم کی تعمیل کی اور کھانوں کا خوان سر پر رکھ کر دوست کے پاس پہنچ گیا۔ دوست نے خوان پوش ہٹا کر لذیذ اور مرغن کھانوں کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں نے بابا کے ارشادات دُہرا دیے، وہ شرمسار ہو کر بولا: "مُبارک باد دوست! میں یہ سب نہیں جانتا تھا۔"
نصیر الدینؒ پیر و مرشد کی باتیں نہایت انہماک سے سُن رہے



سے کسی نے پُوچھا: "زندگی کیا ہے؟"
غزالیؒ نے جواب دیا: "مسافر!"
سوال کرنے والے نے اس عجیب جواب کی وضاحت چاہی۔ پُوچھا: "اس کا آغاز، انجام اور اس کی شاہراہ کی دُوسری علامتیں کون کون سی ہیں؟"
غزالیؒ نے جواب دیا: "اس کا آغاز مہد ہے اور انجام لحد ہے۔ اس کے سفر کی منزلیں سال ہیں، مہینے اس کے میل ہیں، دن سنگِ میل اور اس کا ہر سانس ایک قدم ہے!"

تھے اور اپنی درخواست عزلت نشینی اور ویرانہ پسندی پر نادم ہو رہے تھے۔ حضرت محبُوب الٰہی نے انھیں خجالت اور شرمساری سے بچانے کے لیے حکم دیا: "جاؤ اور ہماری باتوں کو ذہن نشین رکھو!"
نصیر الدینؒ نیچے خانقاہ میں واپس آ گئے۔

❁

کسی پیر بھائی کے ہاں محفل سماع منعقد ہوئی، قوالوں کی چوکی سازوں کے ساتھ براجمان تھی۔ اس تقریب میں نصیر الدینؒ بھی موجود تھے۔ قوالی کے شروع ہونے سے پہلے ہی یہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔
پیر بھائی نے حضرت سے پوچھا: "کہاں چلے نصیر الدین؟"
انھوں نے جواب دیا: "میں قوالی کی محفل میں نہیں بیٹھ سکتا۔"
پیر بھائی نے پوچھا: "وہ کیوں؟"
آپ نے جواب دیا: "اسلام موسیقی کے حق میں نہیں ہے۔"
پیر بھائی نے ذرا بدمزگی سے کہا: "کہاں کی بات کرتے ہو نصیر الدین! سماع سے منکر ہو کر اپنے پیر کے مشرب سے پھر جانے کے مرتکب ہو رہے ہو، کیا تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا؟"
آپ نے جواب دیا: "یہ کوئی حجت نہیں ہے، دلیل تو کتاب اور حدیث سے ملنا چاہیے جو ظاہر ہے تم نہیں پیش کر سکتے۔"
نصیر الدینؒ وہاں سے چلے گئے۔ کسی مُرید نے حضرت نظام المشائخؒ سے ان کے اس رویے کی شکایت کر دی۔ کہا: "حضرت! نصیر الدین آپ کے مشرب سے گریزاں ہیں۔"
محبُوب الٰہیؒ نے جواب دیا: "نصیر الدین کو کچھ بھی نہ کہو، ان کا تقویٰ تم سب سے بڑھا ہوا ہے۔"
حضرت محبُوب الٰہیؒ نے آپ کو اپنے بعد نہ صرف خلافت سے

سرفراز فرمایا بلکہ محمود گنج شرف اور چراغ دہلی جیسے اعلا و ارفع القاب سے بھی نوازا۔

ایک دن جب آپ نے پہننے کے لیے اپنا لباس طلب فرمایا تو پتہ چلا کہ وہ چوری ہو چکا ہے۔ لوگوں نے کہا: "حضرت! آپ مستجاب الدعوات ہیں، چور کے حق میں بد دُعا فرمائیں تاکہ وہ کیفر کردار کو پہنچے۔"

آپ نے جواب دیا: "میں اپنے پیر و مرشد کے ارشاد گرامی کے خلاف کس طرح زبان کھول سکتا ہوں۔"

ایک مرید نے کہا: "حضرت! بابا نظام الدین کو وصال فرمائے کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ انھوں نے اس چوری کی بابت کیا اور کب ارشاد فرمایا ہے؟"

آپ نے فرمایا: "حضرت نے مجھ سے فرمایا تھا کہ لوگ تجھ پر جور و ظلم کریں گے تو اسے بے چون و چرا برداشت کرے گا۔ لوگ تجھے ستائیں گے تو ان کے ساتھ سلوک اور مہربانی سے پیش آئے گا۔"

مرید خاموش ہو رہا اور آپ چور کے حق میں دعائے خیر فرماتے رہے۔

تراب نامی ایک درویش مدتوں سے آپ کے خلاف عناد رکھتا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ آپ بھی اس کے ارادوں سے آگاہ تھے لیکن کبھی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں اور نہ ہی کسی اور پر اس خطرے کا اظہار کیا۔ ایک دن آپ مراقبے میں آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ حجرے میں آپ کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ باہر مرید بھی ذکر اشغال میں گم صُم بیٹھے تھے۔ تراب نے سوچا اس سے بہتر موقع شاید کبھی اور نہ ملے۔ چھُرے کو تہبند میں اڑسا اور کرتے کو اُوپر ڈال کر حجرے میں داخل ہو گیا۔ آپ نے تراب کی آمد پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ تراب نے پھُرتی سے چھُرا نکالا اور پے در پے گیارہ وار کیے اور اس یقین کے بعد کہ کام تمام ہو چکا ہے، چھُرا حجرے میں پھینک کر بھاگ نکلا لیکن خون کے فوارے اس کے تہبند اور کرتے کو داغ دار کر چکے تھے۔ اور وہ بد حواس بھی بہت زیادہ تھا۔ جب حجرے سے باہر نکلا تو مریدوں نے اس بُرے حال میں دیکھ لیا اور کئی مرید تراب پر حملہ آور ہوئے انھوں نے تراب کو گرا کر بے قابو کر دیا اور اس سے پوچھا: "تیرے لباس پر خون کے یہ دھبے کیسے ہیں؟"

تراب اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ ایک مرید حجرے میں داخل ہوا اور وہاں اپنے پیر کو زخموں سے چُور کراہتے ہوئے دیکھا تو اس کے حواس ہی جاتے رہے۔ اس نے شور و غل مچا کے دُوسرے مریدوں کو بھی بلا لیا اور فوراً طبیب اور جراح لائے گئے۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ معالجین نے زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن اس دوران میں آپ ہوش میں آ گئے اور شدید کرب اور اذیت کے باوجود متبسم ہو کر فرمایا: "تراب کہاں ہے؟"

اشکبار مرید نے جواب دیا: "حضرت! اسے باندھ کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔"

آپ نے ناگواری سے حکم دیا: "اسے ہمارے پاس لاؤ۔"

آپ کے معالج حکیم صدر الدین نے کہا: "حضرت آپ بات چیت سے اجتناب فرمائیں، زخم مہلک ہیں۔"

آپ نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا: "ابھی میرا وقت نہیں آیا۔"

حاضرین حیران تھے اور دل میں سوچتے تھے کیا اب بھی زندگی کے آثار موجود ہو سکتے ہیں۔ پھر بھی یہی کہا: "حضور! آپ سکوت اور آرام فرمائیں۔"

آپ نے پھر حکم دیا: "تراب کو ہمارے پاس لاؤ!"

لوگوں نے کہا: "آپ صحت مند ہو لیں، اسے فرار نہیں ہونے دیا جائے گا، آپ تشویش نہ فرمائیں۔"

لیکن اس بار آپ نے ذرا ترش لہجے میں فرمایا: "اسے ہمارے پاس لاؤ، وہ ہمارا مجرم ہے اسے ہم خود سزا دیں گے۔"

لوگوں نے تعمیلِ ارشاد میں تراب کو آپ کے رُوبرُو پیش کر دیا بیسیوں مریدوں کے درمیان قاتل اپنے زخمی کے رُوبرُو کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تُو نے اپنے چھُرے سے کتنے وار کیے تھے بھلا؟"

تراب شرم و ندامت اور خوف کی وجہ سے کوئی جواب نہ دے سکا

آپ نے پھر سوال کیا: "بتاتا کیوں نہیں؟ کتنے وار کیے تھے تُو نے؟"

قاتل نے آہستہ سے جواب دیا: "گیارہ!" اور گردن جھکالی۔

آپ نے پھر سوال کیا: "آہستہ آہستہ یا زور زور سے؟"

اس عجیب سوال پر لوگ ان کی صُورت دیکھنے لگے۔ قاتل کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

آپ نے پھر سوال کیا: "تُو نے یہ وار پُوری قوت سے کیے تھے یا یوں ہی معمولی قوت سے؟"

شرمسار اور خوف زدہ قاتل نے جواب دیا: "پُوری قوت سے۔"

آپ نے کہا: "تیرے ہاتھ کو ان حملوں سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟"

قاتل سمجھا، نصیر الدینؒ شاید اپنے ہوش میں نہیں ہیں تبھی تو ایسے مہمل سوال کر رہے ہیں لیکن اسی لمحے نصیر الدینؒ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا: "دیکھ اندر حجرے میں جا، وہاں کچھ اشرفیاں رکھی ہیں اور وہیں ایک قیمتی لباس بھی رکھا ہے جو آج ہی ایک امیر نے ہمیں بھیجا تھا، انھیں یہاں ہمارے پاس لے آ۔"

مرید بے چون و چرا یہ دونوں چیزیں حجرے سے لے کر واپس آیا۔ آپ نے یہ دونوں چیزیں اپنے قاتل کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا۔ "سر دست اس فقیر کے پاس ان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تو انھیں قبول کر اور جہاں جانا چاہتا ہے چلا جا، پھر کبھی آئیو، جو کچھ ہمارے پاس ہوگا حاضر کر دیں گے۔"

مریدوں نے عرض کیا: "حضور! یہ کیا غضب فرماتے ہیں۔ یہ شخص تو آپ کا قاتل ہے۔ سزا دینے کے بجائے آپ اسے اشرفیوں اور لباس سے نواز رہے ہیں یہ کیوں؟"

آپ نے فرمایا: "مشیت ایزدی میں دم مارنے کا حکم نہیں، خاموش رہو!"

حکیم صدر الدین نے کہا: "حضرت! اس انوکھے حکم میں مشیت ایزدی کا کیوں ذکر فرما رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "ہمارے پیر حضرت نظام المشائخؒ نے بہت پہلے ہی یہ حکم دے دیا تھا کہ نصیر الدین! لوگ تجھ پر ظلم و جور کریں گے لیکن تو ان سے مہربانی، سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آئے گا۔ لوگ تجھے ستائیں گے تو انھیں معاف کر کے نوازے گا، اس وقت بھی حضرت محبوب الٰہی کی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی اپنے ارشاد کی تعمیل کا تقاضا کر رہی ہیں۔"

آپ نے قاتل کو اشرفیاں اور لباس عطا فرما کر معاف کر دیا اور اسی وقت رخصت فرما دیا۔ قاتل حیران و پریشان، شرمسار اور نادم ہو کر ایسا گیا کہ پھر کبھی معافی مانگنے بھی حاضر نہ ہوا۔



سلطان محمد تغلق کے دو با اثر امیر عمر سمر قندی اور علی قندھاری معلوم نہیں کیوں آپ سے بے حد جلتے تھے اور ہر وقت سلطان کے کان بھرتے رہتے تھے۔ ایک دن بادشاہ نے آپ کو دعوت کے بہانے طلب کیا۔ جب آپ بادشاہ کے روبرو پہنچے تو دیکھا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا لگا ہوا ہے۔ سلطان کا مقصد یہ تھا کہ اگر نصیر الدین سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا نوش فرمالیں گے تو بادشاہ انھیں حیلۂ شرعی سے سزا دینے میں حق بجانب قرار پائے گا اور اگر انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو بادشاہ انھیں توہین سلطانی کے جرم میں قید کر دے گا۔ آپ بادشاہ کی منشا سے خبردار ہو چکے تھے۔ آپ نے چمچی میں ذرا سا کھانا لے کر زبان پر رکھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ بادشاہ اس تدبر اور ذہانت پر دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا۔ عمر سمر قندی اور علی قندھاری شرمندہ ہو گئے۔ بادشاہ نے از راہ مراسم خسروانہ دو توڑے زر سرخ اور دو تھان آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے ان پر کوئی توجہ نہ دی اور واپسی کی نیت سے چل پڑے۔ سلطان محمد تغلق کا وزیر نظام الدین یہ ساری کارروائی نہایت غصے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حضرت نظام الدینؒ اولیا کا مرید، نصیر الدینؒ کا عقیدت مند اور بادشاہ کا عزیز بھی تھا۔ نصیر الدینؒ کو واپس جاتے دیکھ کر آگے بڑھا، زر سرخ کے توڑے اور دونوں تھان اٹھا کر خدام کے حوالے کیے اور آپ کی جوتیوں کو اپنے رومال سے جھاڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے کر دو قدم پیچھے ساتھ ساتھ چلا، بادشاہ یہ ساری کارروائی بہ نظر حقارت دیکھ رہا تھا اور اپنے وزیر پر سخت برہم تھا لیکن خاموش تھا۔ وزیر نے نصیر الدین کو دروازے تک پہنچا کر رخصت چاہی۔ آپ نے دے دی۔ یہ جیسے ہی بادشاہ کے پاس واپس پہنچا، سلطان نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا: "تو نے اجازت کے بغیر عطیہ سلطانی کو ہاتھ کیوں لگایا؟"

وزیر نے کوئی جواب نہ دیا اور نفرت اور غصے سے پیشانی پر بل پڑ گئے۔

بادشاہ نے ذرا اور اونچی آواز میں پھر سوال کیا: "تو ہماری مملکت کا وزیر ہے، تو نے ایک معمولی فقیر کی جوتیاں اپنے رومال سے کیوں جھاڑیں اور کفش برداری کی خدمت کیوں بجا لایا؟"

وزیر نے پھر کوئی جواب نہ دیا لیکن غصے اور نفرت کی سلوٹیں کچھ زیادہ گہری ہو گئیں۔ سلطان اور زیادہ برہم ہو گیا، چیخ کر بولا۔ "تو ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر نصیر الدین کو دروازے تک چھوڑنے کیوں گیا؟"

وزیر کے لیے اب مزید خاموش رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت دلیری سے جواب دیا: "حضور والا! صاف گوئی اور راست بیانی کی گستاخی معاف، اس ملک کے سلطان آپ نہیں، نصیر الدین ہیں، وہ جسے چاہیں سلطان بنا دیں، یہ ناچیز حضرت نظام الدین اولیا کا غلام ہے اور میری یہ جان ناتواں ان پر قربان ہے۔ نصیر الدین کی جوتیاں میرے لیے سرمایۂ فخر و افتخار ہیں اور اگر میں انھیں تاج بنا

کے، اپنے سر پر رکھوں تو یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوگی۔"
بادشاہ کو اس جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن اس کا عملاً اظہار نہ ہوا۔

بادشاہ ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوا تو لشکر کے ساتھ آپ بھی ہو لیے۔ شاہی لشکر میں آپ کی شمولیت ایک پُراسرار عمل تھا۔ مستقبل کے دریچے کھلے ہوئے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ٹھٹھہ میں کیا پیش آنے والا ہے۔

ٹھٹھے پہنچ کر شاہی لشکر باغیوں کی سرکوبی ابھی کر بھی نہ سکا تھا کہ سلطان محمد تغلق کا بلاوا آ گیا۔ وہ چل بسا۔ بادشاہ کی بہن خداوند زادہ لشکر میں موجود تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بادشاہ کا جانشین بنانا چاہا۔ دہلی دُور تھا اور وہاں وزارت مطلقے نے تخت شاہی اور تاج قیصری کیلئے کسی اور شخص کا انتخاب کر چکی تھی۔ اس افراتفری اور منتشری میں حضرت نصیر الدین بادشاہ کے پینتالیس سالہ چچازاد بھائی کمال الدین کے پاس پہنچے۔ سفید رنگت، درمیانی قد اور مناسب ڈیل ڈول، نہ موٹے نہ دُبلے، ناک اونچی اور چوڑے سینے والا یہ شخص فکرمند اور غمگین اپنے خیمے میں منہ لپیٹے پڑا ہوا تھا۔ نصیر الدینؒ اس کے خیمے میں داخل ہوئے اور آواز دی: "کمال الدین! اٹھو، میں ایک ضروری فیصلہ لے کر آیا ہوں۔ اسے سنو اور مجھے بتاؤ کہ تم اس پر کتنے آمادہ ہو؟"

کمال الدین فرطِ عقیدت سے کھڑا ہو گیا۔

آپ نے کمال الدین سے کہا: "کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ مخلوقِ خدا کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آؤ گے؟"

کمال الدین آپ کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا، پوچھا: "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بندگانِ خدا سے اچھا سلوک کرو گے تو میں بھی بارگاہِ خداوندی سے تمہاری بادشاہت کی دُعا کروں گا اور اگر تم نفی میں جواب دو گے تو میں کسی دوسرے فرماں روا کو طلب کروں گا۔"

کمال الدین نے کہا: "میں حضور کا خادم ہوں جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کروں گا۔"

آپ نے ارشاد فرمایا: "کمال الدین! میں تیرے لیے دہلی سے چل کر ٹھٹھے تک آیا ہوں، اگر تو صدقِ دل سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تو خلقِ خدا کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آئے گا تو میں بھی تیرے لیے خدا سے حکومت طلب کرتا ہوں۔"



زمین پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لوگ اُن کے پاس سے گزرتے اور انھیں حساب کتاب میں محو دیکھ کر کوئی سوال کیے بغیر آگے بڑھ جاتے۔ ایک شخص ان کے پاس رُک گیا اور جھک کر غور سے دیکھنے لگا کہ آخر وہ لکھ کیا رہے ہیں۔ اُس نے دیکھا زمین پر دُور تک ہندسوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ خواجہ کسی چیز کا حساب کر رہے تھے۔

اُس نے پوچھا: "حضرت! یہ آپ کس چیز کا حساب کر رہے تھے؟"

خواجہ احمدؒ نے سر اُٹھا کر اس شخص کو دیکھا اور جواب دیا۔ "میں ایک سوال حل کر رہا ہوں!"

اس شخص نے کہا: "مجھے علمِ ریاضی سے بڑی دلچسپی رہی ہے سوال بتایئے شاید حل کر دوں۔"

خواجہ احمدؒ نے جواب دیا: "سوال حل کر چکا ہوں سوال اور اس کا جواب تم بھی سُن سکتے ہو!" پھر ہندسے ساٹھ کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا: "یہ میری عمر کا ہندسہ ہے، اس وقت میری عمر ساٹھ سال کی ہے۔ ساٹھ سال کے اکیس ہزار چھ سو دن بنتے ہیں، اگر مجھ سے تاخیر، سُستی، غیبت، دل آزاری اور اللہ کی عبادت میں غفلت جیسے پانچ گناہ ہر روز سرزد ہوئے ہوں تو گویا اب تک میں ایک لاکھ آٹھ ہزار گناہوں کا مرتکب ہو چکا ہوں۔" اس کے بعد سرد آہ بھر کر بولے "اور جس شخص کا نامۂ اعمال اس حد تک سیاہ ہو چکا ہو وہ کس طرح نجات کی توقع کر سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے۔

اس کے بعد آپؒ نے کمال الدین کو اُنتالیس خرمے پیش کیے اور ارشاد فرمایا: "اُنتالیس سال۔ حکومت اور تاج و تخت کی امانت اُنتالیس سال کے لیے تیرے سپرد کی گئی۔"

یہاں یہ فیصلہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف لشکر میں مرحوم بادشاہ کی جانشینی پر گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں اور بادشاہ کی بہن خداوند زادہ نے جملہ خوانین اور امرا کو یہ پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا خسرو ملک لشکر میں موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں کسی اور کو زمامِ روا نہ ماننا ناجائز اور نامناسب ہے۔

بادشاہ میرا حقیقی بھائی تھا۔"

خوانین اور امرا کو خداوندزادہ کی بات پر دھیان دینا پڑا لیکن وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں خداوندزادہ کے خلاف گردِ تکدر بیٹھ گئی۔ انھوں نے اپنی جماعت میں سے ملک سیف الدین نامی ایک منہ پھٹ اور گستاخ امیر کو خداوندزادہ کی خدمت میں روانہ کیا اور اس سے کہا "تم ہر قیمت پر اسے اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ اپنے بیٹے خسرو ملک کی جانشینی سے باز آ جائے۔"

ملک سیف الدین ایک سچا اور کھُردری شخصیت کا انسان تھا۔ فوراً خداوندزادہ کی بارگاہ میں پہنچ گیا اور اس سے سوال کیا "اے عورت! تیرا فرزند لائق جہاں داری نہیں ہے۔ اس سے باز آجا، اگر ہم سب تیری خواہش پوری کر دیں تو یقین رکھ کر مغلوں کے حملوں کو کمال الدین فیروز شاہ کے سوا کسی میں بھی روکنے کا دم نہیں ہے۔"

خداوندزادہ نے کہا "سیف الدین! تم ایک سچے اور صاف گو انسان ہو، تمھی بتاؤ کیا میں نے جو کچھ چاہا ہے غلط چاہا ہے؟"

گستاخ صاف گو امیر نے جواب دیا "عورت! تو ہمارے فیصلے سے اتفاق کر اور کمال الدین فیروز کو فرماں روا تسلیم کرلے۔ اگر نہیں مانے گی تو آگے کے نتائج کی تو خود ذمہ دار ہوگی۔"

خداوندزادہ چپ ہو رہی کیونکہ سیف الدین کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔

امرا اور خوانین تاجِ شاہی اور لباسِ خسروی لے کر کمال الدین فیروز کی خدمت میں پہنچے اور اس سے درخواست کی کہ مرحوم بادشاہ کی جانشینی قبول فرمائے۔

کمال الدین فیروز کو ذرا تامل ہوا۔ وہ اتنی بڑی ذمے داری قبول کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ نصیر الدینؒ آگے بڑھے اور حکم دیا۔ "کمال الدین! اب تو فیروز شاہ ہے۔ خواہ مخواہ سوچ میں وقت نہ ضائع کر اور تاج اور لباسِ شاہی زیبِ تن فرما!"

فیروز شاہ اس وقت ماتمی لباس میں تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ امرا نے درخواست کی کہ اس خوشی کے موقع پر ماتمی لباس اتار دیا جائے لیکن فیروز شاہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور جامۂ ماتم پر ہی خلعتِ شاہی زیبِ تن کی گئی۔ بارگاہِ شاہی کے نقیبوں اور چاؤشوں نے مبارک سلامت کی صدائیں بلند کیں اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ فیروز شاہ اسی وقت حرم میں داخل ہوا اور خداوندزادہ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ خداوندزادہ نے فیروز شاہ کو سینے سے لگالیا اور مرحوم بادشاہ کی کلاہ اپنے ہاتھوں سے فیروز شاہ کے سر پر رکھ دی۔

فیروز شاہ ٹھٹھے سے واپس ہوا۔ ابھی وہ ملتان تک ہی پہنچا تھا کہ دہلی سے وزیر اعظم خواجہ جہاں کا فرستادہ ملیح تون پہنچ گیا۔ اس کی گردن میں مرحوم بادشاہ کے فرضی بیٹے کی طرف سے ایک فرمان لٹک رہا تھا۔ اس فرمان میں اسے مرحوم بادشاہ کے بیٹے کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ فیروز شاہ حیران تھا کہ مرحوم بادشاہ کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی پھر یہ بیٹا کہاں سے آگیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر فکرمند ہوگیا کہ یہ ساری عیاری خواجہ جہاں وزیر اعظم ملکتِ تغلقیہ کی ہے۔

فیروز شاہ کے قیاس کی تصدیق دہلی کے فرستادے نے بھی کر دی۔ فیروز شاہ نے مطمئن لہجے میں کہا "کوئی پروا نہیں، جب خدا مہربان ہو تو کوئی بندہ کیا کرسکتا ہے!؟"

اس کے بعد فیروز شاہ نے اپنے خدشات کا ذکر نصیر الدینؒ سے کیا اور ان سے دعائے طمانیت کا طلب گار ہوا۔ آپ نے جواب دیا "ہم نے ٹھٹھے میں تجھے بادشاہ بنا دیا تھا۔ دہلی کی بھی فکر کریں گے۔ اداس اور مایوس مت ہو۔"

فیروز شاہ خاموش ہو رہا۔

جب یہ قافلہ ہانسی کے نواح میں پہنچا تو نصیر الدینؒ نے بادشاہ سے کہا "ٹھٹھے سے یہاں تک ہم تجھے بحفاظت لے آئے۔ لیکن یہاں سے قطب الدین منورؒ کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اب تو ان سے دعا اور اعانت کا طالب ہو۔"

قطب الدین منورؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید اور ہانسی کے خلیفہ تھے اور نصیر الدینؒ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

فیروز شاہ ہانسی کے باہر ہی مقیم ہو گیا اور اس نے قطب الدین منورؒ کو ایک خط روانہ کیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"حضورِ والا! ناچیز فیروز شاہ کو حضرت نصیر الدین روشن چراغؒ سے معلوم ہوا ہے کہ یہ علاقہ حضرت قطب الانام شیخ قطب الدینؒ کی ولایت میں داخل ہے۔ انھوں نے اس گناہ گار کو آپ کے سپرد فرمایا ہے۔ اب جیسا مناسب ہو اس سے مطلع فرمایا جائے۔"

فوراً ہی اس کا جواب بھی آگیا۔ حضرت قطب الدین منورؒ نے جواب میں لکھا تھا "حضرت شیخ نصیر الدین روشن چراغؒ نے تجھے اس ضعیف کے حوالے کیا ہے اس لیے مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہی امید ہے دہلی کی بادشاہت تیرے قبضے میں آجائے گی۔"

دہلی میں مرحوم بادشاہ کا وزیر فیروز شاہ سے جنگ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا لیکن عالم یہ تھا کہ ہوا اکھڑی جا رہی تھی۔ سلطنت کے امراء اور خوانین چوری چھپے بھاگ کر فیروز شاہ کے اردگرد جمع ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے قریب ترین ساتھیوں تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخرکار ہر طرف سے مایوس ہو کر خواجہ جہاں بھی فیروز شاہ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہو گیا کہ لوہے کی زنجیر اس کے گلے میں پڑی تھی، اس نے دستار کی جگہ ٹوپی پہن رکھی تھی اور برہنہ شمشیر گلے میں ڈال رکھی تھی۔ وہ اس حلیے میں فیروز شاہ کے خیمے کے بائیں طرف مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ نماز ظہر کے بعد جب خیمہ شاہی کا پردہ اٹھایا گیا تو بادشاہ کی نظر خواجہ جہاں پر پڑی۔ حیرت سے خدام کو مخاطب کیا: "خواجہ جہاں سے دریافت کیا جائے کہ اس نے اپنی گردن میں فولادی زنجیر اور عریاں شمشیر کیوں ڈال رکھی ہے؟"

خواجہ جہاں نے جواب دیا: "حقیر اپنی تقصیر پر نادم اور بادشاہ کی کرم گستری کا منتظر اور امیدوار ہے۔"

فیروز شاہ نے خدام کو حکم دیا: "خواجہ جہاں کے سر پر دستار باندھی جائے اور اس کے لیے شاہی خیمے سے متصل ایک خیمہ نصب کر دیا جائے۔"

حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور خواجہ جہاں کو اس خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ فیروز شاہ خود بھی اس خیمے میں پہنچا اور خواجہ جہاں سے کہا: "حضرت روشن چراغؒ نے اس خاکسار کو تاج و تخت کی بشارت دی تھی اور حضرت قطب الدین منورؒ نے اشاروں کنایوں میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تو دہلی کی فکر کیوں کرتا ہے، دہلی تو خود ہی تیری خدمت میں بہت حاضر ہو جائے گی۔ اب آج جب ہم تجھے اپنے روبرو عاجز اور ناچار دیکھتے ہیں تو حضرت روشن چراغؒ اور قطب الدین منورؒ کی عزت دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ان حضرات کا دور اور صحبت میسر آئی۔"

بادشاہ خواجہ جہاں کو معاف کر دینا چاہتا تھا لیکن درباری امراء اور خوانین نے بادشاہ کو رحم دلی سے باز رکھا اور خواجہ جہاں کے قتل کا فرمان حاصل کر لیا جس کے نتیجے میں خواجہ جہاں کو قتل کر دیا گیا۔

بادشاہ دہلی کے تاج و تخت پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد ہانسی جانے پر آمادہ ہوا۔ روشن چراغؒ بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔ جب بادشاہ ہانسی میں داخل ہوا، قطب الدین منورؒ نمازِ جمعہ کی غرض سے مسجد تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے ہی میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ قطب الدین منورؒ اور حضرت نصیر الدینؒ ایک دوسرے کے قدموں میں یوں جھکے جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے پاؤں پکڑ کر رہیں گے لیکن روشن چراغؒ سے پہلے قطب الدینؒ ان کے قدموں میں جھک چکے تھے۔ پریشان حال بادشاہ اور لشکریوں کو لوگ اسی لیے تو زیادہ ماننے لگے تھے کہ انہیں دہلی کا تاج و تخت انھی دونوں حضرات کی دعاؤں سے ہاتھ آیا تھا۔

قطب الدینؒ نے بادشاہ سے کہا: "فقیر جمعے کی نماز کی نیت سے نکلا تھا کہ بادشاہ کو آتے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ یہ ناچیز سوچتا ہے کہ اب گھر کس طرح جایا جائے گا؟"

فیروز شاہ چپ سادھے کھڑا رہا۔

نصیر الدین چراغؒ اور قطب الدین منورؒ کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ان نظروں میں پتہ نہیں کیا پیام تھا کہ قطب الدین منور سب کچھ سمجھ گئے۔ بادشاہ سے کہا: "دعاگو نے سنا ہے کہ بادشاہ کو مے خواری کا بے حد شوق ہے اور اس شغل کی وجہ سے اہل حاجت کی کاربراری میں رخنہ پڑتا ہے۔"

بادشاہ نے عاجزانہ عرض کیا: "انشاء اللہ آئندہ یہ ناچیز شغلِ مے کشی سے محفوظ رہے گا۔"

آپ نے پھر ارشاد فرمایا: "دعاگو نے سنا ہے کہ بادشاہ کو صید افگنی کا بھی بہت شوق ہے۔ اپنے شکار کے شوق کے لیے ایک عالم کو پریشان اور سرگرداں رکھنا اچھا مشغلہ نہیں ہے۔ شکار اس حد تک جائز ہے کہ تیری اس سے حاجت پوری ہو جائے۔"

فیروز شاہ نے عاجزی سے جواب دیا: "حضرت شیخ اس ناچیز کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مشغلے سے باز رکھے۔"

قطب الدین منورؒ نے طنز سے ارشاد فرمایا: "سبحان اللہ ہماری دعا کا منکر ہوا۔ کیا تجھے کل کی بات بھی یاد نہیں کہ نصیر الدینؒ اور ہم نے تیرے حق میں کیسی دعائیں کی تھیں۔ تو تو ہماری دعا کا منکر ہے۔ تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں نے توبہ کر لی اور آئندہ اس مشغلے سے باز رہوں گا۔"

بادشاہ نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی اور آہستہ آہستہ توبہ کرنی شروع کر دی۔

حضرت نصیر الدینؒ مسکراتے رہے۔

فیروز شاہ کا وزیر خان جہاں پہلے ہندو تھا اور تلنگانے سے تعلق رکھتا تھا، اسلام قبول کر کے حضرت چراغ دہلوی کا مرید ہو گیا اور

پوچھا: "حضرت! یہ عاجز، عبادت اور ریاضت کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہے۔ اگر حکم ہو تو دریافت کرے۔"

آپ نے کہا: "پوچھو!"

خان جہاں نے کہا: "غلام کو کس طرح ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہونا چاہیے؟"

آپ نے جواب دیا: "خان جہاں! تو وزیر ہے اور یہی تیری عبادت ہے، حاجت مندوں کی حاجت براری کرتا رہ، غربا کا خاص خیال رکھ اور دل آزاری سے باز رہ۔"

خان جہاں نے پھر سوال کیا: "اوراد و وظائف کی بابت بھی کچھ ارشاد ہو۔"

آپ نے جواب دیا: "اوراد و وظائف بھی یہی ہیں کہ حقوق العباد کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی اختیار کرنا، مسندِ وزارت پر نشست کے دوران بھی اگر وضو ٹوٹ جانے کا احساس ہو جائے تو فوراً اٹھ کھڑے ہونا اور وضو کر کے دوبارہ بیٹھ جانا۔ رات کو جب آنکھ کھلے تو پہلا کام وضو کرنا ہوگا۔ زندگی بھر اس پر کاربند رہ اور پھر دیکھ کہ خدا تیرے لیے کیا کرتا ہے۔"

خان جہاں زندگی بھر اس نصیحت پر عمل کرتا رہا اور جب اس کا انتقال ہوا تو اسے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے قریب دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت چراغ دہلویؒ کا جب آخری وقت آیا تو آپ کے پاس، آپ کے چند مرید موجود تھے۔ ان مریدوں میں حضرت میر سید محمد گیسو درازؒ بھی شامل ہیں۔ آپ نے وفات سے قبل اپنے مرید شیخ رکن الدین (ہمشیرزادہ چراغ دہلویؒ) سے فرمایا: "رکن الدین! خواجگانِ چشت کی نعمتوں میں سے جتنا بھی تمہاری قسمت میں تھا، دے دیا گیا لیکن خرقہ، کاسہ چوبیں، تسبیح، نعلین اور عصا میں کسی کو بھی نہ دے سکوں گا۔"

رکن الدین نے ملول ہو کر جواب دیا: "حضرت کی مرضی۔"

حضرت گیسو درازؒ کو اس وصیت سے صدمہ پہنچا اور پوچھا۔

"حضرت! گستاخی معاف۔ کیا یہ ناچیز بھی اس سے محروم رکھا جائے گا؟"

آپ نے جواب دیا: "میرا خرقہ لے سکتے ہو لیکن اپنے پیر کا خرقہ اور دیگر متبرکات میں نہیں دوں گا۔"

رکن الدین نے آبدیدہ نظروں سے آپ کو دیکھا اور دریافت کیا: "حضور! متبرکات حضرت شیخ المشائخؒ کے لیے اور کیا ارشاد ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "جب تم مجھے قبر میں اتارنا تو کاسہ چوبیں کو سر کے نیچے، خرقہ سینے پر، تسبیح انگلیوں کے نیچے، ایک طرف نعلین اور دوسری طرف عصا رکھ دینا۔"

بعد وصال وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ ۱۷ اور ۱۸ رمضان کی درمیانی شب اور ۷۵۷ھ (ستمبر ۱۳۵۶ء) کو یہ مہر درخشاں ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اشیائے متبرکہ کا اپنے ساتھ لے جانا اور کسی مرید کو نہ دینا بہتوں کو شاق گزرا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت گیسو درازؒ نے پیر کی مفارقت اور خرقۂ متبرکہ کے نہ ملنے کا اتنا دکھ محسوس کیا کہ دہلی کو فوراً چھوڑ دیا۔ حضرت چراغ دہلویؒ نے جس چارپائی پر وصال فرمایا تھا اس کا جھلنگا اپنے گلے میں ڈال لیا اور کہا: "یہی میرا خرقہ ہے۔" اور دکن چلے گئے۔

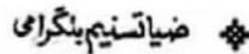
کچھ عرصے بعد حضرت چراغ دہلویؒ کا ایک ارادت مند آپ کے مزار پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھ کر دل میں سوال کیا: "حضرت! اب تو بتا دیجیے کہ آپ نے اشیائے متبرکہ اپنے مریدوں میں سے کسی کو کیوں نہ مرحمت فرمائیں؟"

جب یہ ارادت مند رات کو سو گیا تو حضرت چراغ دہلویؒ نے خواب میں جواب دیا: "تیرا یہ خیال درست ہے کہ میرے بعض مرید صاحب کرامت ہیں اور مقامات بلند رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان سب کے دلوں میں تعصبات کی رمقیں پھر بھی پائی جاتی ہیں۔ جس دل میں تعصب ہو وہ کس طرح اس مقدس امانت کا حق دار بن سکتا ہے۔" پھر آپ نے مزید فرمایا: "لیکن بعض مریدوں کو میں نے اپنا خرقہ ضرور دیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ان شاء اللہ سلسلۂ پیرانِ چشت ان سے جاری رہے گا۔"

شاہجہان آباد سے چھ کوس پر جنوب میں یہ ذات بابرکات ابدی خواب گاہ میں محوِ استراحت ہے۔ وہ ذات جسے حضرت نظام الدین اولیاؒ نے روشن چراغ دہلی کا لقب مرحمت فرمایا تھا۔ آپ کی درگاہ کا گنبد فیروز شاہ نے آپ کی زندگی ہی میں تعمیر کرا دیا تھا اور درگاہ کا دروازہ بارہ برس بعد فیروز شاہ نے ہی تعمیر کرایا۔

بارہ دری والے اس گنبد میں سنگِ خارا کے ستون بنائے گئے ہیں اور جملہ دروں میں سنگِ سرخ کی جالیاں لگائی گئیں۔ گنبد پر سنہری کلس آج بھی سورج کی روشنی میں اس طرح چمکتا ہے جیسے روشن چراغ دہلویؒ اس کلس میں منعکس ہو کر قرب و جوار کو منور کر رہے ہیں





ضیا تسنیم بلگرامی

خلافتِ عباسیہ نے ضرورت محسوس کی کہ بغداد کے قریب اور دُور علاقوں کے حاکموں اور سرداروں کو طلب کیا جائے۔ خلیفہ کو ان میں سے بعض کی شکایات موصول ہوئی تھیں اور بعض کے حسنِ انتظام نے اسے متاثر کیا تھا۔ خلیفہ ان میں سے ایک کی سرزنش اور دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا۔ فرمان جاری ہو گیا اور حاکموں اور سرداروں کی جانب بغداد روانگی عمل میں آ گئی۔ بغداد میں داخل ہونے والی شاہراہیں آباد ہو گئیں۔ گھوڑوں پر سوار عامل اور سردار اپنے سپاہیوں اور دوسرے منصب داروں سے باتیں اور ہنسی مذاق کرتے بغداد سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اِن کے غلام پیچھے اونٹوں پر اور مستورات محملوں میں سوار ہچکولے کھاتی اور محمل کے پردوں سے جھانکتی ہوئی مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان کے بھی پیچھے باربردار اونٹ اور خچر تھے جنھیں اُجڈ اور درشت مزاج غلاموں نے کچھ اس طرح اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا گویا ان پر ڈاکا ہی پڑنے والا ہے اور یہ اُجڈ، درشت مزاج اور خونخوار غلام ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے قصرِ خلافت سے ذرا فاصلے کے میدانوں میں خیموں کی فصل سی اُگ آئی۔ چاروں طرف مختلف جسامت اور رنگوں کے خیمے اس طرح لہلہانے لگے گویا دامنِ کہسار میں رنگوں کی بہار آ گئی ہو۔

خلیفہ بھی محل سے باہر آ گیا اور اپنے غیر معمولی طویل و عریض خیمے میں حاکموں اور سرداروں کو طلب کیا۔ خلیفہ ان سب کو فرداً فرداً اپنے قریب بلاتا رہا اور ان سے طرح طرح کے سوالات اور محاسبہ کرتا رہا۔ کسی کو ڈانٹ دیا، کسی کو نوازش بھرے دستِ بوسی کی سعادت سے نواز دیا۔ یہ کاروبار کئی دن جاری رہا۔ آخر ایک دن خلیفہ نے ان سب کی دعوت کی اور یہ سب امیر المومنین کے ساتھ ہم طعامی کی عزت سے نوازے گئے۔ یہ امرا اور عمال ان خلعتوں کو زیبِ بدن کیے ہوئے تھے جو دو دن پہلے انھیں عطا ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک امیر کو بغداد کا موسم راس نہیں آیا تھا اور زکام نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ امیر المومنین کی موجودگی نے اسے کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا۔ اندر کوئی چیز مسلسل سرسرا رہی تھی اور وہ بدقت تمام چھینک روکے ہوئے تھا۔ آخر بات قابو سے باہر ہو گئی اور پے در پے کئی چھینکیں اس طرح آئیں کہ پوری محفل اس امیر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان چھینکوں نے نتھنوں کا پرنالا جاری کر دیا اور یہ دوسری مشکل تھی جس نے اس امیر کو اور زیادہ پریشان کر دیا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے رومال کا کام شاہی خلعت کی آستین سے لیا۔ اس نے یہ کام اپنی دانست میں دوسروں کی نظروں سے بچا کے انجام دیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت عباسی خلیفہ کی نظریں بھی امیر کا یہ عمل دیکھ رہی تھیں۔ ابروئے خلافت پر شکنیں پڑ گئیں اور اس نے اپنے حاجب (سکریٹری) کو حکم دیا۔

"اِس جاہل گستاخ امیر نے خلعتِ شاہی کی توہین کی ہے اور یہ ہماری خلعتِ فاخرہ کا ہرگز مستحق نہیں، اسے اُتار لیا جائے!"

حاجب دو قد آور آدمیوں کو لے کر آگے بڑھا۔ ایک نے امیر کو شانوں سے پکڑ لیا، دوسرے نے شاہی خلعت اُتار لی۔ حاضرینِ دربار امیر کی بے عزتی پر خوف زدہ ہو رہے تھے اور درسِ عبرت لے رہے تھے۔

جب یہ امرا اور عمال اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے لگے تو نہاوند کا سردار قصرِ خلافت میں داخل ہوا اور امیر المومنین سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس معزز سردار کو خلیفہ کی اجازت پر اس کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ سردار نے رسماً السلام علیکم کہا اور دوسری شاہی رسوم کی بجا آوری سے محترز رہا۔ خلیفہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے حاجب سے کہا: "اِس سردار سے معلوم کیا جائے کہ یہ شاہی رسوم کی بجا آوری سے احتراز کیوں برت رہا ہے؟"

نہاوند کے سردار نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا: "امیر المومنین! مجھ سے براہِ راست گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ براہِ کرم درمیان سے حاجب کو ہٹا دیا جائے کیونکہ میں اس وقت امیر المومنین سے جس قسم کی باتیں کرنا چاہتا ہوں اس میں حاجب کی شخصیت خواہ مخواہ باتوں کو طول دے دے گی!"

خلیفہ اِس سرکش و جری سردار سے کچھ مرعوب سا ہو گیا۔ سردار کے اندازِ بے نیازی اور سرکشی ہم کلامی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے دوسرے سرداروں سے الگ کرتی تھی۔ خلیفہ نے حاجب کو حکم دیا: "تم خاموش رہو، ہم خود گفتگو کریں گے!"

حاجب نے خاموشی اختیار کی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

خلیفہ نے کہا: "ہاں اب تم بتاؤ، ہم سے کس قسم کی گفتگو کرنا چاہتے ہو؟"

نہاوند کے سردار نے پوچھا: "جس امیر کی چھینکوں نے مزاجِ خلافت میں انقباض پیدا کر دیا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ اپنی چھینکوں کے معاملے میں واقعی صاحبِ اختیار تھا؟"

خلیفہ نے تیوریوں پر بل ڈال کے جواب دیا: "تم نہاوند کے ایک معمولی سردار ہم سے اِس قسم کا معمولی سوال کس طرح کر سکتے ہو؟ اس سوال میں محاسبے کی بُو پائی جاتی ہے کوئی اور بات؟"

سردار نے دوسرا سوال کیا: "اُس سردار کو بھرے دربار میں جس طرح رسوا اور ذلیل کیا گیا ہے کیا وہ واقعی اس کا مستحق تھا؟"

خلیفہ نے ذرا ترش لہجہ اختیار کیا اور بولا: "کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو؟ تمھیں ہم سے اس نوع کے سوالات کا حق کس نے دیا؟ تم نہاوند والے سب سے نکمّے

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے؟

خزینۃ الاصفیا	جنید بغدادی	[illegible]
مفتی غلام سرور لاہوری	ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر	[illegible]
تذکرۃ الاولیا	طبقات الاولیا	سفینۃ الاولیا
شیخ فریدالدین عطار	عبدالوہاب الشعرانی	شہزادہ دارا شکوہ

جاؤ اور ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ آیندہ ایسی جسارت میں سرزد نہ ہو!"

سردار نے پشیمانی اور ندامت کے انداز میں گردن جھکالی اور آنسو بہانے لگا۔ اس نے رک رک کے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"امیرالمومنین! میں نہاوند واپس نہیں جا رہا۔ آپ وہاں کی سرداری کسی اور کے حوالے کر دیجیے!"

خلیفہ نے حیران ہو کے سوال کیا: "یہ کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ تم رو کیوں رہے ہو؟"

سردار نے جواب دیا: "امیرالمومنین! آپ کی تادیبی کارروائی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میرے دل کی دنیا میں آپ کے حکم نے جو انقلاب برپا کر دیا ہے اس کا تو آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے!"

خلیفہ اس عجیب و غریب سردار کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا کہ اسے یہ ہو کیا گیا ہے؟ یہ کیا کہہ رہا ہے؟

سردار نے یکایک دوسرا طرزِ تخاطب اختیار کیا چہرے پر ایک قسم کی درشتی آگئی اس نے سر اوپر اٹھایا اور سخت لہجے میں کہا: "تم مخلوق ہو کر جب یہ ناپسند کرتا ہے کہ تیری عطا کردہ خلعت کی بےادبی کی جائے تو خدا اس بات کو کب پسند کرے گا کہ میں اس کی عطا کردہ خلعت کو ذلیل کرتا پھروں۔ تو ایک معمولی اور ادنا حاکم اپنے اختیار کو کس ظالمانہ انداز میں استعمال کیا ہے؟ میں اس پر جتنا غور کرتا ہوں پریشان ہو جاتا ہوں!" اس کے بعد شاہی خلعت اتار کے خلیفہ کی طرف پھینک دی اور اس کے سامنے سے چلتے ہوئے کہا: "میں نے نادانی اور غفلت میں اسے پہن لیا تھا لیکن اب میں ہوش میں آچکا ہوں اور اس خلعت کے ادب و احترام کی طرف رجوع ہو رہا ہوں جو میرے خدا نے مجھے عطا کی ہے!"

خلیفہ ان کی صورت ہی دیکھتا رہ گیا اور یہ وہاں سے چلے آئے اس عہد کے مشہور صوفی خیر نساج بعض حیثیتوں سے کافی شہرت رکھتے تھے یہ انھی کے پاس پہنچ گئے اور کہا: "حضرت! میری طرف دیکھیے اور توجہ دیجیے میں نے نہاوند کی سرداری کی خلعت اتار پھینکی اور فقر کی خلعت پہن لی بتائیے آپ میری کس حد تک رہنمائی کر سکتے ہیں؟"

خیر نساج نے جواب دیا: "میں تمھیں اس راہ پر ڈال دوں گا بقیہ رہنمائی تم جنید بغدادی سے حاصل کرو گے!"

انھوں نے کہا: "اچھا یہی سہی جنید بغدادی کو بھی دیکھ لوں گا!"

خیر نساج نے ان کی تربیت شروع کر دی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس تند و تیز اور سرکش و بےباک مرید سے پریشان ہو گئے بولے: "شبلی! تم نہاوند کے سردار رہ چکے ہو اور ایسا لگتا ہے کہ تمھارے مزاج کی تندی اور تیزی میرے جیسا سیدھا اور دنیا سے نابلد انسان نہیں نکال سکتا۔ تم میں شاید حکمرانی کی خو بو نے ایک قسم کی کجی پیدا کر دی ہے تم جنید بغدادی کے پاس جاؤ ان کے پاس ایک گوہرِ نایاب ہے کوشش کرو کہ وہ حاصل ہو جائے۔ خالقِ کائنات نے جنید بغدادی ہی کو تمھاری تعلیم و تربیت کے لیے مقرر فرمایا ہے اب تم ان کے پاس جاؤ اور اپنا گوہرِ مقصود حاصل کر لو!"

یہ اس مجلس سے اٹھ کے جنید بغدادی کی محفل میں پہنچ گئے پہنچتے ہی جنید بغدادی سے کہا: "مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے پاس ایک گوہرِ نایاب ہے میں چاہتا ہوں کہ یا تو آپ اسے قیمتاً دے دیں ورنہ مفت عطا فرما دیں!"

جنید بغدادی نے اس عجیب و غریب طرزِ تکلم پر سر اٹھا کے انھیں دیکھا اور مسکرا کر کہا: "اچھا تو تم ہو شبلی! خوب کہو یہ سرداری چھوڑ کے تجارت کب سے اختیار کی؟"

انھوں نے جواب دیا: "جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ صوفیائے کرام نے بھی دکانیں سجالی ہیں میں خریدار بن کے اس بازار میں داخل ہو گیا!"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "تم جس گوہرِ نایاب کی خریداری کی بات کر رہے تھے تم اس کی قیمت نہیں دے سکو گے؛ ہماری دکانوں میں کھوٹے سکے نہیں چلتے!"

انھوں نے کہا: "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس گوہرِ نایاب کی قیمت نہیں ادا کر سکوں گا تو پھر وہ دُرِ نایاب مجھے مفت ہی عطا فرما دیں!"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "یہ اس سے بھی مشکل سوال ہے اگر میں وہ موتی تمھیں بےقیمت دے دوں تو تم اس کی قدر نہیں کرو گے کیونکہ جو شے مفت مل جاتی ہے ناقدری کا شکار ہو جاتی ہے!"

شبلی نے بےچینی سے سوال کیا: "پھر میں اسے کس طرح حاصل کروں؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "اگر تم اس دُرِ نایاب کی حصول یابی پر بضد ہی ہو تو تمھیں پہلے توحید میں غرق ہو کر فنا ہو جانا پڑے گا کیونکہ ابھی تم پر خدا نے صبر و انتظار کے دروازے نہیں کھولے ہیں، پہلے انھیں کھلوا کے کشادہ کرواؤ جب یہ دروازے کھل جائیں گے اور خدا انھیں کشادہ بھی کر دے گا تو وہ گوہرِ نایاب تمھیں خود بخود حاصل ہو جائے گا!"

شبلی نے پوچھا: "صبر و انتظار کے دروازے کس طرح کشادہ ہوں گے؟ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "کسی عذر اور حیلے کے بغیر ایک سال تک گندھک فروخت کرو اس کے بعد میرے پاس آؤ!"

شبلی نے نیاز مندی سے سر جھکایا اور در اور درک کے جنید بغدادی کے حکم کی تعمیل میں نکل گئے۔

کہاں نہاوند کی سرداری اور کہاں گندھک کی حقیر سی دکان داری۔ اس کام میں ان کا کیسے کیسے کمتر درجے کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انھوں نے شبلی کو کتنا حقیر و ذلیل کیا کچھ وہی جانتے تھے ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بھاگ کھڑا ہوتا لیکن وہ خلعتِ باری کے تحفظ اور اس کے شرف و عزت کی بحالی کی غرض سے اس راہ پر چل پڑے تھے ایک سال تک سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ ایک سال بعد وہ دوبارہ جنید بغدادی کے پاس پہنچے اور عرض کیا: "جناب! میں ایک سال گندھک کی دکان داری کر کے

آگیا ہوں میرے لیے اور کوئی حکم؟"

جنید بغدادی نے انھیں غور سے دیکھا اور افسوس سے کہا: "میں تم پر صبر و انتظار کے دروازے کشادہ کرنا چاہتا ہوں لیکن تمھاری بے چینی یہ بتا رہی ہے کہ تم نے ایک سال کی مدت ایسے جیسے تیسے پوری کر کے کسی طرح پیچھا چھڑایا ہے۔ اس بے چینی اور مغروری کیفیت کے ساتھ صبر و انتظار کے دروازے پر دستک دینے کی کوشش کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

شبلی نے بے بسی سے جنید بغدادی کی طرف دیکھا اور کسی دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

جنید بغدادی نے کہا: "چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟"

شبلی نے جواب دیا: "اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں گندھک کی دکان داری کرنے دوبارہ جا رہا ہوں اور یہ کام اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک کہ آپ مجھے خود نہ طلب فرمالیں گے!"

جنید بغدادی نے بدستور مایوسی کا تاثر قائم رکھا۔ بولے: "لیکن اس عمل سے تمھارے اندر کی اصلاح کس طرح ہوگی؟ میرا خیال ہے اس حالت میں بھی تمھیں جس بات کا انتظار ہوگا وہ یہ ہوگا کہ میں تمھیں کب واپس بلاتا ہوں۔ اس فکر و تردد کی موجودگی میں صبر و انتظار کا دروازہ کس طرح کشادہ ہوگا!"

شبلی نے عرض کیا: "پھر جیسا حکم آپ دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

جنید بغدادی نے نیازکت آمیز حکم دیا: "تمھیں ایک سال دریوزہ گری کرنی ہوگی!"

شبلی نے تلملا کے جنید بغدادی کی طرف دیکھا۔ جنید بغدادی نے مسکرا کے پوچھا: "سرداری کی انا ابھی زندہ ہے؟ نفس امارہ کا الٹی پھن اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہے نا یہی بات؟"

شبلی رحم طلب نظروں سے جنید بغدادی کو دیکھنے لگے۔ جنید بغدادی نے سر جھکا لیا۔ بولے: "دریوزہ گری ایک سال تک بھیک مانگو اور وہ بھی اس طرح کہ تمھیں ہر روز میرے پاس آنا ہوگا اور یہ بتانا ہوگا کہ تمھیں بھیک سے کیا حاصل ہوا۔ سرداری کا طنطنہ اور نفس امارہ کا موذی سانپ اسی طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ کوئی متبادل راستہ نہیں!"

شبلی بدستور خاموش جنید بغدادی کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جنید بغدادی نے کنکھیوں سے انھیں دیکھا اور درشتی سے کہا: "تامل اور پس و پیش کس لیے؟ کیا تم وہیں واپس جانا چاہتے ہو جسے چھوڑ کے یہاں آئے تھے؟ اگر ایسا ہے تو اسی وقت واپس چلے جاؤ اور میرا اور اپنا وقت نہ برباد کرو۔ یہاں تامل اور پس و پیش کرنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں!"

شبلی نے جواب دیا: "میں تامل اور پس و پیش کا شکار نہیں ہوں۔ میں ہر وہ کام کروں گا جس کا آپ حکم دیں گے اور بالکل اسی طرح انجام دوں گا جس طرح آپ چاہیں گے۔ کیا میں اسی وقت چلا جاؤں؟"

"ہاں اسی وقت، ابھی، تامل اور پس و پیش کے بغیر۔ فلاحت فقط رات گئے تک اور بھیک سے جو کچھ ملے وہ ہمارے حوالے کر دینا کیونکہ اس کے خرچ کا اختیار تمھیں نہیں دیا جا رہا ہے۔"

شبلی نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی؛ اسی وقت مرشد کے حکم کی تعمیل میں نکل گئے۔



نہاوند کا سردار بغداد کے گلی کوچوں اور بازاروں میں بھیک مانگنے لگا۔ جو اسے جانتے تھے انھیں حیرت ہوتی تھی اور شبلی کو کچھ دینے کے بجائے ان سے حذر کرتے تھے۔ وہ جس دروازے پر گئے انھیں کچھ دیے بغیر بھگا دیا گیا، جس دکان پر دستِ سوال دراز کیا دھتکار دیا گیا۔ لوگ انھیں دیکھ کر مذاق اڑاتے: نہاوند کا سردار بغداد کے عوام و خواص کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھر رہا تھا اور لوگ انھیں کچھ نہ دے کر اپنے حسد و شماتت کا اظہار کر رہے تھے۔ شبلی ہر شب کو جب جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچتے اور یہ بتاتے کہ دن بھر کی مشقت میں کچھ بھی نہیں ملا تو جنید بغدادی مسکرا دیتے۔ جب مہینوں یہ کیفیت برقرار رہی تو شبلی کو جنید بغدادی کی خدمت میں جاتے ہوئے ندامت محسوس ہونے لگی۔ جنید بغدادی نے ان کی خجالت محسوس کر لی۔ کہا: "خزانے کی کوئی ضرورت نہیں، کام جاری رکھو!"

شبلی کی ہمت بندھی اور اسی لگن، اسی تندہی اور چستی سے دریوزہ گری شروع کر دی۔ سال کے ختم ہوتے ہوتے انھیں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ بغداد کے لوگ یا تو مفلس ہو چکے ہیں یا بخیل۔ اس بار شبلی نے شب و روز کی گنتی نہیں کی تھی۔ انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کی دریوزہ گری کا سال کب ختم ہو رہا ہے۔ ایک رات جب وہ دن بھر کی دریوزہ گری کے بعد تھکے ہارے جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے تو خلافِ معمول جنید بغدادی نے سوال کیا: "آج کیا ملا؟"

شبلی نے مایوسی سے جواب دیا: "کچھ بھی نہیں۔ بغداد کے لوگ شاید میرے معاملے میں بے حس اور بخیل ہو گئے ہیں!"

جنید بغدادی نے کہا: "تم نہاوند کے سردار تھے۔ لوگ تمھاری مصاحبت اور دربارداری میں شب و روز خوشامدیں کرتے رہتے تھے۔ اس سے تم نے اپنا جو مرتبہ متعین کر رکھا تھا، سال بھر کی دریوزہ گری نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ تمھاری اپنی ذاتی حیثیت کا بھرم کھل چکا ہے۔ تمھاری اپنی کوئی قیمت نہیں!"

شبلی اس نئے انکشاف اور اپنی حیثیت کی صحیح قدر و قیمت سن کر پریشان ہو گئے۔ بولے: "بے شک ابھی تک میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ میں نہاوند کا سردار رہ چکا ہوں اور بغداد کے واقفِ حال حضرات مجھے دیکھ کر یقیناً میری عزت و تکریم کریں گے اور اگر عزت و تکریم نہیں کریں گے تو سابقہ حیثیت کے پیشِ نظر رحم کھا کے کچھ نہ کچھ دے مریں گے لیکن نتیجہ خلافِ امید نکلا!"

جنید بغدادی نے مایوسی سے کہا: "ابھی مزید اصلاح کی ضرورت باقی ہے۔ تمھارے اندر کے میل کچیل کو نکال پھینکنے کے لیے کچھ اور رگڑائی کی ضرورت ہے!"

شبلی حسرت سے جنید بغدادی کو تکنے لگے۔

جنید بغدادی نے کہا: "تم نے اپنی سرداری کے زمانے میں کتنوں ہی کا دل دکھایا ہوگا!"

شبلی نے جواب دیا: "ہاں ایسا بھی ہوا ہے!"

جنید بغدادی نے کہا: "اچھا پھر تم اپنی یادداشت اور حافظے کی مدد سے ان لوگوں کی فہرست تیار کرو جن سے تم زیادتی کے مرتکب ہوتے رہے ہو!"

شبلی نے کسل مندی سے کہا: "یہ بہت مشکل کام ہے!"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "لیکن تمھیں ہر مشکل پر قابو پانا ہے!"

شبلی نے کہا: "اچھا میں فہرست تیار کرنے کی کوشش تو کرتا ہوں لیکن اگر کوئی نام یادداشت اور حافظے سے نکل چکا ہو تو اس کا کیا ہوگا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "اس کی فکر مت کرو۔ فہرست کی تیاری کے بعد بھی حافظے پر زور دیتے رہو اور بھولے ہوئے نام جیسے جیسے یاد آتے رہیں انھیں لکھتے رہو!"

شبلی نے اس فہرست کی تیاری میں کئی دن لگا دیے اور جب یہ تیار ہوگئی تو جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جنید بغدادی نے فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور حکم دیا: "تم نہاوند واپس جاؤ اور فہرست کے ہر آدمی سے مل کر معافی مانگو!"

شبلی کو ایک دھکا سا لگا۔ اپنی سرداری کے علاقے میں جا کے ساتھ رعایا سے معافی مانگنا کتنی بے عزتی کی بات ہے۔ شاید بغداد کی ورانی ... سے بھی زیادہ۔ وہ جنید بغدادی سے آنکھ ملاتے گھبرا رہے تھے کیونکہ ان کی آنکھوں کا پس و پیش بلاتامل ایک بار پھر جنید بغدادی پر ظاہر ہو جاتا۔

جنید بغدادی نے پوچھا: "کیا سوچنے لگے؟"

شبلی نے کہا: "اس فہرست کے کتنے ہی لوگ وہاں موجود نہ ہوں گے، ان کا کیا ہوگا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "ان کا پتہ لگانا ہوگا اور وہ جہاں بھی ہوں وہیں پہنچ کے ان سے معافی مانگنی ہوگی!"

شبلی نے محسوس کیا۔ مفر کی کوئی راہ باقی نہیں رہی، بولے: "میں نہاوند کب چلا جاؤں؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "بابا یہ تمھاری درویشی کا نصاب ہے۔ اس میں دن اور وقت کا تعین نہیں ہوتا۔ تم جتنی جلدی اس نصاب کو پورا کرلوگے کامیابی حاصل کرلوگے۔ یہاں سستی اور کاہلی کے لیے کوئی جگہ نہیں!"

شبلی نے کسی رخصت سفر ... سامان کے بغیر نہاوند کی راہ اختیار کی۔

✠

جیسے جیسے نہاوند قریب آرہا تھا۔ شبلی کے دل کی عجیب سی حالت ہوتی جارہی تھی لیکن وہ دل کی کیفیت پر ہر طرح قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بے سروساماں نہاوند کا سابق حکمراں جیسے ہی اپنے علاقے میں داخل ہوا، چاروں طرف اس کا چرچا ہونے لگا لیکن اب یہ چرچا قدر و منزلت اور تعریف و توصیف کا چرچا نہ تھا بلکہ طنز و استہزا، طعن و تشنیع اور مذاق اڑانے کا چرچا تھا۔ درویشی پر نہاوند کی سرداری قربان کر دینا کہاں کی عقل مندی تھی

اور لوگ شبلی کی اس کم عقلی کا مذاق اڑا رہے تھے اور شبلی ان سب کی باتیں سن سن کر صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے۔ جنھیں مذاق اڑانے والوں کی ایک جمعیت ان سے ملنے پہنچی اور سوال کیا: "حضرت! نہاوند کی سرداری پر اپنے علاوہ کسی اور کو فائز دیکھ کر آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہے؟"

شبلی نے جواب دیا: "میں نے نہاوند کی عارضی سرداری کا درویشی کی مستقل سرداری سے سودا کر لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی معمولی سودا نہیں!"

لوگ اس پرجوش درویشی کی راہ پر گامزن نئے رہرو کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیے۔

شبلی اپنی فہرست کے ایک ایک آدمی کے در پر گئے اور ان سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں لیکن ان میں بعض ایسے نکلے جو کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔ شبلی نے ان کی منتیں کیں، خوشامدیں کیں، آہ و زاریاں کیں تب کہیں ان کے دل پسیجے اور انھوں نے معاف کیا۔ ان میں کئی ایسے تھے جو نہاوند میں موجود نہیں تھے۔ شبلی کو ان کی تلاش میں کئی دور دراز مقامات پر بھی جانا پڑا اور وہاں بھی یہی مشکلات پیش آئیں۔ وہ لوگ ملے بھی تو انھیں کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔ شبلی کا بہت زیادہ وقت خوشامد درآمد اور خدمت و آہ و زاری میں صرف ہوگیا اور بمشکل معافی حاصل کر کے ہی دم لیا لیکن سب کے آخر میں ایک شخص باقی رہ گیا جس کا صحیح پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں چلا گیا اور کس جگہ مقیم ہے۔ یہ تھک ہار کے نہاوند واپس پہنچے۔ وہاں ان کی جائداد تھی، عزیز رشتے دار تھے جو اس خیال سے شبلی سے دور دور رہتے تھے کہ کہیں وہ اپنی جائداد اور دولت پر دوبارہ نہ قبضہ کر لیں۔ شبلی جس شخص سے معافی نہیں مانگ سکے تھے اس کے لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی دولت میں سے ایک لاکھ درہم اس کے عوض خیرات کر دیں جو شاید اس معافی کا بدل ثابت ہو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور بغداد روانہ ہوگئے۔ راستے بھر ایک لاکھ درہم اور معافی نہ حاصل کر سکنے کا احساس انھیں ستاتا رہا۔ ان کا ضمیر بار بار ان سے پوچھتا

حضرت عمر بن عبدالعزیز

کے پاس ایک وفد آیا۔ وفد میں چند بوڑھوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ نوجوان نے زبان کھولی اور اپنے وفد کی نمائندگی میں کچھ کہنے لگا۔

عمر بن عبدالعزیز نے نوجوان کو ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا اور کہا: "نوجوان! تم خاموش ہو، کسی بزرگ کو بولنے کا موقع دو۔"

نوجوان نے جواب دیا: "امیرالمومنین! عقل و دانش کا تعلق سن و سال سے نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج خلافت کی مسند پر آپ کی جگہ کوئی بوڑھا شخص بیٹھا ہوتا!"

عمر بن عبدالعزیز نے کہا: "نوجوان! تم صحیح کہتے ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ ہاں اب تم اپنے وفد کی نمائندگی میں جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو، آزادانہ کہو، میں سنوں گا!"

کیا یہ ایک لاکھ درہم خیرات میں دے دینے سے معافی کی تلافی ہو گئی ہے؟ کبھی دل کہتا کہ ہاں ہو گئی اور کبھی کسی گوشے سے آواز ابھرتی 'نہیں ہوئی۔ یہ دل میں ایک کانٹا سا لیے ہوئے بغداد میں داخل ہو گئے اور حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ مرشد نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور پوچھا: "کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آئے ہو؟"

شبلی نے مذبذب لہجے میں جواب دیا: "کچھ کہہ نہیں سکتا' اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے!"

جنید بغدادی نے کہا: "سفر کی تفصیل بیان کرو!"

شبلی نے بے کم و کاست پوری تفصیل عرض کر دی اور آخر میں سوال کیا: "اب یہ فیصلہ آپ خود فرمائیں گے کہ جس شخص سے میں معافی نہیں مانگ سکا اس کی تلافی میں' میں نے جو ایک لاکھ درہم خیرات کر دیے ہیں تو خدا کی نظر میں میرا یہ عمل کیسا ہوگا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا: "یہ ایک لاکھ درہم کی خیرات تمہارے نامۂ اعمال کی نیکی میں تو لکھی جا سکتی ہے لیکن ان سے وہ گناہ نہیں معاف کیے جا سکتے جو ایک بندے کی دل آزاری کی وجہ سے تمہارے نامۂ اعمال میں لکھے جا چکے ہیں شبلی! یہ معاملہ حقوق العباد کا ہے' اس میں اللہ کیوں دخل دے گا؟ تمہیں بہر صورت' بہر قیمت اس شخص کو تلاش کر کے معافی مانگنا ہے' اسی وقت واپس جاؤ اور اسے تلاش کر کے معافی مانگو!"

شبلی نے کہا: "میں اسے کئی جگہ تلاش کر آیا لیکن وہ نہیں ملا' اب میں کہاں جاؤں؟"

جنید بغدادی نے نفرت سے کہا: "تمہارے مزاج میں ابھی نہاوند کی سرداری کی خو بو باقی ہے' تمہیں اپنی جائداد اور دولت کا اب بھی احساس ہے' اب بھی گھمنڈ اور گمان ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کبھی بھی ایک لاکھ درہم خیرات کر دینے کی طرف مائل نہ ہوتے' جاؤ اس گھمنڈ اور گمان کو نکال کے واپس آؤ!"

شبلی نے کہا: "حضرت! جو شخص مجھے بعد تلاشِ بسیار بھی نہیں مل سکا' اس کے لیے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاید وہ زندہ نہیں ہے اور اگر وہ واقعی مر چکا ہے تو میں اس سے کس طرح معافی حاصل کروں گا!"

جنید بغدادی نے زچ ہو کے کہا: "اچھا چلو یہی سہی پھر بھی تمہارے دل و دماغ کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی سرداری کی خو بو تو نکالنی ہی پڑے گی!" پھر ذرا سکوت اختیار کیا اور حکم دیا: "ایک سال کی دریوزہ گری اور؟"

شبلی اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے' بولے: "بہتر ہے جیسا حکم مرشد!" یہ کہا اور باہر نکل گئے۔ جنید بغدادی کھلے ہوئے دروازے پر نظریں جمائے کچھ سوچتے رہے' پھر خود سے مخاطب ہوئے۔

"دل کا میل کچیل ابھی اچھی طرح تو نکلا نہیں' اس زنگ کی موجودگی میں دل پر جلا کاری کس طرح ممکن ہے!"

لیکن اس مرتبہ لوگوں نے شبلی کو کچھ نہ کچھ دینا بھی شروع کر دیا۔ دن بھر کی بھیک سے جو کچھ حاصل ہوتا' جنید بغدادی اسے لے کر خیرات کر دیتے اور اس میں ایک پائی بھی خود پر یا شبلی پر نہ خرچ کرتے۔ شبلی کو پیٹ بھر غذا بھی نہ دی جاتی' کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور شبلی کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا' جنید بغدادی کو ان کے کھانے پینے کی نہ تو فکر تھی نہ پروا۔ شبلی اپنے مرشد کے اس رویے کی شکایت بھی نہ کر سکتے تھے' انھیں تو صبر' انتظار کی راہ پر چل کے اس کے دروازے کشادہ کرنے تھے' لوگ انھیں دھتکارتے' جھڑکیاں دیتے اور سخت سست کہتے لیکن یہ پیکرِ تسلیم و رضا بنے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ دن بھر کے تھکے ہارے جب یہ مرشد کی خدمت میں پہنچتے تو وہ انھیں دیکھ کر مسکرا دیتے اور کہتے: "سوئے سرداری اور انا کا میل کچیل صاف ہو رہا ہے' آئینے کا زنگ کم ہوا جا رہا ہے' جلا کاری کا الف تمام بنا چکا تھا اور جلا کا یہی الف ایک نہ ایک دن میل کے پردے دل کو مجلا کر دے گا!"

شبلی نے صبر و تحمل سے پورا سال دریوزہ گری میں گزار دیا۔ اس بار انھوں نے نہ کسی قسم کا شکوہ کیا اور نہ کوئی عذر' ایک دن جنید بغدادی نے انھیں خود ہی اس کام سے منع کر دیا' کہا: "شبلی! بس کرو' تم اپنا نصاب پورا کر چکے' اب تم میری صحبت میں رہ سکتے ہو!"

شبلی جس کیفیت میں مبتلا ہو چکے تھے' اس میں اب شکوے یا شکریے کے لیے ایک لفظ بھی موجود نہیں تھا' اطاعتِ مرشد کی بات سنی اور ان کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ جنید بغدادی نے ان کے ذمے یہ خدمت کر دی کہ آنے جانے والے درویشوں کی خدمت کیا کریں۔ شبلی نے یہ کام بھی پورے ایک سال انجام دیا۔ ایک دن حضرت جنید بغدادی نے انھیں طلب فرمایا اور پوچھا: "شبلی! اب تم خود کو خلائق میں کیسا سمجھتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا: "تمام مخلوق میں کمتر!"

جنید بغدادی نے خوش ہو کے بشارت دی: "اب تمہارے ایمان کی تکمیل ہو چکی ہے!"

رفتہ رفتہ ان کا یہ حال ہو گیا کہ لوگوں کے لیے شمشیرِ بے نیام ہو گئے۔ ان کے جلال و جمال سے لوگ ڈرنے لگے۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیتے کہ میرے سامنے تم لوگ بار بار خدا کا نام لو' میں تمہیں اپنی مقدرت کے مطابق کچھ عطا کروں گا!"

لوگ نفع اندوزی کے خیال سے انھیں دیکھتے ہی اللہ اللہ کہنا شروع کر دیتے اور یہ خوش ہو کے انھیں اشرفیوں سے نواز دیتے' یہ اشرفیاں ان کے پاس کہاں سے آتی تھیں کسی کو پتہ نہ تھا۔ بغداد کے بچوں کو جب اس خبطے کا علم ہوا تو وہ ہجوم کی شکل میں آپ کے پاس آتے اور اللہ اللہ کا ورد شروع کر دیتے۔ شبلی ان میں شیرینی تقسیم کرنے لگے۔ ان کا یہ عمل ایک مدت تک جاری رہا۔ خلافِ معمول ایک دن جب بچے اور بڑے اللہ اللہ کا ورد کر کے حاضر ہوئے تو دیکھا' شبلی برہنہ شمشیر لیے ان کے قتل پر آمادہ ہیں۔ لوگ انھیں اس حال میں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ من چلے شبلی کے قریب پہنچے اور پوچھا: "شبلی! یہ کیا بات ہے؟"



سلطان قطب الدین خوارزم شاہ

اپنے گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا، ایک قبرستان سے گزرنے کے دوران اُس نے ایک مجذوب کو دیکھا۔ بادشاہ نے باگ کھینچ لی اور پوچھا "فقیر! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

فقیر نے بے نیازی سے جواب دیا "میں قبرستان کے مُردوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں!"

بادشاہ نے پوچھا "یہ کیا کہتے ہیں؟"

فقیر نے جواب دیا "یہ کہتے ہیں کہ کبھی ہم بھی اسی طرح ہاتھی گھوڑے پر سوار نکلا کرتے تھے لیکن آج الٹا معاملہ ہے اور زمین ہم پر سوار ہے۔"

شبلی نے جواب دیا "ربّ کعبہ کی قسم، میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اگر کسی نے میرے سامنے خدا کا نام لیا تو میں اسے قتل کر دوں گا!"

لٹنسلا نے عرض کیا "لیکن جناب کل تک تو آپ اللہ اللہ کے وِرد پر انھیں آفرینیں اور خیر سنی سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔"

شبلی نے جواب دیا "ہاں میں یہی کرتا تھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ لوگ خدا کا نام اس کی محبت میں ڈوب کر لیا کرتے ہیں لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ لوگ خدا کا نام یا تو عادتاً لیتے ہیں یا پھر سوداگری میں اور میں انھیں جائز جگہ حرام سمجھتا ہوں!"

ایک دن لوگوں نے دیکھا شبلی ہاتھوں میں آگ لیے ایک طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ کسی نے انھیں روک لیا اور پوچھا "شبلی! کہاں کا قصد ہے؟"

جواب دیا "خانۂ کعبہ جا رہا ہوں!"

اس شخص نے سوال کیا "اس آگ کا کیا کرو گے؟"

جواب دیا "اس سے خانۂ کعبہ کو پھونک دوں گا!"

سوال کرنے والا لرز گیا، سہم کر بولا "شبلی! تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو؟"

آپ نے جواب دیا "افسوس کہ جو خود اپنے ہوش و حواس میں نہیں وہ میرے ہوش و حواس پر شبہ کر رہے ہیں!"

اس شخص نے کہا "آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ نے اس پر بھی کچھ غور فرمایا؟"

شبلی نے ہوش میں جواب دیا "میں ہوش مندی کی باتیں کر رہا ہوں لیکن تمھاری عقل و حواس پر غفلت کے پردے پڑ چکے ہیں، اس لیے تم میری بات نہیں سمجھ سکتے!"

اس شخص نے پھر سوال کیا "یہ آگ آپ کہاں لیے جا رہے ہیں؟"

شبلی نے اسی بے باکی سے جواب دیا "خانۂ کعبہ لیے جا رہا ہوں اور اس آگ سے اسے پھونک دینا چاہتا ہوں!"

اس شخص نے سوال کیا "آخر کیوں؟ کیا ربّ کعبہ اپنے گھر کی حفاظت نہیں کرے گا؟"

"نہیں کرے گا!" شبلی نے جواب دیا "کیونکہ میں اس کے گھر کو اس لیے پھونک دینا چاہتا ہوں کہ لوگ خانۂ کعبہ کے بجائے کعبے والے کی طرف رجوع ہو جائیں!"

❁

عید کا دن تھا لوگ زرق برق، رنگ برنگے اور صاف ستھرے لباس میں ملبوس اِدھر اُدھر عید ملتے پھر رہے تھے لیکن اس دن شبلی نے بطورِ خاص سیاہ کپڑے پہن لیے، دیکھنے والوں نے ان کا مذاق اُڑایا، کہا "کیا ہوش و حواس سے بالکل ہی عاری ہو گئے ہو؟"

شبلی نے اللہ کا نعرہ مارا اور جواب دیا "میں اس کی ذات میں گم ہو گیا ہوں!"

کسی نے ہنس کر کہا "لیکن اتنا ہوش باقی رہا کہ عید کے دن قصداً سیاہ کپڑے پہن لیے!"

آپ نے جواب دیا "اگر آپ میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو، میں نے یہ لباس تم سب کے ماتم میں پہن لیا ہے!"

ایک شخص غصے میں کھڑا ہو گیا، بولا "ہم زندوں کے ماتم کا مطلب؟"

آپ نے جواب دیا "تم نے اپنے معبودِ حقیقی کو بھلا دیا اور ماسوا میں غرق ہو گئے، پھر تم زندہ کہاں رہے؟"

بچوں نے آپ کا مذاق اُڑایا اور انھوں نے شور بلند کیا "یہ شخص ہمیں تو اللہ کا نام لینے سے منع کرتا ہے اور خود بار بار اسی ایک نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے!"

شبلی نے غصے میں انھیں دیکھا، بچوں نے ان پر پتھروں کی بارش کر دی "یہ دیوانہ ہے!"

شبلی نے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کی، پتھروں کی مار سہتے رہے اور کہتے رہے "تم ابھی بچے ہو، نادان ناسمجھ، تمھیں کوئی سزا کس طرح دی جا سکتی ہے؟"

پھر انھیں بطورِ خاص مخاطب کیا "میرے بچو! اِدھر آؤ، ذرا میرے قریب آؤ، میں تمھیں ماروں گا نہیں، میں تم سے بدلہ نہیں لوں گا، دیکھو تم نے میرا جسم لہولہان کر دیا ہے اور ایسا تم نے خود نہیں کیا، اس میں خدا کا حکم بھی شامل تھا پھر میں تمھیں موردِ الزام کس طرح ٹھیرا سکتا ہوں؟"

بچے خوف زدہ ہو کے دُور ہی کھڑے رہے، اب انھوں نے سنگ باری بھی موقوف کر دی تھی۔

لہولہان شبلی آہستہ آہستہ چل کے خود ہی ان کے پاس پہنچ گئے، بچے بوڑھے اور جوان سبھی تصویرِ حیرت بنے یہ منظر دیکھ رہے تھے، شبلی نے کہا "کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میں اس کا نام لے رہا ہوں، یہ تو خود معبودِ حقیقی ہے جو اپنے

ابوحنیفہ

کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے دکان کے ملازم سے ایک تھان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو یہ تھان ایک جگہ سے مسکا ہوا ہے، خریدار کو اس کا یہ عیب ضرور بتا دینا اور اس سے اس کی نصف قیمت لینا۔"

دکان کا ملازم مصروفیت میں بھول گیا اور وہ تھان پوری قیمت میں فروخت کر دیا۔ شام کو آپ نے ملازم سے دریافت کیا کہ وہ عیب والا تھان بک گیا ہے یا نہیں؟"

ملازم خوفزدہ ہو گیا لیکن جھوٹ نہیں بولا اور صاف صاف بتا دیا کہ تھان میں نے غلطی سے اس کا عیب بتائے بغیر پوری قیمت میں فروخت کر دیا ہے!"

آپ مضطربانہ اس خریدار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں پتہ چلا کہ خریدار حجاز کے قافلے میں شامل ہو کر دیر ہی کو روانہ ہو چکا ہے!

آپ نے ایک تیز رفتار ناقہ لیا اور اس شخص کی تلاش میں روانہ ہو گئے اور اسے دوسری منزل میں جا لیا۔ اسے تھان کا عیب بتایا، آدھی قیمت واپس کی اور دیر تک اپنے ملازم کی کوتاہی اور بھول چوک کی معافی مانگتے رہے۔

جب آپ اس سے رخصت ہو کر واپس ہوئے تو خریدار نے انھیں کمالِ احترام سے رخصت کرتے ہوئے کہا: "ابوحنیفہ! تم اس امت کی آبرو اور زندگی ہو، ہم تم پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے!"

نام کا ورد کر رہا ہے، ذرا میرے قریب آ کے بہتے ہوئے خون کی زبان تو سنو، دیکھو ہر قطرۂ خون کیا کہہ رہا ہے؟"

چند آدمیوں نے ہمت کی اور جھک کے کان بہتے ہوئے لہو کے قریب کر دیئے۔ وہاں سے پُراسرار آوازیں آ رہی تھیں "اللہ، اللہ، اللہ!"

ان کے چہرے سفید پڑ گئے اور ذرا سی دیر میں شبلی وہاں تنہا رہ گئے۔

شبلی کی عبادت و ریاضت میں اتنا اضافہ ہوا کہ راتوں کی نیند اڑا دی۔ اللہ اُن کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا اور وہ اس سے ایک لمحے غافل رہنے کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے بہت سا نمک پیس کے حجرے میں رکھ لیا اور جب بھی نیند ستاتی ایک چٹکی آنکھوں میں بھر لیتے۔ جب لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوا تو انھوں نے شبلی کو ڈرایا، کہا: "تم کیا غضب کرتے ہو؟ اس طرح تو بینائی جاتی رہے گی!"

شبلی نے جواب دیا: "میں نے اپنی چشمِ باطن روشن کر لی ہے، اس لیے چشمِ ظاہر کی بینائی کی میں پروا نہیں کرتا!"

ایک دن جنید بغدادی کو کسی نے بتایا کہ شبلی لوگوں کو جمع کر کے وعظ کہنے لگے ہیں اور اس میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن پر کفر کا فتوا عائد کیا جا سکتا ہے!"

جنید بغدادی نے کہا: "اچھا اب جس دن وہ کہیں وعظ کہہ رہے ہوں، مجھے مطلع کیا جائے، میں ان کی تقریر خود سننا چاہتا ہوں تاکہ اس کے مطابق انھیں تنبیہ کی جائے!"

ایک دن لوگوں نے انھیں رصافہ بازار میں تقریر کرتے دیکھا تو فوراً جنید بغدادی کو مطلع کیا گیا، وہ بھاگے بھاگے رصافہ بازار پہنچے۔ وہاں شبلی محوِ گفتار تھے۔ وہ کہہ رہے تھے: "لوگو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا کے گھر کا طواف تمھیں جہنم سے بچالے گا؟ تم خدا کے گھر کو پھونک کر خدا کی طرف راغب ہو جاؤ اور یاد رکھو، جہنم کی آگ کا خوف تمھاری طاعت و ریاضت میں شامل نہ ہونے پائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ معبودِ حقیقی جو اپنے بندوں سے ماؤں کی سی ستر گنا محبت سے زیادہ چاہ رکھتا ہے، اسے بندوں کے لیے جہنم کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ خدا معلوم نہیں کیوں اپنے بندوں میں جنت کا لالچ اور جہنم کا خوف پیدا کر کے اپنی طرف راغب کرنا چاہتا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم خدا کی عبادت بس خدا کے لیے کریں اور قیامت کے دن اس کے دیدار کے علاوہ دوسری کوئی خواہش نہ رکھیں؟"

جنید بغدادی نے بآوازِ بلند شبلی کو پکارا: "شبلی! اپنی تقریر بند کرو!"

شبلی خاموش ہو گئے۔ جنید بغدادی نے انھیں اپنے قریب بلایا: "یہاں آؤ میرے قریب، میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

شبلی ان کے قریب پہنچ گئے۔ جنید بغدادی نے کہا: "تم یہ کیسی تقریر کر رہے تھے؟"

شبلی نے جواب دیا: "میری تقریر جب خود آپ نے بھی سن لی ہے تو آپ کا یہ سوال فضول ہے!"

جنید بغدادی نے غصے میں کہا: "ہم نے جن چیزوں کو مخفی کر رکھا ہے، انھیں تم برسرِعام کیوں بیان کرتے پھر رہے ہو؟"

شبلی نے نرمی سے جواب دیا: "جن حقائق کا میں اظہار کرتا ہوں، وہ لوگوں کے ذہنوں سے بالاتر ہیں کیونکہ میری باتیں حق کی جانب سے ہوتی ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور دورانِ تقریر شبلی کا وجود باقی نہیں رہتا!"

جنید بغدادی نے افسوس سے کہا: "افسوس کہ تم بھی اسی قسم کی باتیں کر رہے ہو جیسی ابنِ منصور کرتا ہے۔ مجھے تمھاری باتوں میں خون آلود خنجر نظر آتی ہے۔"

شبلی نے جواب دیا: "جب درمیان میں شبلی کا وجود باقی ہی نہیں رہتا تو پھر خنجر اور خون کا خوف کیا معنی رکھتا ہے!"

جنید بغدادی نے عاجز آ کے کہا: "شبلی! میں تمھارے قول کی تردید نہیں کر رہا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کے مجمع میں اس قسم کی باتیں کرتے پھرو۔"

شبلی نے ذرا ناگواری سے کہا: "جو لوگ ایک ہی وقت میں دین بھی چاہتے ہیں اور دنیا بھی، ان کے لیے ہماری مجلس نشینی حرام ہے!"

جنید بغدادی نے افسوس سے کہا: "جب تم یہ جانتے ہو کہ تمھاری باتیں حق کی طرف سے ہوتی ہیں اور اسی کی طرف واپس جاتی ہیں تو اس کا ایک نہ ایک دن یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ یہی سامعین تمھیں پاگل دیوانہ قرار دے دیں گے۔"

شبلی نے جواب دیا: "پاگل ہوش مندی کی کیفیت سے واقف ہی کب ہوتے ہیں؟ یہ خود پاگل ہیں، کسی پاگل کی سندِ دیوانگی کس حد تک معتبر ہو سکتی ہے، آپ اچھی طرح واقف ہیں!"

جنید بغدادی نے عاجز آ کے کہا: "تُو ضدی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تو وہی کرے گا جس کا تو ارادہ کر لے گا۔ جا، میں تجھے تیرے حال پہ چھوڑتا ہوں!"

جنید بغدادی یہ کہہ کے گھر واپس آ گئے۔

کچھ عرصے بعد انھیں واقعی دیوانہ قرار دے دیا گیا۔ خلیفہ بغداد نے انھیں پاگل قرار دے دیا اور بیمارستان (پاگل خانے) میں داخل کر دیے گئے۔ جنید بغدادی کو اس خبر سے صدمہ پہنچا اور ان کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی آزردہ ہو گئے جنھیں شبلی سے محبت تھی اور ان کے مرتبے سے واقف تھے یہ لوگ پاگل خانے میں شبلی سے ملنے گئے۔

جب انھیں شبلی کے روبرو پیش کیا گیا تو شبلی نے ان سے پوچھا "تم لوگ کون ہو؟ اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

دوستوں نے جواب دیا "ہم سب آپ کے دوست ہیں اور آپ کی مصیبت پر تسلی دلاسا دینے آئے ہیں!"

شبلی نے بیزاری سے کہا "خوب تم کیسے دوست ہو کہ وہ نہیں جانتے جو تمھارا دوست اپنے لیے پسند کرتا ہے دوست تو اسے کہتے ہیں جو رضائے دوست میں خوش رہتا ہے مجھے میرے شیخ نے صبر و استقلال کی تلقین کی تھی اور اب میں اس راہ کا ایک مستقل مزاج مسافر ہوں کوئی صعوبت کوئی مصیبت مجھے اس راہ سے ہٹا نہیں سکتی اور ایک تم ہو تم لوگ کہ خود کو میرا دوست کہا کرتے ہو لیکن میری راہ پر چلتے نہیں آخر تم لوگ بھی میری مصیبت پر میری ہی طرح صبر کیوں نہیں کرتے؟"

دوست حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے شبلی نے انھیں بھگانے کے لیے فوراً ہی سنگ باری شروع کر دی کہا "او محبت کے جھوٹے دعوے دارو! تم سب اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمھیں پتھر مار مار کے ہلاک کر دوں گا کیونکہ جھوٹ کی میرے ہاں یہی سزا ہے!"

دوست احباب خوف زدہ ہو کے اسی وقت بھاگ کھڑے ہوئے۔

✱

پاگل خانے میں ان کی ملاقات کو عباسی وزیر حاضر ہوا اس نے سن رکھا تھا کہ شبلی کہتے ہیں کہ جس صدیق سے معجزے کا اظہار نہ ہو وہ صدیق نہیں کچھ اور ہو گا۔ نہایت قیمتی لباس اور خدام کے ساتھ جب وزیر ان کے پاس پہنچا

تو آپ نے فرمایا "تم کس سے ملاقات کرنے آئے ہو؟"

وزیر نے جواب دیا "تم سے!"

شبلی نے پوچھا "کس لیے؟"

وزیر نے جواب دیا "یہ پوچھنے کہ تم تو یہ کہا کرتے تھے کہ جس صدیق کو معجزہ نہ ہو وہ جھوٹا ہے۔ لوگ تمھیں اس عہد کا صدیق کہتے ہیں پھر تم سے کسی معجزے کا ظہور کیوں نہ ہوا؟"

شبلی نے کہا "کیا میں خدا کے اوامر و نواہی میں موافقت نہیں کر رہا ہوں؟ اگر کر رہا ہوں تو یہی میری صدیقیت ہے اور یہی میرا معجزہ۔ کسی مرید کے لیے زوجہ عارف کو تعلق، عاشق کو گلہ، صادق کو دعویٰ، خائف کو قرار اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ سے فرار کسی حال میں بھی جائز نہیں کیا میں ان میں سے کسی ایک کا بھی تارک ہوں کیا میرے حال میں یہ ساری باتیں موجود نہیں ہیں؟"

وزیر اس طرزِ تکلم سے خوف زدہ ہو گیا۔ وہ واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ

آپ نے اس کے قیمتی لباس کو حقارت سے دیکھتے ہوئے فرمایا "تم قبر میں ہو اور ایک قبر کا آدمی زندوں سے مخاطب ہو، حیرت ہے!"

وزیر نے خوف زدہ لہجے میں عرض کیا "حضورِ والا! میں زندہ ہوں خدا کے لیے میرا شمار زندوں میں کیجیے!"

شبلی نے جواب دیا "تم اپنے شان دار لباسوں میں دفن رہتے ہو!"

وزیر نے جاتے جاتے پاگل خانے کے نگراں کو حکم دیا "انھیں رہا کر دو ورنہ ڈر ہے کہ ان کی باتیں بغداد کو پھونک کے راکھ کر دیں!"

شبلی رہا کر دیے گئے۔

جب یہ رہا ہو کر جا رہے تھے تو کسی ارادت مند نے انھیں راستے ہی میں روک لیا اور گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا "شبلی! خدا کے لیے آپ میرے حق میں کشائش روزی کی دعا کیجیے کیونکہ میری ساری تدبیریں بے کار ہو چکی ہیں!"

شبلی نے جواب دیا "میں تیرے حق میں دعا ضرور کروں گا لیکن پہلے گھر جا کے تو ایک کام کر!"

اس شخص نے کہا "ارشاد! میں ابھی گھر جانے کو تیار ہوں!"

شبلی نے کہا "گھر کے جتنے افراد کا رزق تیرے ذمے ہے انھیں فوراً گھر سے نکال دے اور جتنوں کا رزق خدا کے ذمے ہے انھیں گھر ہی میں رہنے دے اس کے بعد میرے پاس آ۔ میں دعا کروں گا!"

وہ شخص آہ بکا کرتا ہوا شبلی سے جدا ہو گیا۔

لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ شبلی پورا کلمہ نہیں پڑھتے بس اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں ایک مدرس نے اس کا ذمہ لیا کہ وہ شبلی سے پورا کلمہ پڑھوا کے چھوڑے گا۔ یہ شبلی کے پاس پہنچا اور سختی سے پوچھا "شبلی! تم

حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک معصر

صوفی حضرت ابوالحسن نوریؒ کے بارے مشہور تھا کہ وہ عقائد کے اعتبار سے پکے مسلمان نہیں۔ دین میں نئی نئی باتیں داخل کر لی ہیں۔ خلیفۂ وقت نے قاضی کو حکم دیا کہ ان سے ملو اور ان کے عقائد کا امتحان لو۔

قاضی صاحب ابوالحسن نوریؒ کے پاس پہنچے اور ان سے سوال کیا۔ "جناب اگر کسی شخص کے پاس بیس درہم ہیں تو وہ اس پر کتنی زکوٰۃ ادا کرے؟"

حضرت نوریؒ نے جواب دیا "ساڑھے بیس درہم!"

قاضی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

حضرت نوریؒ نے جواب دیا "حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سنت یہی ہے کہ گھر میں اللہ کے نام کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑا جائے!"

قاضی نے مزید استفسار کیا، پوچھا "لیکن بیس کے بجائے ساڑھے بیس درہم کا کیا مطلب ہے؟"

حضرت نوریؒ نے جواب دیا "اس میں آدھا درہم جرمانے کا بھی شامل ہے کہ اس نے بیس درہم جمع کیوں کیے۔"

ہمیشہ اللہ اللہ کہتے رہتے ہو، آخر تم لاالٰہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟"

شبلی نے جواب دیا: "میں اللہ سے پہلے لا (نہیں) کہہ کے اس کی نفی نہیں کرسکتا کیونکہ اگر لا کہنے کے بعد زندگی نے وفا نہ کی تو میں تعلّقِ نفی میں رہ جاؤں گا!"

نوجوان درویش نے کہا: "آپ کا جواب خوب ہے لیکن میں مطمئن نہیں ہوا!"

شبلی نے کہا: "خدا نے قرآنِ پاک میں اپنے رسول سے کہا ہے: اے رسول! فرما دیجیے کہ میرے لیے بس اللہ ہی کافی ہے اور دوسروں کو لہو و لعب میں مشغول رہنے دیجیے، آپ ان سے کوئی سروکار نہ رکھیے!" اتنا کہہ کے شبلی نے درویش سے کہا: "پس اللہ کہنے کے لیے امرِ الٰہی صادر ہو گیا اور میں جدھر اور جہاں تک دیکھتا ہوں اللہ ہی نظر آتا ہے، میں تو غیر اللہ یا ماسوا اللہ کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتا، پھر 'لا' اپنی زبان سے کیوں کہوں؟"

جادو جیسا اثر رکھنے والے کلمات نے نوجوان درویش کا دل پھونک کے رکھ دیا، اس کی حالت غیر ہونے لگی، اس نے بمشکل تمام رک رک کر کہا: "یا شبلی! جزاک اللہ، جو کچھ تم نے کہا میرے لیے بہت کافی ہے!"

اس کے بعد وہ بے حال ہو کے گر گیا، لوگ اسے گرتا دیکھ کے اس کے قریب پہنچے اور اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ کاش اس کے رشتے داروں کو پہنچا دی گئی، انھوں نے شبلی کے خلاف قتل کا مقدمہ قائم کر دیا، قاضی نے یہ مقدمہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مرحوم کے ورثا اس مقدمے کو خلیفہ کے پاس لے گئے، خلیفہ نے اسی وقت شبلی کو طلب کر لیا، وارفتہ و سرشار و بے نیاز و مستغنی شبلی خلیفہ کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔

خلیفہ نے شبلی سے سوال کیا: "کیا اس نوجوان درویش کو تم نے ہلاک کر دیا؟"

شبلی نے جواب دیا: "نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا!"

خلیفہ نے پوچھا: "واقعے کی تفصیل بیان کرو اور بتاؤ کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟"

شبلی نے اپنے خاص لب و لہجے میں جواب دیا: "اس درویش کی روح پہلے ہی سے مشتاقِ دید تھی، میرے سامنے آ کے رونے لگی، فریاد کی، باری تعالیٰ کی طرف سے دعوت آئی، یہ لبیک کہتا ہوا جاں بحق ہو گیا، بس مشاہدۂ جمال نے اس کا کام تمام کر دیا، اس میں میرا کیا قصور؟"

خلیفہ کی حالت غیر ہونے لگی، اس کے رگ و پے میں خون کی گردش اتنی تیز ہو گئی اور دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ خلیفہ کو خدشہ محسوس ہوا کہ درویش کی طرح شاید وہ خود بھی جاں بحق ہونے والا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خدامِ دربار کو حکم دیا: "شبلی کو اسی وقت یہاں سے لے جاؤ کیونکہ ان کا کلام مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری کر رہا ہے جیسی درویش پر طاری کر کے اسے ہلاک کر چکا ہے!" پھر درویش کے مدعیانِ خوں سے کہا: "تم لوگ بہت نادان ہو، بخدا! مجھے یقین ہے کہ اگر شبلی فرداً فرداً تم سب سے مخاطب ہو جائیں تو تم میں سے ہر ایک اسی درویش کے حال کو پہنچ جائے، شبلی میں معلوم نہیں کون گویا ہے، ان سے بچو اور دست العفو!"

مدعیانِ خوں نے اپنا دعوا واپس لے لیا۔

٭

شبلی کے حاسد اور مخالف ان کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ شبلی باقاعدہ مسجد میں جا کے نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ شبلی نے انھیں جواب دیا: "اگر تم مجھے الیاسِ مت سمجھو، میں اس کی یاد سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتا!"

کسی معترض نے کہا: "ہم دنیادار لوگ تو ظاہر ہی دیکھ کے فیصلہ کریں گے!"

شبلی نے عاجزی سے کہا: "خدا نے مجھے مسجد کے معاملے میں کچھ ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے کہ اس سلسلے میں اگر میں اپنی زبان کھولوں گا تو تم یقین نہیں کرو گے!"

حاسد نے کہا: "اس کا ہم پر بھی اظہار ہو جائے تو بڑا کرم ہو گا!"

شبلی نے مجبوراً جواب دیا: "اچھا تب پھر تم میرے ساتھ آؤ اور مسجد تک پہنچنے کے دوران میرے قریب ہی رہو اور اس کیفیت کو خود دیکھ لو!"

وہ شخص آپ کے ساتھ ہو لیا۔ آپ نے وضو کیا اور مسجد روانہ ہو گئے، ابھی راستے ہی میں تھے کہ ایک آواز سنائی دی: "گستاخانہ وضو کے ساتھ ہمارے گھر آ رہا ہے!"

اس آواز نے شبلی کے قدم روک دیے اور واپسی کی نیت سے پلٹے تو دوسری آواز سنائی دی: "بس کر دیا ارادہ ترک، یہ بھی تو سوچ کہ ہمارے گھر سے واپس ہو کے تو اور کہاں جائے گا؟"

شبلی نے حالتِ وجد میں اللہ کی ضرب لگائی تو دوسری طرف سے جواب ملا: "ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے؟"

شبلی خاموش ہو کے مسجد کے ایک کونے میں جا بیٹھے تو کسی نے طنز کیا: "تو صبر و ضبط کا بھی دعوے دار ہے؟"

شبلی رونے لگے اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا: "اللہ! تو یہ جو کچھ میرے ساتھ کر رہا ہے میں تجھی سے اس کی فریاد چاہتا ہوں!" پھر اپنے حاسد سے کہا: "اب تم بتاؤ کہ جو شخص ایسی الجھنوں میں مبتلا کر دیا گیا ہو کس طرح مسجد کی حاضری پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟"

حاسد لاجواب ہو کے چپ ہو رہا۔



گلی میں چند بچے آپس میں جھگڑ رہے تھے، اُدھر سے شبلی گزرے اور انھیں جھگڑتا دیکھ کے پوچھا: "تم لوگ آپس میں جھگڑ کیوں رہے ہو؟"

ایک بچے نے جواب دیا: "ہمارے پاس چند اخروٹ ہیں، انھیں آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں لیکن مساوی تقسیم سے ہم سب قاصر ہیں!"

شبلی نے کہا: "لاؤ وہ اخروٹ مجھے دو، میں تقسیم کرتا ہوں!"

بچوں نے وہ اخروٹ شبلی کے حوالے کر دیے۔ شبلی نے اس کے حصے کرنا شروع کر دیے۔ ایک بچے کو بڑی عجلت تھی، جیسے ہی اخروٹ ملے انھیں توڑنا شروع کر دیا اور اتفاق کی بات کہ وہ سارے ہی خراب نکلے۔ بچے نے

شور کیا: "میں تو دو کے اخروٹ لوں گا، یہ تو سارے ہی خراب ہیں!"

شبلی نے پریشان ہو کے کہا: "میں ان کے اندر کے حال سے تو واقف نہیں تھا!"

کسی بچے نے معصومیت سے کہا: "جب تم ان کے اندر سے واقف نہیں تھے تو تم نے یہ تقسیم اپنے ذمے لی کیوں؟"

شبلی کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بات بچے کے ذریعے خدا کہہ رہا ہے۔ بے اختیار رو دیے اور ست و بے حال ہو کے ایک طرف چل دیے۔ وہ پریشان اور بے حال چلے جا رہے تھے کہ کسی نے انھیں روک کے پوچھا: "شبلی! تم پریشان کیوں ہو؟"

شبلی نے جواب دیا: "کوئی ایک بات ہو تو عرض کروں، بیسیوں ایسی باتیں ہیں جن کی فکر نے مجھے ہلکان کر دیا ہے!"

اس شخص نے کہا: "تمھاری حالت دیکھ کے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو تم خود خدا کے ساتھ نہیں ہو یا پھر یہ کہ خدا تمھارے ساتھ نہیں ہے ورنہ اتنی بے چینی اور پریشانی میں تم نہ مبتلا ہوتے!"

شبلی نے جواب دیا: "اگر میں خدا کے ساتھ ہوتا تو میری ایک الگ حیثیت بھی ہوتی لیکن میں تو اس ذات میں گم ہو گیا ہوں اور اب ہم دو نہیں وہی ایک ہیں!" پھر قدرے افسوس سے کہا: "میں ہمیشہ اس بات سے خوش ہونے کی کوشش کرتا ہوں کہ مجھے خدا کا مشاہدہ اور انس حاصل ہے لیکن جسے تم لوگ خوشی کہتے ہو، ویسی خوشی اپنی ہی جنس سے مل کر حاصل ہوتی ہے!"

اسی عالم کیف و مستی میں وہ جنید بغدادی کے پاس پہنچ گئے۔ اُس وقت جنید بغدادی کی بیوی کنگھی کر رہی تھیں۔ وہ شبلی کو دیکھتے ہی پردے میں جانے لگیں تو جنید بغدادی نے فرمایا: "تم شبلی سے پردہ کرتی ہو حالانکہ یہ جس کیف و مستی کے شکار ہیں اس میں انھیں دوزخ و جنت کی بھی پروا نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایک عورت کا خیال!"

بیوی رک گئیں۔ شبلی دیر تک جنید بغدادی کو دیکھتے رہے۔ آخر وہ رونے لگے۔ انھیں ہچکیاں لیتے دیکھ کر جنید بغدادی نے بیوی سے کہا: "اب تم اندر چلی جاؤ کیونکہ اب یہ ہوش میں آ گئے ہیں!"

بیوی فوراً ہی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

جنید بغدادی نے چھیڑنے کے انداز میں کہا: "شبلی! مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمھیں ذکرِ الٰہی میں صدق حاصل نہیں ہے۔ اگر میری یہ بات درست ہے تو میں پریشان ہوں کہ تم خدا کو یاد کس طرح کرتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا: "آپ نے درست فرمایا۔ جب میں مجازی اعتبار سے اس کا بے حد ذکر کرتا ہوں تو ایک بار وہ بھی مجھے حقیقت کے ساتھ یاد کر لیتا ہے اور میرے لیے یہ بہت کافی ہے!"

شبلی کے اس مکالمے نے جنید بغدادی کو اتنا مضطرب کر دیا کہ ھو اللہ کا نعرہ لگا کے بے ہوش ہو گئے۔

صبح کی خنک اور خوشگوار فضا میں شبلی نے ایک پُراسرار آواز سنی: "شبلی! تو اس ذات کے ساتھ کب تک خود کو وابستہ رکھے گا؟ کسی کو کیوں نہیں تلاش کرتا!"

اس آواز نے تازیانے کا کام کیا۔ شبلی پریشان تھے کہ کسی کو کہاں تلاش

کرتی یہ اضطراب اتنا بڑھا کہ وارفتہ اور سرشار دریائے دجلہ میں کود گئے لیکن موجوں نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دریا نے انھیں دوبارہ کنارے پر پھینک دیا گیا۔ اِدھر سے مایوس ہو کے شبلی نے جنگل کا رُخ کیا اور خود کو درندوں کے درمیان کھڑا کر دیا کہ وہ انھیں چیر پھاڑ کے کھا جائیں لیکن درندے انھیں دیکھتے ہی دُم دبا کے اِدھر اُدھر منہ چھپانے لگے۔ مایوس ہو کے یہ پھر آبادی میں آ گئے اور آگ کا الاؤ روشن کر کے اس میں داخل ہو گئے لیکن آگ نے انھیں جلانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ شعلے سانپ کی زبانوں کی طرح ان کے جسم کو یوں مس کرتے جیسے شفیق گائے اپنے نومولود بچے کو زبان سے چاٹ چاٹ کے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔ عاجز آ کے یہ الاؤ سے باہر نکلے اور زار و قطار رونے لگے۔ اب ان کے سامنے ہلاکت کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی۔ وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور اس پر سے چھلانگ لگا دی۔ ہوا نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا اور کسی ہلکے پھلکے پرند کی طرح آہستہ آہستہ نیچے سبزے پر آ گرے۔ ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی مجروح نہ ہوا تھا۔ یہ اُٹھے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تو خود ہی یہ کہتا ہے کہ اسمِ ذات کے بجائے میں مسمّٰی کو تلاش کروں اور مطالبہ ہے کہ تو اپنی مرضی سے جب چاہتا ہے میری ذات میں حلول کر جاتا ہے لیکن اگر میں خود تجھ میں شامل ہونا چاہوں تو اس وقت تک شامل نہیں ہو سکتا جب تک میں اپنے مادی جسم سے روح جدا نہ کر دوں۔ میں مستقل وصال چاہتا ہوں، مستقل اور دائمی اتصال۔"

یہ کہہ کے وہ زار و قطار رونے لگے اور کچھ دیر بعد پھر گویا ہوئے: "اللہ! میں کتنا مایوس انسان ہوں کہ میں نے تجھ سے اتصال و وصالِ دائمی کی خاطر خود کو دجلہ میں گرا دیا لیکن اس نے میری کوئی مدد نہ کی۔ میں نے خود کو درندوں کے حوالے کر دیا وہ مجھ سے گریزاں رہے۔ میں نے اپنے تئیں آگ میں ڈال دیا تو آگ نے اپنی فطرت بدل دی۔ میں نے خود کو پہاڑ کی بلندی سے گرایا تو ہواؤں نے مجھے اپنی گود میں لے کر آہستگی سے سبزے پر لا ڈالا۔ آہ میں کتنا بے بس اور مجبور انسان ہوں۔ میں تجھے کس طرح اور کہاں حاصل کروں؟ مستقل وصال اور دائمی اتصال کی خواہش کس طرح پوری کروں!"

ایک بار پھر وہی پُراسرار آواز سنائی دی: "شبلی! جو بندہ محبوبِ الٰہی ہوتا ہے اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا!"

شبلی پریشان اور ماندہ جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

"خدا کے لیے مجھے زنجیروں سے جکڑ دو۔ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں!"

جنید بغدادی کچھ دیر انھیں دیکھتے رہے پھر کہا: "تمھیں یہ کیا ہو گیا ہے شبلی؟"

شبلی نے جواب دیا: "صبر و انتظار کی راہ بہت کٹھن ہے۔ مجھے زنجیروں سے جکڑ دو ورنہ میں بکھر جاؤں گا!"

انھیں ان کی خواہش پر زنجیروں سے جکڑوا دیا گیا۔

جنید بغدادی نے افسوس کرتے ہوئے کہا: "مَن طَلَبَ وَجَدَ (جس نے طلب کیا اس نے پایا)۔"

شبلی نے تردید کی: "نہیں، جس نے پایا اس نے طلب کیا۔"

جنید بغدادی نے نصیحت کی: "شبلی! تم میری ایک بات مانو!"

شبلی ہانپ رہے تھے، پوچھا: "کون سی بات؟"

جنید بغدادی نے کہا: "اگر تم اپنے امور خدا کے سپرد کر دو تو تمھیں سکون مل سکتا ہے!"

شبلی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا: "نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر خدا امور میرے اور مجھ پر ہی چھوڑ دے تو مجھے سکون مل سکتا ہے!"

جنید بغدادی نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا: "شبلی! تمھاری باتوں میں تلوار جیسی کاٹ ہے اور اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں!"

جب طبیعت اعتدال پر آ گئی اور لوگوں سے پُرسکون لہجے میں باتیں کرنے کے قابل ہو گئے تو ایک دن انھوں نے کسی برتن فروش کی آواز سنی جو بار بار کہہ رہا تھا: "بس ایک پیالہ بچا ہے، صرف ایک!"

شبلی کی حالت پھر متغیر ہو گئی۔ شبلی دھاڑ مار کے کہنے لگے: "یہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ بس ایک ہی باقی ہے، وہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا!"

کسی کی میّت میں شبلی کو بھی لے جایا گیا اور انھیں اس وقت بڑی مشکل پیش آئی جب ان سے میّت کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے کہا گیا۔ شبلی نے انکار کیا لیکن لوگ نہیں باز آئے اور شبلی کو نمازِ جنازہ پڑھانی ہی پڑی۔ انھوں نے اس میں چار تکبیروں کے بجائے پانچ تکبیریں کہہ دیں۔ نماز ختم ہونے کے بعد لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور پوچھا: "کیوں جناب! جب نمازِ جنازہ میں شریعت نے چار تکبیریں رکھی ہیں تو آپ نے پانچ تکبیریں کیوں کہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "میں نے چار تکبیریں مرنے والے کے لیے ادا کی تھیں اور ایک تکبیر دُنیا اور اہلِ دُنیا کے لیے کہی تھی کیونکہ یہ بھی مر چکے!"

لوگ اپنا سا منہ لے کے سامنے سے ہٹ گئے۔

ایک بار آپ سخت بیمار پڑ گئے۔ اطبا نے انھیں گھیر لیا اور دوائیں تجویز کرنے کے بعد جب واپس جانے لگے تو بعض چیزوں کے کھانے سے منع کیا۔ شبلی نے کہا: "مجھے معلوم نہیں کہ ان چیزوں سے پرہیز کروں گا یا نہیں؟"

کسی طبیب نے کہا: "تمھیں معلوم کیوں نہیں جبکہ ہم تمھیں ان کے کھانے سے منع کر رہے ہیں تو تمھیں ان سے ضرور پرہیز کرنا چاہیے۔"

شبلی نے مسکرا کے کہا: "بے وقوفو! جو رزق میری قسمت میں لکھا جا چکا ہے اس کے کھانے سے مجھے کون منع کر سکتا ہے اور جو رزق قسمت میں نہیں لکھا گیا وہ میں کس طرح کھا سکتا ہوں!"

طبیب اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔

شبلی کے زہد و نفس کُشی کا چرچا عام تھا۔ لوگ مثال میں ان کا نام لیتے۔ انھیں جہاں کہیں دیکھتے ان کا احترام کرتے لیکن یہ کسی بات کی پروا کیے بغیر اپنی دُھن میں مست رہتے۔ جنید بغدادی کی مجلس میں مریدوں اور درویشوں کا ہجوم تھا۔ جنید بغدادی توحید، صدق و شوق اور معرفت پر وعظ فرما رہے تھے۔ اس وقت شبلی بھی شریکِ مجلس ہو گئے۔ لوگوں نے انھیں دیکھا تو جذبۂ احترام میں کسی درویش

نے کھڑے ہوکر عرض کیا: "حضرت! ابھی عشق و محبت اور علمِ حقیقی کا آپ ذکر فرما رہے تھے، اس میں شبلی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں!"

جنید بغدادی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا، جنید نے غضب میں کہا: "اے شخص! تیرا یہ قول درست نہیں ہے تو غلط کہہ رہا ہے۔ شبلی کی حقیقت مجھے معلوم ہے وہ معرفت و عرفان سے بہت دور ہے وہ اس لائق بھی نہیں کہ میری مجلس میں جگہ دی جائے، اسے اسی وقت اس مجلس سے نکال باہر کرو!"

جنید بغدادی کے مریدوں نے تامل سے کام لیا، انھوں نے پھر حکم دیا۔

"میں کہتا ہوں شبلی کو اسی وقت میری مجلس سے نکال دو!"

چند مرید اٹھے اور شبلی کو دھکے دے کے مجلس سے نکال دیا۔ اس کے بعد جنید نے اس درویش کو مخاطب کیا جس نے شبلی کی تعریف کی تھی کہا: "نوجوان! تو نے شبلی کے سامنے اس کی تعریف کر کے اسے ہلاک کر دینا چاہا تھا کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے تعریفی جملے شبلی کے حق میں تلوار تھے کیونکہ غرور کا اس پر معمولی سا اثر بھی ہو جاتا تو اس کے نفس کی سرکشی عود کر آتی اور اس کا تفاخر اور تکبر اسے ہلاک کر دیتا لیکن میری ہجو اور مجلس سے دھکے دے کر نکلوا دینے کا عمل اس کے حق میں ڈھال بن گیا اور وہ ہلاکت سے بچ گیا!"

اسی زمانے میں حسین ابنِ منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا، شبلی نے جوش میں کہا: "میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا!" لیکن جب منصور کو شبلی کے ارادے کا علم ہوا تو کہا: "شبلی کو یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہیے یہ کام دوسرے لوگ انجام دے لیں گے!" شبلی نے کہا: "ابنِ منصور کو ایسی باتیں علی الاعلان نہیں کرنا چاہئیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ایک دنیا کو فتنہ و فساد کے حوالے کر دیں؟"

لیکن جس دن ابنِ منصور کو قتل کیا گیا شبلی نے ابنِ منصور کے تعلق میں پوری رات عبادت میں گزار دی۔

شبلی فقہ مالکی کے پیرو تھے اور فقہ و اجتہاد میں بھی بے مثل تھے لیکن ان کی وارفتگی اور عشقِ الٰہی میں دیوانگی نے انھیں دنیا کے ظاہری علوم سے بے نیاز کر دیا تھا۔

انتقال سے پہلے لوگوں سے کہا: "مجھے وضو کرا دو!"

اہلِ ارادت نے انھیں وضو کرایا، آپ نے چند اشعار پڑھے۔

كُلُّ بَيتٍ اَنتَ ساكِنُهٗ — اَينَ مُحتاجٍ اِلَى السِّراجِ
جس گھر میں تو قیام پذیر ہو جائے — اسے چراغ کی حاجت نہیں رہتی
وَجهُكَ المَأمُولُ حُجَّتُنا — يَومَ يَأتِي النّاسُ بِالحُجَجِ
تیرا حسین چہرہ ہی ہمارے لیے حجت ہے — اس دن کے لیے جب لوگ حجتیں پیش کریں گے۔

لوگوں کو ان کے انتقال فرمانے کا یقین ہو چکا تھا وہ عیادت کے بجائے نمازِ جنازہ میں شرکت کی غرض سے جمع ہونے لگے شبلی انھیں دیکھ کر ہنس دیے بولے: "لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ زندہ کی نماز پڑھنے چلے آئے ہیں!"

شبلی اس وقت بھی اللہ اللہ کر رہے تھے کسی نے کہا: "آپ لا الٰہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟"

شبلی نے بے چینی سے جواب دیا: "جب غیر موجود ہی نہیں تو میں نفی کس کی کروں؟"

لوگوں نے کہا: "یہ شریعت کا حکم ہے!"

شبلی نے جواب دیا: "میرے کان سن رہے ہیں، اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میں رشوت قبول نہیں کروں گا!"

لیکن کسی ظاہر دار نے پھر اصرار کیا: "کلمہ پڑھیے!"

شبلی نے ضبط و تحمل سے جواب دیا: "عجیب مردہ زندہ کو نصیحت کر رہا ہے!"

لوگوں نے خاموشی اختیار کی، کچھ دیر بعد کسی نے پوچھا: "اب آپ کی کیسی حالت ہے؟"

شبلی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا: "ٹھیک ہوں، دوست اپنے دوست سے مل گیا!"

یہ کہہ کے آپ خاموش ہو گئے، کچھ دیر بعد جب لوگوں نے آپ کو پھر مخاطب کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وصال فرما چکے ہیں۔

انتقال کے ایک عرصے بعد ان کے ایک عقیدت مند نے شبلی کو خواب میں دیکھا، اس نے شبلی سے پوچھا: "کیا قبر میں نکیرین نے آپ سے کچھ پوچھا تھا؟"

شبلی نے جواب دیا: "ہاں پوچھا تھا کہ تمھارا رب کون ہے؟"

عقیدت مند نے سوال کیا: "پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

شبلی نے کہا: "میں نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس نے تمھیں اور دوسرے ملائکہ کو یہ حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، اس وقت میں بھی آدم کی پشت میں موجود تھا اور تمھیں سجدہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس پر نکیرین نے آپس میں کہا: اس شخص نے تو پوری اولادِ آدم کی طرف سے جواب دے دیا، یہ کہا اور واپس چلے گئے!"

عقیدت مند نے ایک اور سوال کیا: "آپ نے بازارِ آخرت کو کیسا پایا؟"

شبلی نے جواب دیا: "نہایت پھیکا، بے مزہ، بے لطف اور بے کیف!"

عقیدت مند نے حیرت سے کہا: "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

شبلی نے کہا: "میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں، یہاں سوختہ جگر اور شکستہ قلب آتے تو ہیں اور انھیں نادیدہ شے کا جلوہ دکھا کے درست کر دیا جاتا ہے جو چیز انسان کو لذت اور کیف بخشتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی یعنی لذتِ آشنائی اور جب لذتِ آشنائی ہی میسر نہ ہو تو رونق، لطف اور کیف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جس دل میں داغِ آرزو پایا جاتا تھا وہ یہاں کہاں؟"

علامہ اقبال مرحوم نے اسی کیفیت کی بابت یوں اظہار کیا تھا کہ ایک داغ دار دل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے لیے علامہ نے کہا تھا۔

جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

اور دوسری جگہ لذتِ آشنائی کا اس طرح اظہار کیا تھا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

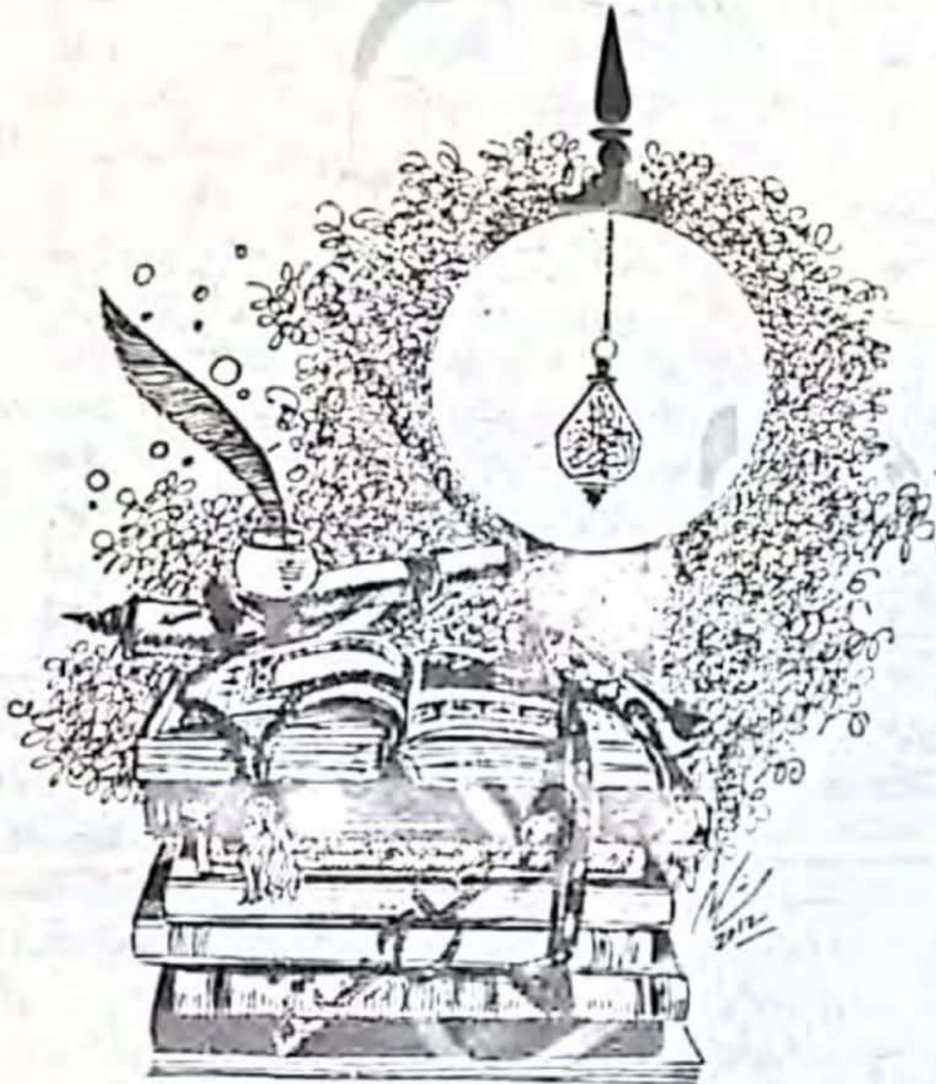
یہ لذتِ آشنائی ہی تھی جس نے ابنِ منصور کو دار پر چڑھوا دیا اور وہ ساری اذیتیں ہنسی خوشی جھیل گئے اور یہ بھی لذتِ آشنائی کا ایک کرشمہ تھا جس نے نہاوند کے حاکم کو درویشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور اس راہ کی ساری اذیتیں اور رسوائیاں جھیلنے کے بعد بھی صبر و شکر اور برداشت و تحمل کا پابند اور قانع رکھا، یہ بلند مرتبہ جسے ملنا تھا مل گیا ورنہ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟ ✻

سرمد شہید

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ اپنے لیے جب خاص بندوں کا انتخاب کرتا ہے تو ان کے عادات واطوار اور کردار بھی بہت خاص بنا دیتا ہے۔ ایران کی سرزمین پر پیدا ہونے والے اس ولی کا مزاج بھی بچپن سے بہت منفرد رہا، اس کے نزدیک حرص وہوس اور دولت کی تجارت ہمیشہ بے معنی رہی۔ شاہ جہان کے دور میں اس ولی کا بہت شہرہ تھا جس کا دارا شکوہ بھی گرویدہ رہا... بالآخر حالات کی ستم ظریفی نے اورنگ زیب کے حکم پر ان کا سر تن سے جدا کرا دیا۔

دنیاوی تجارت کی نفی کرنے والے ایک ولی کی سچی اور کھری باتیں



سترھویں صدی کے ایران میں جو قومیں آباد تھیں ان میں یہودی بھی شامل تھے۔ ان کی اکثریت کاشان میں آباد تھی اور یہ بیشتر تاجر تھے۔ جو مسلمانوں میں گھلے ملے رہنے کے باوجود اپنی قومیت اور سماجی روایات کو دل وجان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کے گرد وپیش اسلام کا چرچا رہتا مگر یہ اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے مگر تابہ کے۔ آخر اسلام نے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں سے بعض کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسلامی علوم وفنون کو محض ان کی افادیت کے پیش نظر اختیار کرتے لیکن پھر وہ اس کی محبت اور

عقیدت میں مبتلا ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں ایک نوجوان یہودی عالم بھی شامل تھا۔ اس کا یہودی نام کیا تھا کسی کو نہیں معلوم لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد اس کا اسلامی نام سعید رکھا گیا۔ سعید کو خدا نے بڑا اخلاق ذہن اور گداز دل دیا تھا۔ شعری مذاق بھی کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے مسلمان علما اور شعرا کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس کے ذوقِ شعری نے شعر گوئی پر مجبور کیا تو اس نے اپنے لیے وہ راہ اختیار کی جو روایتی شاعری سے الگ تھی۔

سعید نے اپنا تخلص سرمد رکھا۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا۔ خود بھی یہی اختیار کیا۔ خاندان کے دوسرے لوگ نفع و نقصان کی فکر میں رہے مگر سرمد کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ حرص و ہوا بہت بری شے ہے۔ سرمد نے اپنی شاعری میں حرص و ہوا کی مذمت شروع کر دی۔ سرمد نے اپنے عزیزوں پر رشتے داروں کو فکر دنیا میں سر کھپاتے دیکھا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے حرص و ہوا کی مذمت میں کئی رباعیاں کہیں۔

دنیاز ہوا و حرص بسیار پر است
حرص و ہوس کی زیادتی سے دنیا لبریز ہے
ہر جا ست و لے درغم دینار پر است
جہاں دیکھیے دینار کی فکر و محبت میں گرفتار ہیں
بیمار بے شربت دینار کم است
بیماروں کی کثرت ہے مگر شربتِ دینار قلیل ہے
ایں خانۂ ویرانہ زبیمار پر است
یہ ویران گھر بیماروں سے بھرا ہوا ہے

دوسری رباعی میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

ہر جا کہ گرفتار ہوا و ہوس است
جسے دیکھیے ہوا و ہوس میں گرفتار ہے
گر سلطنتش دہی، نگوید کہ بس است
اگر انہیں سلطنت بھی بخش دی جائے تو بس نہیں کریں گے
سررشتۂ زندگی بسے کوتاہ است
حالانکہ زندگی چند روزہ ہے
از طول امل حذر، کہ دام و قفس است
طول امل سے بچ کیونکہ یہی دام بھی ہے اور قفس بھی

ان رباعیوں نے خاندان میں تہلکہ مچا دیا، گھر کے بڑے بوڑھے سر جوڑ کر بیٹھے اور آپس میں مشورے کرنے لگے۔ چچا نے کہا۔ ”یہ سرمد کو ہو کیا گیا ہے۔ یہ کیسی فضول باتیں کرنے لگا ہے؟“

بیمار باپ کو بھی بڑی فکر تھی۔ اس نے کہا۔ ”اس میں غلطی ہماری ہی ہے۔ ایران اور اس کے مضافات میں مسلمان صوفیوں کی کثرت ہے۔ یہ لوگ ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ سرمد بھی ان کی تعلیمات سے متاثر ہوا اور ایسی فضول رباعیات لکھنے لگا۔“

بہن نے پوچھا۔ ”لیکن اس کا علاج کیا ہے؟“

چچا نے جواب دیا۔ ”اس کا علاج یہ ہے کہ سرمد کو مسلمان صوفیا اور شعرا کی صحبت میں نہ جانے دیا جائے۔“

باپ بہت مایوس تھا، اس نے پوچھا۔ ”مگر کس طرح؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ایران میں رہیں اور صوفیوں اور شاعروں سے محفوظ رہیں شاید ایسا بالکل ممکن نہیں۔“

چچا کو سب سے زیادہ فکر تھی، اس نے کہا۔ ”دولت، جو زندگی کا اصل مقصد ہے کیا اس کے بغیر آدمی خوش و خرم رہ سکتا ہے؟“

بہن نے جواب دیا۔ ”زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا دولت......؟ شاید یہ جواب ہر ایک کا ہو لیکن میں یہ کہوں گی کہ ایسا ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ سرمد کو اگر بدلنا ہے تو اس کے لیے انتہائی فکر و تدبر سے کام لینا ہوگا۔ سرمد میرا بھائی غیر معمولی فکر و شعور کا حامل ہے، اگر معمولی فکر و شعور کے حامل افراد نے سرمد کو نصیحتیں کیں تو یہ نوجوان اپنے آپے سے باہر ہو جائے گا۔“

چچا نے ایک بار پھر تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”صاحبان! میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اپنے بھتیجے کی افتادِ طبع سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ وہی کرے گا جو اس نے ٹھان لیا ہوگا۔“

باپ نے کہا۔ "اچھا سرمد کو بلواؤ اور یہ ساری گفتگو اس کی موجودگی میں ہو تو اچھا ہے۔"

سرمد کو اسی وقت ان لوگوں کے سامنے طلب کر لیا گیا۔ ان سب کا خیال تھا کہ شاید یہاں سرمد تکلف، لحاظ یا ادب سے کام لے لیکن اس کی تیزی اور طراری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ باپ نے کہا۔ "سعید! تو مسلمان ہو گیا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس معاملے میں شاید میں بھی تیرا ساتھ دوں لیکن یہ تو بتا کہ تو نے مذہب کے ساتھ ساتھ اپنے شوق اور تجسس کو کیوں بدل ڈالا؟ دنیا آسودہ حال لوگوں کی ہوتی ہے مگر تو ہمیں یہ تعلیم دے رہا ہے کہ مال و زر بیکار چیزیں ہیں۔ اگر انسان مال و زر سے محروم ہو تو اس کی زندگی ہی کیا؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "باوا جان! میں مسلمان ہو گیا، میری اپنی سوچ، فکر اور تجربے کا نتیجہ ہے۔ میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ جو میں نے کیا وہی آپ بھی کریں لیکن جس دن بھی آپ فکر اور تجربے کی اس منزل میں داخل ہو گئے جس میں، میں داخل ہو چکا ہوں تو آپ بھی اسلام قبول کر لیں گے۔ رہی یہ بات کہ میں مال و زر اور دولت سے نفرت کرتا ہوں اور لوگوں کو حرص و ہوس سے دور رہنے اور بچنے کی تلقین کرتا ہوں تو یہ میرے اندر کی آواز ہے۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔"

چچا کو غصہ آ رہا تھا۔ "لیکن تیری تعلیمات سے میرے خاندان پر بُرا اثر پڑے گا۔ مال و زر کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں، مفلسی میں انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور افلاس ہی وہ لعنت ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔"

سرمد کو بھی غصہ آ گیا۔ جواب دیا۔ "اور مال و زر کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ مال و زر میں انسان خدا ہی کو نہیں، خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ تکبر جس نے معلم الملکوت کو ابلیس بنا دیا، یہ دولت و زر کا پھل ہے۔ ہوس کا بیج ڈالیے گا تو رنج و غم کی فصل کاٹیے گا۔"

باپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "اچھا، تم شاعری کرتے رہو اور جو جی میں آئے کرتے رہو لیکن تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

سرمد نے جواب دیا۔ "آپ کا ایک کام نہیں دس کام کرنے کو تیار ہوں۔"

باپ نے کہا۔ "تم مال و زر سے نفرت کرتے رہو لیکن کاروبار چونکہ ہمارا آبائی پیشہ ہے اس لیے تجارت میں میرا ہاتھ بٹاؤ..... تم حرص و ہوا سے دور رہو لیکن تجارت میں خسارہ بھی نہ ہونے دو۔ تمہیں مال و زر نہیں چاہیے لیکن مجھے اور خاندان کو تو یہ چیزیں درکار ہیں۔ تم جو کچھ کماؤ، خاندان کے کام آئے گا۔"

سرمد نے کہا۔ "میں نے کاروبار سے تو کبھی انکار نہیں کیا۔ میں تجارت ضرور کروں گا۔ شاعری اپنی جگہ، تجارت اپنی جگہ۔"

باپ نے گمبھیر لب و لہجے میں کہا۔ "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم تجارت کی غرض سے ہندوستان جاؤ گے۔ اب تمہارا اس ملک ایران میں رہنا مناسب نہیں۔"

سرمد سکتے میں رہ گیا۔ کچھ دیر باپ کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "جو حکم باوا جان کا۔ ہندوستان کیا، میں دنیا کے دوسرے کنارے تک جا سکتا ہوں۔"

سرمد یہ کہہ کر چلا گیا لیکن اس کی بہن کی حالت غیر ہو گئی۔ باپ سے جھنجلا کر پوچھا۔ "باوا جان! یہ آپ نے کیا حکم دے دیا۔ سرمد کو ہم سے جدا کیوں کر رہے ہیں؟"

چچا نے کہا۔ "بھائی نے یہ بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اب سرمد کا ایران میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اگر یہ یہاں رہے گا تو اس سے ہمیں دو نقصان پہنچیں گے۔ پہلا نقصان یہ کہ اس کے مسلمان ہو جانے کا اثر دوسرے نوجوانوں پر بھی پڑے گا اور دوسرا اثر یہ پڑے گا کہ نرم اور کمزور دل و دماغ والوں کو مال و زر سے نفرت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا ہندوستان چلے جانا مناسب رہے گا۔"

بہن نے کہا۔ "تم محترم! آپ بڑے ظالم ہیں۔"

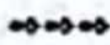
چچا نے اس کو بھی ڈانٹ دیا۔ "اچھا چپ رہ لڑکی! تو بھی سرمد ہی جیسی سوچ رکھتی ہے۔"

باپ نے دونوں کو منع کر دیا۔ "اچھا اب تم دونوں فضول باتوں میں نہ پڑو۔ خاموش ہو جاؤ۔"

بہن سرمد کے پاس چلی گئی۔ بھائی نے اپنے بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "بھائی جان! مجھے تو اس لڑکی میں بھی چند برائیاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ سرمد سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کو بھی قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔"

سرمد کے باپ نے جواب دیا۔ "اچھا اب خدا کے لیے تم چپ ہو جاؤ۔"

سرمد کا چچا ایک ہی کائیاں تھا، بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔



سرمد نے سامان تجارت لیا اور خلیج فارس کی ایک بندرگاہ کی سرائے میں اتر پڑا۔ یہاں اس کو اس جہاز کا انتظار تھا جس پر بیٹھ کر وہ ہندوستان جانے والا تھا۔ اس کی بہن یہاں تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ وہ بہت اداس تھی۔ اس نے سرمد سے اصرار کیا۔ "بھائی! تم جا تو رہے ہو لیکن واپس ذرا جلدی آنا۔"

سرمد نے بہن کی پیشانی کو چوم لیا، بولا۔ ''بہن! تو فکر نہ کر، میں اگر واپس آؤں گا تو تیری وجہ سے، تیری خاطر۔ ورنہ میرا جی دنیا سے بھر گیا ہے۔''

بہن نے روتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! باپ کے بعد اپنا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ بس تم ہی ہو جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔''

سرمد نے جواب دیا۔ ''بہن میں بھی تجھ سے پیار کرتا ہوں، میں نے کہہ جو دیا کہ جب میں واپس آؤں گا تو اس میں تیری چاہت اور پیار کو بڑا دخل ہوگا۔ میں چاہتا ہوں، اس حرص و ہوا کی دنیا کو تو بھی چھوڑ دے۔''

بہن نے جواب دیا۔ ''بھائی میں تمہاری ہر بات کو مان لوں گی مگر تمہیں بھی یہ اقرار کرنا ہوگا کہ واپس ضرور آؤ گے۔''

سرمد نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''میں واپسی کا وعدہ تو نہیں کروں گا لیکن آنے کی کوشش ضرور کروں گا۔'' پھر اپنی بہن کے دونوں گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''پیاری بہن! تو اداس نہ ہو میں ایک نہ ایک دن واپس ضرور آؤں گا تو بے فکر رہ۔''

جہاز ساحل پر کھڑا مسافروں کا منتظر تھا۔ سرمد نے اپنی بہن کو روتا چھوڑ کر جہاز میں قدم رکھا اور ایران پر آخری الوداعی نظر ڈالی، اس وقت سرمد کے دل کی عجیب سی حالت تھی، گداز دل پر چوٹ لگی اور دنیا اور کاروبار دنیا ہیچ نظر آنے لگے۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور سفر شروع کر دیا۔ کئی دن اور کئی راتیں جہاز پر ہی کٹ گئیں۔ اس میں بیشتر تاجر سفر کر رہے تھے۔ سرمد اپنے افکار میں گم رہا اور کسی سے ربط وضبط نہ بڑھا سکا۔ دوسرے لوگ باتوں میں مشغول رہے، یہ سب اپنے مستقبل کی باتیں کر رہے تھے۔ انہیں اپنی اپنی تجارت کے ممکنہ سود و زیاں کی فکر لاحق تھی۔ انہوں نے اپنے ہمسفروں میں سرمد جیسا خاموش جوان دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ انہیں یہ شخص کسی طرح بھی تاجر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سرمد کو بار بار باتوں پر مجبور کرتے مگر اس کا بھرپور مگر مختصر جواب انہیں خاموش کر دیتا۔

جہاز کے عرشے سے سرمد نے سمندر کی امواج کا مشاہدہ کیا اور یہیں سے جب اوپر نظر کی تو لامتناہی نیلے آسمان کی وسعتوں نے سرمد پر ایک دہشت سی طاری کر دی اور انہیں اپنا وجود ایک تنکے سے بھی حقیر تر محسوس ہونے لگا۔ دنیا کی ہر شے ایسی نظر آ رہی تھی جو ایک بار نظر آنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والی تھی۔ سرمد کو تجارت، سامان تجارت اور علائق دنیا ہیچ نظر آ رہے تھے۔ اس جہاز میں سرمد نے ایک تاجر کو مرتے ہوئے دیکھا جس کا سارا سامان تجارت دھرا کا دھرا رہ گیا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے کہیں اور جا چکا تھا۔ سرمد کو تاجر کی موت نے اور زیادہ تڑپا دیا۔

کئی دنوں بعد یہ جہاز ٹھٹھہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ سرمد نے ساحل پر چھلانگ لگائی اور وہاں کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ یہ شاہجہانی عہد تھا۔ ہندوستان پر مغل خاندان کی حکومت تھی۔ سرمد نے دو دن آرام کر کے اپنے سفر کی تکان دور کی اور اس کے بعد بازار کا جائزہ لینے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹھٹھے کے بازار میں بڑی رونق تھی۔ سرمد کو یہاں کے عربوں سے مشابہ لوگ بہت اچھے لگے۔ لوگ ان غیر ملکی تاجروں کو بڑے شوق سے دیکھتے۔ خاص کر بچے ان میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ سرمد کو یہاں ایک راہنما کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک دکان پر ایک ہندو لڑکے کو بیٹھے ہوئے دیکھا جو ٹکٹکی باندھے انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ سرمد نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ لڑکا بے حد حسین تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا۔

سرمد نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ فوراً ہی اٹھا اور سرمد کے قریب جا کر پوچھا۔ ''مجھے تم کوئی غیر ملکی نظر آتے ہو، کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

سرمد نے جواب دیا۔ ''ہاں میں ایک ایرانی تاجر ہوں۔ میرا آبائی وطن کاشان ہے مگر بغرض تجارت تیرے گھر آیا ہوں، تو میری رہنمائی کرتا کہ میں یہاں کی پریشانیوں سے بچ جاؤں۔''

لڑکا سرمد کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا، بولا۔ ''تاجر تم ہو اور رہنمائی میں کروں، خوب۔ تم یہاں کس کے بھروسے پر آئے ہو؟ کیا میرے بھروسے پر؟''

سرمد کو لڑکے کی بھولی بھالی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ انہوں نے لڑکے کو نظر بھر کے دیکھا تو اس میں کچھ اور ہی نظر آیا۔ لڑکا حسین بھی تھا اور سادہ لوح بھی۔ چہرے پر معصومیت نے بڑی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ سرمد نے کہا۔ ''لڑکے! میں نہیں جانتا کہ تیرا نام کیا ہے، تو کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے اور تیرا مذہب کیا ہے؟ مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تجھے ابد سے جانتا ہوں۔ تیری صورت میں آشنا کی شباہت ہے، آ میرے قریب آ، تاکہ میں جی بھر کے تجھے دیکھ لوں اور یہ جاننے کی کوشش کروں کہ تو مجھے کیوں اچھا لگتا ہے اور میں تجھے کب سے جانتا ہوں۔''

لڑکے کو سرمد کی باتیں عجیب سی لگیں۔ یہ شخص لڑکے کو بھی اچھا لگا۔ کوئی اندر بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے اور یہ کچھ جانا پہچانا شخص معلوم ہوتا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میرا تعارف یہ ہے کہ ہندو ذات سے تعلق رکھتا ہوں، یہیں قریب ہی بگڑ والے مکان میں رہتا ہوں، ابھی کرتا کچھ بھی نہیں۔ رہی یہ بات کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں اور تم مجھے ایک عرصے سے جانتے ہو، تو یہی کیفیت میری بھی ہے، میں نے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے، میں تم سے کہیں مل چکا ہوں، کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔''

سرمد نے کہا۔ "یہ تو بڑی مشکل بات ہوگئی کہ میں خود تو مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ میں تجھ سے دوستی قائم کرنا چاہتا ہوں، پتا نہیں تو اس پر راضی بھی ہوگا یا نہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "دوستی قائم کرنے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ رہی ذات پات کی بات اور اس کا فرق، تو یہ باتیں مجھے بذات خود اچھی نہیں لگتیں۔"

سرمد نے اپنا داہنا ہاتھ لڑکے کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "لڑکے اپنا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے۔ میں پیمان وفا باندھنا چاہتا ہوں۔"

لڑکے نے بے چون و چرا اپنا ہاتھ سرمد کے ہاتھ میں دے دیا اور دونوں نے دوستی کا معاہدہ کرلیا۔ سرمد نے لڑکے سے کہا۔ "لڑکے، اب ہماری ملاقات روز ہونی چاہیے۔"

لڑکے نے جواب دیا۔ "بالکل، میں تو تم سے ہر روز ملا کروں گا۔"

جب لڑکا اجازت لے کر چلا گیا تو سرمد کی حالت غیر ہوگئی انہیں ہر طرف وہی لڑکا نظر آرہا تھا۔ مقامی تاجروں نے سرمد سے ملاقات کی اور پوچھا کہ ان کے پاس کس قسم کا سامان موجود ہے تا کہ اس کا معاملہ کیا جائے؟

سرمد نے جواب دیا۔ "صاحبان! میرے پاس جس قسم کا سامان ہے اس کا تمہارے شہر میں ایک بھی خریدار نہیں، میں کیا بتاؤں کہ میرے پاس کس قسم کا سامان ہے۔"

ایک تاجر نے مسکرا کر دوسرے تاجروں کو دیکھا اور سرمد پر طنز کیا۔ "بھائی! تو نوجوان ہے اور یہاں تجارت کرنے آیا ہے۔ یہ تو باتیں کس قسم کی کر رہا ہے، اس طرح تو، تو کاروبار کر چکا۔"

دوسرے تاجر نے کہا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے کہ اسے کاروبار اور مال وزر سے کوئی محبت نہیں۔ یہ ایک نااہل تاجر ہے۔"

سرمد نے جواب دیا۔ "واقعی میں ایک نااہل تاجر ہوں لیکن میں ایک ایسی تجارت بھی کر رہا ہوں جو کسی اور کو دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے ایک ایسی گراں مایہ متاع عزیز پالی ہے کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی خواہش نہیں رہی۔"

ایک تاجر نے پوچھا۔ "سرمد! ذرا یہ تو بتا کہ وہ ہندو لڑکے والا کیا چکر ہے۔ سنتا ہوں تو اس پر عاشق ہوگیا ہے؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "عاشق ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، بوالہوسی تو سبھی کرتے ہیں۔"

کسی اور تاجر نے پوچھا۔ "یہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟"

سرمد اس وقت گویا اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ جواب دیا۔ "یہ زمین خدا کی ہے اور... میں اس کا عاجز و ناتواں بندہ ہوں۔ جب تک وہ چاہے گا میں یہاں رہوں گا۔ پھر جب یہاں سے چلے جانے کا حکم ملے گا تو میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں رکوں گا۔ فوراً چلا جاؤں گا۔"

کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ "جوان غیر ملکی تاجر! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میری پیش گوئی لکھ لو کہ یہ شخص جس کا نام سرمد ہے قابل اعتبار شخص نہیں ہے ہمیں تو یوں لگتا ہے گویا اس کا دماغ چل گیا ہے۔"

سرمد نے نرمی سے کہا۔ "میں قابل اعتبار نہیں ہوں تو پھر اور کون قابل اعتبار ہوگا۔ میرا دماغ نہیں چل گیا۔ دماغ تو تم لوگوں کا چل گیا ہے جو دن رات مال وزر کمانے کی فکر میں گھلتے رہتے ہو۔"

کسی تاجر نے برا مان کر سرمد سے سوال کیا۔ "اچھا اب یہ فضول باتیں بند ہونی چاہئیں۔ سرمد! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کون سا اور کس قسم کا مال ہے تا کہ اس کا سودا کیا جاسکے۔"

سرمد نے بیزاری سے جواب دیا۔ "میرے پاس کوئی مال نہیں اور نہ ہی میں تاجر ہوں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے یہ کیسا دھندا اختیار کرلیا ہے۔"

ایک تاجر نے سرمد کو سمجھایا۔ "سرمد! یہ تمہاری مرضی کہ کاروبار کرو یا نہ کرو لیکن میری ایک بات ذہن نشین رکھنا، جس ہندو زادے سے تم نے عشق لڑانا شروع کردیا ہے وہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں تمہیں رسوائی، شرمندگی اور نقصان بھی اٹھانا پڑ جائے۔"

سرمد نے ہنس کر جواب دیا۔ "معلوم نہیں تم لوگ کتنے گندے خیالات رکھتے ہو۔ میں لڑکے سے عشق کروں گا۔ سبحان اللہ، یہ میرے سر الزام ہے، بہتان ہے۔"

کسی طرف سے آواز آئی۔ "ایران سے آئے تھے تاجر بن کر اور اب تجارت ہی سے توبہ کرلی۔ آخر کیوں؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی۔ ہماری سمجھ میں جو وجہ آئی بیان کردی۔ ہمارا کام سمجھانا ہے سمجھائے جارہے ہیں۔ ورنہ تم پڑھے لکھے عقلمند انسان ہو۔ یہ بات تو تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہوگی کہ جو بو کر گندم کی فصل نہیں کاٹی جاسکتی۔"

سرمد کو غصہ آگیا۔ چیخ چیخ کر تاجروں کو دھتکارنا شروع کردیا۔ "تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تشدد پر اتر آؤں گا۔ تم لوگ تو

مخبوط الحواس ہو گے ہی مجھے بھی اپنے ساتھ ویسا ہی بنانا چاہتے ہو، بھاگ جاؤ، چلے جاؤ۔"

تاجر حضرات وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ سرمد پر غشی سی طاری ہو گئی۔ وہ نڈھال ہو کر ایک طرف لیٹ گئے اور معلوم نہیں کب تک بے ہوش پڑے رہے لیکن جب ہوش آیا تو ہندو زادے کو اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ سرمد کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھا۔ "لڑکے تو کب آیا؟"

لڑکے نے پوچھا۔ "ذرا دیر پہلے، یہ تمہیں ہو کیا گیا تھا؟"

سرمد نے کہا۔ "تاجر حضرات مجھ پر شک کر رہے تھے، کہتے تھے، میں اپنا مال تجارت ان کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ میں نے ان کی درخواست مسترد کر دی۔ بس اس بات سے وہ لوگ مشتعل ہو گئے اور مجھے پاگل اور مخبوط الحواس کہنے لگے۔ لڑکے! تو ہی بتا کیا میں پاگل ہوں؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "نہیں تو، مجھے تو تم صحیح الدماغ معلوم ہوتے ہو۔"

"اور دوسری بات بڑی شرمناک کہہ گئے وہ لوگ۔" سرمد نے کہا۔

لڑکے نے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

سرمد نے نظریں جھکا لیں اور جواب دیا۔ "وہ لوگ مجھ پر تہمت لگا رہے تھے، کہتے تھے میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تجھ کو دیکھ کر وارفتہ ہو جاتا ہوں اور ایک ایسی کسک اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہوں جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتا ہوں، شاید میں اپنے رب کے عشق میں جتلا ہو جاؤں۔"

لڑکا سرمد کی باتیں بڑی توجہ اور انہماک سے سنتا رہا۔ شاید یہ باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں، وہ سرمد میں خود بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "بابا مجھے نہیں معلوم تم کیا اور کیوں کہہ رہے ہو لیکن اتنی بات میں بھی جان گیا ہوں کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو، کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں تمہارے پاس اٹھ بیٹھ لیا کروں؟"

سرمد نے کہا۔ "تو نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے اب یہ آگ میرے پورے وجود کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ لڑکے! ابتدا پہلے میں اپنے اندر ایک سوزش ضرور محسوس کیا کرتا تھا لیکن اس سوزش نے لو دے دی ہے اور میں خود کو اس آگ میں جلا کر بھسم کر دینا چاہتا ہوں۔"

لڑکا گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور سرمد کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر حاضر ہو گیا۔ لڑکا بھی سرمد میں کشش محسوس کر رہا تھا۔ وہ سرمد سے دور رہ کر یہی محسوس کرتا کہ کوئی چیز گم ہو گئی ہے اور کوئی اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، سرمد پر الزام لگنے لگے۔

لڑکے کے باپ کو اس صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ دوست احباب، عزیز اقارب لڑکے کے باپ کو طعنے دینے لگے۔ کسی نے کہا۔ "اپنے لڑکے کو سنبھالو، یہ کاشانی تاجر اسے بدنام کر رہا ہے۔"

کوئی کہتا۔ "مارنے والے کے ہاتھ پکڑے جا سکتے ہیں مگر کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو، لوگ تیرے لڑکے اور سرمد کی بابت کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

باپ کو غصہ آ گیا اس نے لڑکے کو منع کیا۔ "خبردار! جو تو اب سرمد کے پاس گیا۔"

لڑکے نے کوئی جواب تو نہیں دیا مگر باز بھی نہیں آیا۔ اس کے فوراً بعد سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ سرمد نے لڑکے سے پوچھا۔ "آج تیرا باپ تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

لڑکے نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

سرمد نے کہا۔ "لڑکے! جھوٹ نہ بول۔ اس نے تجھے میرے پاس آنے سے منع کیا تھا۔"

لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن اس کی خبر تمہیں کیسے ہوئی؟"

سرمد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میرے سینے میں ایک آگ سی روشن ہے اور میں اس روشنی میں نادیدہ چیز بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اسی روشنی میں، میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ تیرے نام نہاد دوست نما دشمن تیری بابت کس قسم کی خبریں پھیلا رہے ہیں۔"

لڑکے نے عاجزی سے کہا۔ "میں مجبور ہوں خدا بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن یہ طے ہے کہ میں یہاں کے علاوہ کہیں سکون نہیں پاتا۔"

سرمد نے کہا۔ "لڑکے! اگر بدنامی سے بچنے کے لیے کچھ کرنا پڑے تو اس میں یہ بات سرفہرست ہو گی کہ سرمد نے ایک بھولے بھالے لڑکے کو بدنام کر دیا۔"

لڑکے نے جواب دیا۔ "سرمد! میں کچھ نہیں جانتا، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں نے آپ کی صحبت میں بہت کچھ حاصل کیا ہے اور یہ حصولیابی کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔"

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ لڑکے کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اپنے لڑکے کو دیکھ کر سرمد پر گرم ہو گیا، بولا۔ ''سرمد! تم ٹھہرے تاجر، آج ہو، کل اپنے وطن ایران چلے جاؤ گے لیکن مجھے اپنے خاندان کے ساتھ یہیں رہنا ہے۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔''

سرمد نے جواب دیا۔ ''تیرے لڑکے کو میں تو نہیں بلاتا۔ اس کو روک کر کسی کوٹھڑی میں بند کر دو۔''

لڑکے کے باپ نے کہا۔ ''میں گھر میں اسے قید کر دیتا ہوں لیکن یہ کسی نہ کسی ترکیب سے باہر نکل بھاگتا ہے۔''

سرمد نے کہا۔ ''بس ایک بار اور قید کر دو۔''

باپ نے کہا۔ ''لیکن تم اسے منع کیوں نہیں کر دیتے؟''

سرمد نے لڑکے سے کہا۔ ''لڑکے! اب تو میرے پاس نہیں آئے گا۔''

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا اور باپ اپنے لڑکے کو لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن اس کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا، باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ دوپہر کو ماں نے رحم کھا کر کمرے کا دروازہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر غمگین ہو گئی کہ وہاں لڑکے کا کہیں پتا نہ تھا۔ ماں نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو تلاش کر کے میرے روبرو لاؤ، حیران ہوں کہ یہ نکلا کدھر سے؟

نوکر نے جواب دیا۔ ''ماتاجی! جب کمرے میں باہر سے قفل لگ گیا تھا تو یہ لڑکا جائے گا کہاں؟ میں اس کو کہاں تلاش کرتا پھروں؟''

ماں نے سختی سے کہا۔ ''لڑکے کو گھر میں نہ پا کر میرا پتی تو مجھے زندہ جلا دے گا۔''

لڑکے کی تلاش شروع ہو گئی لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔ دوپہر کو شوہر گھر میں داخل ہوا تو بیوی سے پوچھا۔ ''لڑکے کو کچھ کھانے پینے کو دیا تھا یا نہیں؟''

بیوی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ شوہر نے خاموش بیوی کو سوالیہ نظروں سے گھورا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے تم جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''

بیوی نے ڈرے سہمے لہجے میں جواب دیا۔ ''کس کی بات کر رہے ہیں؟''

شوہر بیوی کے سر پر جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''میں لڑکے کی بات کر رہا ہوں۔ اس لڑکے کی جسے میں صبح کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔''

بیوی نے جواب دیا۔ ''میں نے کھانا کھلانے کے لیے جب کمرے کو کھولا تو وہ خالی تھا۔''

شوہر نے غصے میں اپنی بیوی کی چوٹی پکڑ لی۔ ''تو بکتی ہے، جھوٹ بولتی ہے۔ تو نے اپنی ماتما میں لڑکے کو آزاد کر دیا۔''

بیوی نے عاجزی سے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں نے اس کو نہیں رہا کیا۔ اس سلسلے میں، میں ہر قسم کی قسم کھانے کو تیار ہوں کمرے سے کس طرح نکلا، میں نہیں جانتی لیکن جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو یہ بالکل خالی تھا۔''

شوہر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی لاتا ہوں اس کو تلاش کر کے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔''

وہ سیدھا سرمد کے پاس پہنچا۔ وہاں لڑکا سرمد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ باپ نے لڑکے کا نام لے کر اسے آواز دی۔ لڑکا سہم گیا اور بالکل سرمد سے بھڑ کر بیٹھ گیا۔

باپ نے پوچھا۔ ''کیا میں نے تجھے منع نہیں کر رکھا ہے یہاں آنے سے؟''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''یہ میں کب کہتا ہوں کہ منع نہیں کیا تھا۔''

باپ نے پوچھا۔ ''پھر تو کیوں اور کس طرح یہاں آ گیا؟''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کیوں اور کس طرح آ گیا۔''

باپ نے پوچھا۔ ''کمرے کا دروازہ کس نے کھولا تھا؟''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا کیونکہ میں نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا تو وہ کھلا ہوا تھا۔''

باپ نے سرمد کو مخاطب کیا۔ ''تاجر! تو نے اس لڑکے کو کیوں اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ خدا کے لیے اس کا پیچھا چھوڑ دے۔''

سرمد نے کہا۔ ''بابا! یہ اپنی مرضی سے آتا جاتا ہے۔ میری طرف سے اس کو اجازت ہے کہ اپنے گھر میں رہے اور میرے پاس نہ آئے۔''

باپ نے کہا۔ ''مسلم تاجر! تم مجھ پر اتنا کرم کرو کہ جب یہ تمہارے پاس آئے تو بھگا دیا کرو۔''

اس کے بعد باپ لڑکے کو لے کر چلا گیا۔

چند دنوں بعد سرمد کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ انہیں اپنا ہوش تک نہ رہا۔ جدھر سے گزرتے، لوگ آوازے کستے، مذاق اڑاتے،

سرمد کو اس عالم میں بھی یہ خیال رہا کہ ان کی جو حالت ہے اور اس کا جو سبب سمجھا جا رہا ہے اس سے ان کے دین کو نقصان پہنچا ہے، اس عالم میں انہوں نے ایک رباعی کہہ ڈالی۔

سرمد در دیں عجب شکستی کردی
سرمد! افسوس کہ تو نے دین میں رخنہ پیدا کر دیا
ایمان بفدائے چشم مستی، کردی
اپنا ایمان کسی مست آنکھ والے کے حوالے کر دیا
با عجز و نیاز جملہ نقد خودرا
تیرے پاس جو نقد تھا اسے با عجز و نیاز
گرفتی و نثار بت پرستی کردی
سارا کا سارا بت پرستی پر نثار کر دیا

ٹھٹھہ میں ان کے خلاف جو مہم اٹھی، تو سرمد نے دہلی کی راہ لی۔ دہلی میں پہنچ کر انہوں نے لباس سے بھی نجات حاصل کر لی۔ برہنہ رہنے لگے۔ بس پورے جسم پر ایک لنگوٹی باقی رہ گئی۔ دن رات رباعیات کہتے رہتے۔ انہیں حرص و ہوس سے نفرت تھی اور دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس تھا۔ انہیں دنیا والوں سے ذرا سی امید نہ تھی کیونکہ وہ دنیا کے ہر رشتے کو عارضی اور کمزور سمجھتے تھے۔ دہلی میں ان کا شہرہ ہوا تو جاننے والوں کو اس پر سخت حیرت ہوئی کہ اتنا پڑھا لکھا شخص یوں مخبوط الحواس اور بیکار مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ شاہجہاں کے آخری عہد کی باتیں ہیں۔ جانشینی کے چرچے چاروں طرف گشت کر رہے تھے اور بادشاہ کے ولی عہد کی حیثیت سے دارا شکوہ کا نام لیا جا رہا تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ ایک عالم فاضل اور صوفی منش نوجوان تھا۔ اس نے سرمد کا ذکر سنا تو ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ایک دن دارا شکوہ نے ایک آدمی سرمد کی خدمت میں روانہ کیا اور ملاقات کی اجازت مانگی۔

شہزادے کے نمائندے کو سرمد نے جواب دیا۔ ”شہزادہ جب چاہے ملاقات کر لے اس میں اجازت کی کیا بات تھی۔“

شہزادے کے نمائندے نے کہا۔ ”حضرت! شہزادہ ایک اصولی انسان ہے، وہ آپ کی اجازت اور مرضی کے بغیر نہیں آسکتا۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”تب پھر شہزادے کو میری طرف سے مطلع کر دو کہ وہ جب چاہے چلا آئے۔“

دارا شکوہ اجازت پاتے ہی سرمد کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس نے سرمد کو ایک لنگوٹی میں دیکھا تو بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”حضرت! یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے۔ میں نے آپ کی بابت سن رکھا ہے کہ آپ نہایت پڑھے لکھے انسان ہیں اور علم و فضل میں آپ کا کوئی جواب نہیں۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”اگر عالم فاضل ہوں تو اس پر تمہیں اعتراض ہے؟“

شہزادے نے گھبرا کر عرض کی۔ ”حضرت! اعتراض کی بات نہیں۔ مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ آپ اپنی وضع قطع اور لباس سے اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے کہ آپ بے مثل عالم و فاضل انسان ہیں۔“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں نے قناعت کو اپنا لیا ہے اور حرص و طمع سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے کیونکہ میں نے اہل دنیا کو بہت ہی خوار و زبوں دیکھا ہے۔ میری ایک رباعی سن جو کل ہی موزوں ہوئی ہے۔

سرمد! تو ز ہیچ خلق یاری مطلب
سرمد! خلق سے یاری کی امید نہ رکھ
از شاخ برہنہ ہو وہ سایہ داری مطلب
کیونکہ جو شاخ برہنہ ہو وہ سایہ کیونکر دے گی
عزت ز قناعت است و خواری از طمع
قناعت اختیار کر کہ اس میں عزت ہے اور طمع میں خواری ہے
با عزت خویش باش خواری مطلب
عزت کو بچا اپنے آپ کو خوار نہ کر

دارا شکوہ سرمد سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”کیا آپ میرے پاس رہنا پسند فرمائیں گے؟“

سرمد نے جواب دیا۔ ”میں ایک صوفی منش آوارہ انسان، مجھے محلات کی زندگی راس نہیں آسکتی۔“

دارا شکوہ نے کہا۔ ”مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔“

سرمد نے کہا۔ ”کیسی خدمت، کہاں کی خدمت۔ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔“

داراشکوہ نے پوچھا۔ ''مجھے آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت تو رہے گی؟''
سرمد نے ہنس کر جواب دیا۔ ''بابا! یہ کوئی شاہی دربار تو ہے نہیں، جب چاہو آجاؤ۔ یہ فقیروں کی کٹیا ہے۔''
داراشکوہ نے عرض کیا۔ ''حضرت چند رباعیاں اور سنا دیجیے، ان کے نشے میں مست و سرشار چلا جاؤں گا۔''
سرمد نے کہا۔ ''تو سن۔''

از معصیتم بیش بود فضل ترا
میرے گناہوں سے تیرا فضل کہیں زیادہ ہے
ہر لحظہ بخود حساب دارم ہرجا
میں نے یہ حساب ہر کہیں اور ہر جگہ کرکے دیکھ لیا
ہر چند کہ سرتا بقدم عصیانم
حالانکہ میں سرتاپا گناہ ہی گناہ ہوں
از بخشش تو نیست فزوں جرم مرا
مگر پھر بھی تیری بخشش کے مقابلے میں میرے گناہ کچھ بھی نہیں

داراشکوہ وجد کرنے لگا، جھومنے لگا۔ اس کی حالت ہی غیر ہوگئی۔ بے اختیار بولا۔ ''حضرت کچھ اور کچھ اور......''
سرمد نے دوسری رباعی سنائی۔

انسان کہ شکم سیری از یک نان است
آدمی کا ایک روٹی سے پیٹ بھر جاتا ہے
از حرص وہوا شام وسحر نالان است
اس کے باوجود اس کی حرص وہوا اسے دن رات محو نالاں وفغاں رکھتی ہے
دربحر وجودش بنگر، طوفان است
زندگی کے سمندر میں ایک طوفان بپا ہے
آخر چو حباب یک نفس مہمان است
اور اس میں انسان بلبلے کی طرح ایک سانس کا مہمان ہے

داراشکوہ نے سرمد کی پیشانی کو فرط عقیدت سے چوم لیا اور واپس چلا گیا۔
اورنگ زیب کے آدمی داراشکوہ کے پیچھے لگے ہوئے تھے کیونکہ اورنگ زیب کو داراشکوہ کی ولی عہدی گوارا نہ تھی اور اس نے اپنے باپ شاہجہاں اور اپنے بھائی داراشکوہ کے آس پاس مخبروں اور جاسوسوں کا جال سا پھیلا دیا تھا۔ سرمد اور داراشکوہ کی ملاقات کا حال بڑی رنگ آمیزی سے اورنگ زیب تک پہنچا دیا گیا۔ اورنگ زیب نے ہدایت کی کہ اس معاملے پر کڑی نظر رکھی جائے اور ان دونوں میں جو جو باتیں ہوں انہیں حرف بہ حرف لکھ کر مجھے روانہ کردیا جائے۔
دوسری طرف دہلی کے خواص وعام تھے جو سرمد کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے اور ان بلند پایہ رباعیوں کو لکھ لکھ کر محفوظ کررہے تھے۔
اسی دوران شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب میں معرکہ آرائی ہوگئی۔ اورنگ زیب کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی مراد بھی ہوگیا اور ان دونوں نے مل کر داراشکوہ کو عبرتناک شکست دے دی اور اورنگ زیب نے ہندوستان کے تخت وتاج پر قبضہ کرلیا۔
تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب نے ان لوگوں کی فہرست تیار کرائی جو داراشکوہ کے ہمدرد یا اس کے ساتھ تھے۔ وہ ان سے نمٹنا چاہتا تھا۔ ان میں سرمد کا نام بھی شامل تھا۔ مخبروں نے اورنگ زیب کو یہ خبر بھی دی تھی کہ سرمد داراشکوہ کو بادشاہت کی بشارت دیتے رہے ہیں۔
اورنگ زیب نے سرمد کے قریب رہنے کے لیے چند آدمی متعین کردیے اور انہیں یہ ہدایت کردی کہ وہ سرمد میں ایسی باتیں تلاش کریں جو قابلِ تعزیر ہوں۔
سرمد اپنے حال میں مگن دنیا ومافیہا سے بے خبر تھے۔
ایک دن کسی نے سرمد سے پوچھا۔ ''سرمد! معراج مصطفیٰ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یعنی وہ جسمانی تھی یا روحانی؟''
سرمد نے کہا۔ ''اے شخص! میں تیری نیت سے واقف ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت میں جو کچھ کہوں گا وہ بھی نہ بھی میرے خلاف بطور شہادت استعمال ہوگا۔ مگر سن، میں کسی بات سے نہیں ڈرتا۔ تو معراج کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ میری رباعی سن، میں نے اس میں کھل کر بیان کردیا ہے۔

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد
جس کسی کے پاؤں حقیقت کے راز سے بندھ گئے
او پہن تر از سپہر پہنا شد
اس کی وسعت پا جولا نگاہ آسمانوں سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی
ملّا گوید کہ برفلک شد احمدؐ
ملّا کا کہنا ہے کہ نبی اکرمؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے
سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد
لیکن سرمد کا قول یہ ہے کہ خود آسمان رسولؐ کے قدموں میں آ گیا

اس رباعی سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ درباری علما نے سرمد کو لائق گردن زدنی قرار دے دیا۔

اورنگ زیب نے قاضی القضاۃ ملا قوی کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ سرمد سے ملیں، باتیں کریں اور سزا کے لیے جواز تلاش کریں۔ قوی نہایت قیمتی ریشمی لباس پہن کر سرمد کے پاس پہنچ گیا۔ سرمد حسب دستور برہنہ تھے۔ صرف ایک لنگوٹی سے ستر پوشی کر رکھی تھی۔

قوی نے پوچھا۔ ''سرمد کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟''

سرمد نے جواب دیا۔ ''ہاں پہچانتا ہوں۔ تو میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ مجھ میں ایسی چیزیں تلاش کرے جس سے میں سزا کا مستحق قرار پا جاؤں۔''

قوی نے کھسیا کر کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس ملک کا قاضی القضاۃ ہوں۔ میرا نام ملا قوی ہے، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

سرمد نے کہا۔ ''پوچھ، میں تیری ہر بات کا جواب دوں گا۔''

قوی نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم ایک عالم اور فاضل انسان ہو اس کے باوجود تم برہنہ رہتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟''

سرمد نے جواب دیا۔ ''کیا کروں شیطان قوی ہے۔''

قوی تلملا کر رہ گئے۔ سرمد نے کہا۔ ''ملا قوی! میری رباعی بھی سن لے۔''

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا
ایک سروقد محبوب نے مجھے پست قد ٹھگنا بنا دیا ہے
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
اس کی آنکھ کے دو پیالوں نے مجھے آپے سے باہر کر دیا ہے
او در بغل من است من در طلبش
میرا محبوب میری بغل میں چور کی طرح چھپا بیٹھا ہے اور میں دیوانہ!
دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا
وہ عجیب چور ہے کہ اس کی سراپا لوٹ کے ہاتھوں میں ننگا ہو چکا ہوں

ملا قوی جز بز ہو کر رہ گئے۔ غصہ تو بہت آیا مگر کچھ کر نہ سکے، پوچھا۔ ''سرمد! میں نے سنا ہے تم بھنگ پیتے ہو؟''

سرمد نے جواب دیا۔ ''ہاں پیتا ہوں، پھر تجھے کیا۔ کوئی اعتراض؟''

ملا نے کہا۔ ''ہاں مجھ کو اعتراض ہے کیونکہ بھنگ حرام ہے۔''

سرمد نے ملا کے ریشمی لباس کو بہ غور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تو نے محض سنا ہے کہ میں بھنگ پیتا ہوں مگر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تو ریشم پہنتا ہے حالانکہ بھنگ کی طرح ریشم بھی مردوں کے لیے حرام ہے۔''

ملا قوی ٹپٹا گئے مگر آدمی ذہین تھے، فوراً جواب دیا۔ ''ریشم حرام ہے لیکن تم نے شاید غور نہیں کیا کہ حرام ریشم میں حلال سوت کی آمیزش کر دی گئی ہے جس سے یہ حرام شے حلال ہو گئی ہے۔''

سرمد نے جواب دیا۔ ''پھر تو ہم پر معترض کیوں ہے، میں بھی تو حرام بھنگ میں حلال پانی استعمال کرتا ہوں۔''

قوی نے محسوس کر لیا کہ ان سے پیش پانا مشکل ہے، چپ چاپ واپس چلے آئے اور اورنگ زیب کو مطلع کیا کہ سرمد کو برہنگی کے جرم میں سزا دی جا سکتی ہے۔

اورنگ زیب نے کہا۔ ''سزا کے لیے یہ عذر شرعی ناکافی ہے، کچھ اور ہونا چاہیے۔''

اس دوران یہ خبر عام ہو گئی کہ سرمد مسلمان ہونے کے باوجود پورا کلمہ نہیں پڑھتے صرف لا الٰہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔

اورنگ زیب نے علمائے عصر کی ایک جمعیت کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرمد سے ملے اور اس سے مناظرہ کرے۔
علما تیار ہو گئے۔ یہ لوگ سرمد کے پاس پہنچے اور اس سے باتیں شروع کر دیں۔

ایک عالم نے پوچھا۔ "سرمد! تم برہنہ کیوں رہتے ہو؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "اس کا جواب میں ملا قوی کو دے چکا ہوں اس لیے بار بار اپنے جواب نہیں دہرا سکتا۔"

دوسرے عالم نے پوچھا۔ "رسول مقبولؐ کی معراج کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے یعنی کیا عقیدہ ہے؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "اس کا جواب میں اپنی رباعی میں دے چکا ہوں، اس کو پڑھ لو۔"

ایک عالم اپنی دانست میں دور کی کوڑی لایا، پوچھا۔ "سننے میں آیا ہے کہ تم نے دارا شکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے اسے یہ مژدہ سنایا تھا مگر وہ سلطنت دنیوی نہیں، آخرت کی تھی۔"

کسی دوسرے عالم نے مذکورہ عالم کے کان میں کہا۔ "یہ کیسا سوال کر دیا۔ اس سوال کے جواب پر تعزیری فتویٰ کس طرح دیا جا سکتا ہے۔"

ایک عالم نے سرمد سے کہا۔ "سرمد! ہم علما تمہیں حکم دیتے ہیں کہ بہت دن برہنہ رہ چکے اب لباس پہن لو۔"

سرمد نے جواب دیا۔ "میں جس مقام پر ہوں وہاں علما کا حکم نہیں چلتا۔"

علما عاجز آ گئے۔ انہوں نے اورنگ زیب سے ملاقات کی اور عرض کیا۔ "سرمد ہماری باتوں میں نہیں آتا۔ بس ایک ہی ایسی بات ہے جس پر اسے تعزیزی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔"

اورنگ زیب نے پوچھا۔ "کس بات پر؟"

علما نے یک زبان جواب دیا۔ "برہنگی پر۔"

اورنگ زیب نے بیزاری سے منہ بنایا، کہا۔ "غلط، فضول، محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔"

علمائے نے عرض کیا۔ "سرمد خردمند دیوانہ ہے اس کو باتوں سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔"

اورنگ زیب کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد خوش ہو گیا۔ بولا۔ "میں نے سنا ہے سرمد پورا کلمہ نہیں پڑھتا صرف لا الٰہ کہہ کر رہ جاتا ہے۔"

عالموں نے جواب دیا۔ "اگر ایسا ہے تو یہ بات وجۂ قتل بن سکتی ہے۔"

اورنگ زیب نے کہا۔ "یہ بات ہے، جاؤ اس سے پوچھو۔ اس کے بعد فتویٰ دے دو۔"

علما نے ایک بار پھر سرمد کو گھیر لیا اور کہا۔ "سرمد! ذرا کلمہ تو پڑھنا۔"

سرمد نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں پورا کلمہ نہیں پڑھ سکتا۔"

کسی عالم نے سوال کیا۔ "وہ کیوں؟ آخر کیوں؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ میں حالتِ نفی میں ہوں۔ ابھی مقام اثبات نہیں آیا۔"

دوسرے عالم نے پوچھا۔ "ہم حالتِ نفی اور حالت اثبات کی بات نہیں کر رہے، کلمہ پڑھنے کو کہہ رہے ہیں۔"

سرمد نے کہا۔ "میں بھی اپنی مجبوری بیان کر رہا ہوں۔ میرے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا چونکہ میں مقام نفی میں ہوں اس لیے کلمہ کا اثباتی حصہ اپنی زبان سے نہیں ادا کر سکتا۔"

کسی جوشیلے عالم نے کہا۔ "میں کلمہ پڑھنے کی بات کر رہا ہوں، فضول بحث میں مت الجھا۔"

سرمد نے نصف کلمہ پڑھ دیا۔ "لا الٰہ۔"

عالم نے کہا۔ "آگے۔ اور؟"

سرمد نے پھر کہا۔ "لا الٰہ۔"

عالم نے غصے میں اصرار کیا۔ "آگے اور بقیہ کلمہ کیوں نہیں پڑھتے؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ابھی میں حالت نفی میں ہوں اس لیے میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا۔"

پرجوش عالم نے دھمکی دی۔ "سرمد! اگر تم پورا کلمہ نہیں پڑھو گے تو میں کفر کا فتویٰ دے کر دار پر چڑھوا دوں گا۔ تم پورا کلمہ پڑھو۔"

سرمد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ ابھی تو میں نفی کی لذتوں میں گم ہوں۔ اثبات کا مزہ نہیں جانتا۔ پھر میں پورا کلمہ کس طرح پڑھوں۔"

عالم نے کہا۔ "سرمد! تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ یہ اورنگ زیب کا دورِ حکومت ہے، یہاں فقۂ اسلامی نافذ ہے اور اس سلطنت اسلامیہ میں کسی مسلمان کے منہ سے کلماتِ کفر برداشت نہیں کیے جا سکتے۔"

سرمد نے مسکرا کر ایک شعر پڑھا۔

کشورے ہست کہ وردے رو داز کفر سخن
ہر جا گفت و شنو بر سر ایماں زردو

(ایک سلطنت ایسی بھی ہے جہاں پر صرف اور صرف کفر موضوع سخن ہے۔ (اے سادہ لوح لوگو!) ہر جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں ایمان پر ہی گفت و شنید ہوتی ہے)

کسی عالم نے اتمام حجت کے طور پر سوال کیا۔ "سرمد! پورا کلمہ پڑھتے ہو یا نہیں؟"

سرمد نے جواب دیا۔ "تم لوگ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو جس لیے آئے ہو اسے کر گزرو۔ میں اپنا کام کر چکا۔ لا الہ۔"

خرقہ پوشاں ہمہ گر مست گزشتہ گزشت
قصۂ پاست کہ در کوچہ و بازار بماند

(خرقہ پوش یعنی لباس فاخرہ پہن کر اینٹھتے ہوئے چلنے والے چلے جاتے ہیں۔ ہم ننگ دھڑنگ لوگوں کے قصے کوچہ و بازار میں رہ جاتے ہیں۔ جنہیں لوگ دُہراتے رہتے ہیں)

علما کا کام آسان ہو چکا تھا۔ انہوں نے بلا تامل قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ سرمد کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس کام میں عجلت اختیار کی گئی۔ گرفتاری کے بعد سرمد کو قتل گاہ کی طرف لے جانے لگے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی، لوگوں نے ہر طرف سے ہجوم کر دیا تھا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں چلنا دشوار ہو گیا تھا لیکن سرمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

مقتل میں جلاد شمشیر برہنہ لیے تیار کھڑا تھا۔ تلوار کی چمک سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ سرمد نے مسکراتے ہوئے جلاد سے آنکھ ملائی اور ایک خاص ادا سے کہا۔ "فدائے تو شدم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شاسم" (میں تیرے قربان جاؤں۔ آ جا، بس آ جا تو کسی بھیس میں بھی آئے، میں تجھے ہر رنگ میں خوب پہچان سکتا ہوں)

جلاد نے سرمد کو ابھی سر رکھنے کا حکم بھی نہ دیا تھا کہ سرمد نے ایک شعر پڑھا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

(ایک شور اٹھا تو ہم نے ہمیشگی کی نیند سے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ ہمیں صرف اتنا دکھائی دیا کہ فتنہ بھری رات ابھی باقی ہے لہٰذا ہم پھر سو گئے)

جلاد کے ایک بھرپور وار نے سرمد کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس عالم میں لوگوں نے سنا سرمد کے کٹے ہوئے تن سے تین بار لا الہٰ الا اللہ کی آواز بلند ہوئی۔

حاضرین حیران و ششدر رہ گئے۔ جلاد خوفزدہ ہو گیا۔ علما کا کام ختم ہو چکا تھا۔

کاشان کا رہنے والا نو مسلم سعید سرمد دیار غیر میں فتنوں بھری رات سے بیزار ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ اس کی آخری آرام گاہ جامع مسجد کے گرد و نواح میں ہے۔ کہتے ہیں چاروں فصلوں میں یہاں سرسبز گھاس رہتی ہے اور لوگ اس کے مزار کی زیارت کر کے عجیب سی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔

بر سر تربت من چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

(اے دوست! (اگر کبھی) تو میری قبر پر سے گزرے تو (صرف) یہ دعا مانگنا کہ مٹی کا یہ ڈھیر دنیا بھر کے بادہ خواروں کی زیارت گاہ بن جائے)

چنانچہ آج بھی مشہد سرمد زیارت گاہ خاص و عام ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے لیے اٹھنے والے ہاتھ رو بہ آسمان رہتے ہیں۔

آنا نکہ غم تو برگزیدہ ند ہمہ،
در کوئے شہادت آرمید ند ہمہ
در موکہ دو کون فتح از عشق است
با آنکہ سپاہ او شہید ند ہمہ

(وہ جنہوں نے تیرا غم سارے کا سارا اختیار کر لیا۔ آخر کار شہادت کے کوچے میں انتہائی سکون کی نیند جا سوئے۔ دونوں جہانوں کے معرکے میں انجام کار فتح عشق ہی کو حاصل ہوتی ہے حالانکہ لشکر عشق سارے کا سارا کھیت رہا)

سید عبداللہ ولی علیہ الرحمۃ اللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

یوں تو ہر شخص اپنی زندگی اپنے لیے جیلیتا ہے لیکن... اوروں کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دینا یقینا بڑے لوگوں کی عظمتوں کی دلیل ہے اور یہی اعلیٰ ظرفی انہیں مختلف دشوار گزار مراحل کے ذریعے انسانیت کی معراج پر فائز کر دیتی ہے۔ آپ کا تعلق بھی انہی مقبول بندوں میں سے تھا جنہیں اللہ پاک نے ولی کا درجہ دیا۔

[illegible]



اکبر آباد کے قریب بارہہ کے نواح میں کیتھری نامی قصبے کے لوگ زیادہ تر ادھر اُدھر سے آکر بس گئے تھے اور اسے اپنا وطن بنالیا تھا۔ ان نو آبادوں میں ایک سید گھرانا بھی تھا۔ یہاں آنے کے بعد ان لوگوں نے بڑی ترقی کی۔ اور ان میں سے بعض کا امراء میں شمار ہونے لگا۔ ان کی نسلیں پھلنے پھولنے لگیں۔ مغل دور حکومت تھا، یہ سید خاندان مغلیہ سرکار میں ایک معزز مقام رکھتا تھا۔ اسی خانوادے میں دو میاں بیوی ایسے بھی تھے جنہیں اولاد کی بڑی تمنا تھی مگر یہ پوری نہ ہوتی تھی، وجب دونوں ادھیڑ عمر میں داخل ہو گئے

اور اولاد کی خواہش مایوسی میں بدلنے لگی تو ایک دن اچانک بیوی نے یہ خوش خبری سنائی کہ اللہ نے ان کی سن لی اور وہ دن دور نہیں جب ان کے گھر میں ایک تیسرا وجود بھی کلکاریاں مارنے لگے گا۔

شوہر اپنی بیوی کا یوں بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ لیکن اب اور زیادہ توجہ رہنے لگی۔ دونوں میاں بیوی اپنے رب سے یہی دعا کرتے رہتے کہ ”لڑکی یا لڑکا، صالح پیدا فرما۔ اے میرے رب ایسی اولاد نہ دے جو شرمندگی کا باعث بن جائے، اولاد ہماری بہت بڑی خواہش ہے۔ لیکن وہ اولاد نہیں جو خود شناسی اور خدا شناسی سے محروم ہو۔“

مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد گھر کی چار دیواری میں نومولود کے رونے کی آواز سنائی دی اور والدین کو یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ نومولود لڑکا ہے۔ خاندان والے بھی بہت خوش ہوئے اور مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بچے میں کچھ غیر معمولی باتیں ایسی تھیں جنہیں ہر کوئی محسوس کر سکتا تھا۔ آواز میں بلا کی کشش تھی، وہ روتا تو سننے والوں کا یہی جی چاہتا کہ بس آواز سنتے رہیں۔

بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا اور سید عبداللہ کے نام سے مخاطب کیا جانے لگا۔ نیک اور متقی باپ نے بیٹے کو دینی تعلیم دلوانا چاہی مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی چار ساڑھے چار سال کے تھے کہ ماں اور باپ دونوں ہی یکے بعد دیگرے چل بسے۔ چچا اور چچا زاد بھائی موجود تھے۔ چچا نے ان کی کفالت کی ذمے داری قبول کی۔ لیکن سید عبداللہ نے ان کے رویے اور سلوک میں معلوم نہیں کیا محسوس کیا کہ ترک وطن کا ارادہ کر لیا چند سال چچا کے ساتھ رہ کر خدا طلبی میں نکل کھڑے ہوئے۔ اولیائے کرام کا ذکر سنتے رہتے تھے۔ اب ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور ان کی تلاش میں راہ نوردی شروع کر دی۔ ایک بچہ، جس کا شعور پوری طرح بیدار نہ ہوا ہو، جس کو اپنے ہی قصبے کے راستوں کا علم نہ ہو، جو یہ نہ جانتا ہو کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا۔ وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا۔

سواری میسر نہ تھی۔ ایک قافلے میں پیدل ہی شامل ہو گئے، یہ قافلہ مشرقی پنجاب جا رہا تھا۔ قافلے والوں نے ایک بچے کو یوں ہم سفر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اس قافلے میں فوجی، تاجر، اہل حرفہ، اہل کسب، ہنرمند، کاریگر بھی تھے، ایک تاجر کو سید عبداللہ پر بہت رحم آیا۔ اپنے گھوڑے سے اترا اور سید عبداللہ سے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! تم کس کے ساتھ ہو؟“

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کسی کے بھی ساتھ نہیں۔“

تاجر نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ کیا تنہا ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں تنہا بھی نہیں، میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔“

تاجر کھسیا کر کہنے لگا۔ ”میاں صاحبزادے! تم میرا مطلب نہیں سمجھے اس قافلے میں تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟“

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اس قافلے میں میرے اللہ کے علاوہ پورا قافلہ شریک سفر ہے۔“

بچے کے جوابات سے تاجر کو یہ اندازہ تو ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔ تاجر کی دلچسپی بڑھی اور اس نے بچے سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جائے۔

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ”آپ کی پیش کش کا شکریہ! لیکن میں اپنی طلب صادق کو زیر بار احسان نہیں کرنا چاہتا۔“

تاجر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ باتوں سے یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بچہ مخاطب ہے۔

اس گفتگو میں قافلہ آگے نکل چکا تھا اور یہ دونوں پیچھے رہ گئے تھے گرد و غبار قافلے کو نظروں سے اوجھل کیے دے رہا تھا۔ تاجر نے عاجزی سے کہا۔ ”صاحبزادے! میں آپ کا دل سے معترف اور عقیدت مند ہوں مجھے خدمت کا موقع دیجیے۔ اور یہ سمجھیے کہ مجھے اللہ نے آپ ہی کی خدمت کے لیے اس قافلے میں بھیجا ہے، اگر آپ میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جائیں گے، تو میں آپ پر کوئی احسان نہیں کروں گا بلکہ آپ مجھ پر احسان فرمائیں گے۔“

سید عبداللہ نے قافلے کی طرف دیکھا، وہ گرد و غبار میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس عالم میں انہوں نے کسی بزرگ کی آواز سنی جو انہیں بلا رہا تھا۔ ”سید عبداللہ! دیر نہ کر، تاجر کی بات مان لے میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

سید عبداللہ نے تاجر سے پوچھا۔ ”میرے کرم فرما! آپ کوئی آواز سن رہے ہیں؟“

تاجر نے سکوت اختیار کیا اور آواز سننے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”میاں صاحبزادے! مجھے تو کوئی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی ہے۔“

سید عبداللہ نے کہا۔ ”پنجاب کے کسی جنگل سے مجھے بلایا جا رہا ہے، وہاں کوئی شخص میرا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہاری پیش کش قبول کر لوں۔“

تاجر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے سید عبداللہ کو اپنے گھوڑے پر آگے بٹھالیا اور گھوڑے کو ایڑ جو لگائی تو وہ آناً فاناً قافلے سے جا ملا۔ تاجر سید عبداللہ کی ذات کو غنیمت سمجھ رہا تھا۔ یہ ذات بابرکات تھی۔ کئی دن سفر کرنے کے بعد سید عبداللہ نے مراقبہ کیا اور اللہ سے رجوع کیا، پوچھا۔ "اے رب العالمین! تو خوب واقف ہے کہ میں کیا ہوں اور میری کیا حیثیت ہے۔ میں نے جس چیز کی ہمت کی ہے وہ میرے سن اور شعور سے بہت بڑی ہے۔ مجھے کہاں اور کس کے پاس جانا ہے، میں نہیں جانتا، میری راہنمائی تیرے ذمے ہے، میں اپنی آنکھیں بند کیے بھاگا چلا جا رہا ہوں اب تو ہی بتائے گا کہ مجھے کہاں رکنا ہے اور کس کی صحبت اختیار کرنا ہے۔"

تاجر نے آپ کو مراقبے میں جو دیکھا تو اور زیادہ سکتے میں رہ گیا۔ جب سید عبداللہ نے مراقبہ ختم کیا تو تاجر نے کہا۔

"صاحبزادے! آپ کی ذات میرے لیے باعث برکت ہے، آپ خود پسند فرمائیں تو آپ کو زندگی بھر اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہوں۔"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں نے جس شے کی تلاش میں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو چھوڑ دیا۔ ان کے بعد کسی اور کو قبول کر کے اپنی طلب سے کس طرح منہ موڑ سکتا ہوں۔ بہرحال تمہاری پیش کش کا میں شکر گزار ہوں۔"

تاجر نے حاجری سے پوچھا۔ "تب پھر آپ یہ بتائیں کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟ تاکہ میں آپ کو وہاں تک پہنچانے کی سعادت حاصل کرسکوں۔"

آپ نے سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ کہاں جانا ہے، میں خود ابھی تک لاعلم ہوں۔"

یہ قافلہ چند دنوں بعد ایک خطرناک گھنے جنگل سے گزرنے لگا۔ قافلے والوں کا ڈر سے برا حال تھا۔ وہ نہایت سوچ سمجھ کر بااحتیاط اس جنگل کو عبور کرنے کی فکر میں تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جنگلی درندوں کے بولنے اور دہاڑنے کی آواز سے پورا جنگل گونج اٹھتا تھا۔ قافلے کا ہر شخص خوفزدہ اور پریشان تھا لیکن سید عبداللہ پر خوف یا پریشانی کا ذرا سا بھی اثر نہ تھا۔ تاجر نے پوچھا۔ "میاں صاحبزادے! میں جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ آخر آپ پر اس جنگل کی خوفناکی اور خطرناکی کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "مجھے اس کا یقین ہے کہ اگر میری زندگی کا خاتمہ کسی درندے کی خوراک بن جانے کی شکل میں ہوگا تو مجھے اپنے اس انجام سے کوئی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اگر میری زندگی باقی ہے تو کوئی درندہ مجھے ہلاک نہیں کرسکتا۔ بس یہی اندازِ فکر مجھے بے خوف رکھے ہوئے ہے۔"

رات کو قافلے والوں نے جس جگہ قیام کیا، اس کے چاروں طرف آگ جلا دی۔ اس کی روشنی دور دور تک پھیل گئی۔ قافلے والوں نے جنگلی جانوروں کے سائے متحرک دیکھے۔

سید عبداللہ ان سب سے الگ تھلگ ہو کر اپنے آنے والے دنوں کی بابت سوچنے لگے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کسی نے سرگوشی میں کہا۔ "سید عبداللہ، قافلے کو جانے دے، تو اس سے الگ ہو جا۔ جانوروں کی پروا کیے بغیر تو شمال کی طرف چلتا رہ۔ آگے تجھے ایک مسجد ملے گی۔ تیری پہلی منزل یہی مسجد ہے۔ وہیں رک جا اور جو بتایا جائے اس پر عمل کر۔"

سید عبداللہ نے اسی وقت قافلے سے علیحدگی اختیار کرلی اور شمال کی طرف چل پڑے۔ درندوں کی بھیانک آوازیں پورے جنگل کو لرزا رہی تھیں تاجر نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا اور ان کے پیچھے دوڑا۔ "میاں صاحبزادے! تم کہاں چل دیے؟ کچھ تو سوچو، ادھر نہ جاؤ، ورنہ جنگلی درندے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔"

لیکن سید عبداللہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ برابر چلتے رہے۔ تاجر نے کچھ دور تک ان کا پیچھا کیا، اس کے بعد خوف نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ رک گیا، قافلے کے دوسرے لوگ بھی حیرت زدہ تھے۔ تاجر سے کہنے لگے۔ "یہ لڑکا اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے شاید...... ورنہ رات کی تاریکی میں تن تنہا ادھر نہ جاتا جہاں ہلاکت اس کا انتظار کررہی ہوگی۔"

تاجر کی نظریں سید عبداللہ کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔ "لوگو! تم نے اس حیرت انگیز بچے کو سمجھا ہی نہیں۔ ہلاکت...... کیسی ہلاکت؟ یہ ایک غیر معمولی بچہ ہے۔ جنگلی درندے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، مجھے یقین ہے کہ درندے اس کی حفاظت کریں گے۔"

سید عبداللہ آگ کی روشنی سے بھی آگے نکل گئے...... اور ان کے چاروں طرف تاریکی کی چادر بچھ گئی۔ جھاڑیاں ان کو روکنے لگیں لیکن یہ چلتے رہے۔ ایک درخت کی جڑ میں کالا ریچھ بیٹھا تھا۔ رات کی تاریکی نے اس کے وجود کو چھپا دیا تھا۔ آپ اس کے پاس سے گزرے تو ریچھ کی بھیانک آواز سنائی دی۔ سید عبداللہ اس کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ ریچھ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

کچھ دور آگے ایک بھیڑیے نے آپ پر جست لگائی۔ مگر ریچھ نے جوابی حملہ کر کے بھیڑیے کو ہلاک کر دیا۔ آپ کا سفر جاری رہا۔

سید عبداللہ نے رات کے پچھلے پہر درختوں کے بیچ میں روشنی کی جھلک دیکھی۔ یہ اس روشنی کی طرف بڑھے اور کچھ دیر بعد جب سید روشنی کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک مسجد کے سامنے کھڑے ہیں۔ گھنے جنگل میں مسجد ایک عجیب حیرت انگیز بات تھی۔ سید عبداللہ نے مسجد میں داخل ہو کر حجرے کا در کھٹکھٹایا تو اندر سے جواب ملا۔ "سید عبداللہ دروازہ کھلا ہے، اندر آجاؤ۔"

سید عبداللہ نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ سید عبداللہ کو جھرجھری آ گئی تھی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، اندر داخل ہوئے تو وہاں ایک سن رسیدہ بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کی پلکیں تک سفید ہو چکی تھیں۔ گھنی بھوؤں کے نیچے بڑی آنکھیں جنہیں جھریوں نے محصور کر رکھا تھا، اوپر اٹھیں اور سید عبداللہ سے کہا۔

"صاحبزادے! بیٹھ جاؤ۔"

سید عبداللہ ان کے پاس ہی ادب سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ بیٹے! یاد رکھو جس نے اللہ کی طلب میں قدم اٹھایا اللہ اس کا نگہبان اور راہ نما ہو گیا۔ تو میرے پاس آیا ہے یہ سوچ کر کہ میں تجھے کچھ دوں گا، تیری راہبری کروں گا لیکن میرے ذمے یہ کام نہیں ہیں۔ تربیت اور تلقین وہدایت ایک دوسرے ہی بزرگ کے ذمے ہے۔ تجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑے گا لیکن جانے سے پہلے میں اپنے حصے کا کام ضرور انجام دوں گا۔"

سید عبداللہ نے سہم کر پوچھا۔ "آپ کے ذمے کیا کام ہے؟"

بزرگ نے جواب دیا۔ "میں تمہیں قرآن پاک حفظ کراؤں گا، گوشہ نشینی اور ترک دنیا کے آداب سکھاؤں گا۔ نفس اور شیطان کی کج رویوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے انداز بتاؤں گا۔"

سید عبداللہ نے فرط جذبات میں بزرگ کے ہاتھ پکڑ لیے۔ انہیں ہونٹوں سے لگا کر بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اس دربار سے مجھے جو کچھ بھی مل جائے گا میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔"

بزرگ نے اس تھکے ہوئے بچے کو آرام کی تلقین کی اور سلا دیا۔ لیکن سید عبداللہ کی خوشی اور شوق کا یہ عالم تھا کہ بڑی مشکل سے نیند آئی۔ ان بزرگ کی شخصیت اتنی شدت سے ذہن ودماغ پر طاری ہو چکی تھی کہ وہی عالم رویا میں بھی موجود رہی۔

☆☆☆

صبح فجر کی نماز ان بزرگ کے ساتھ پڑھنے کے بعد سید عبداللہ نے قرآن پاک کو حفظ کرنے کا آغاز کر دیا۔ ان بزرگ کو سید عبداللہ کی آواز بہت پسند آئی فرمایا۔ "سید عبداللہ! تیری آواز میں جو درد اور سوز ہے وہ فرشتوں تک کو بے خود کر دے گا۔ خدا اسے برقرار رکھے اور نظر بد سے محفوظ کرے۔"

ان بزرگ نے کچھ ہی عرصہ بعد قرآن حفظ کرا دیا اور ترک دنیا کے آداب سکھا دیے۔

کافی دنوں بعد ان بزرگ نے کہا۔ "سید عبداللہ! آؤ آج ہم دونوں ایک ساتھ قرآن پاک کا ورد کریں۔ پھر دیکھنا کیسا سماں بندھ جائے گا۔"

سید عبداللہ نے کہا۔ "حضرت! مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے!"

یہ صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ان بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور قرآن پاک کا ورد شروع کر دیا۔ سید عبداللہ نے ان کا ساتھ دیا۔ دونوں کی آواز کے سوز نے ماحول میں آگ سی لگا دی اور پرندے وجد میں آکر مسجد کی دیواروں پر بیٹھ گئے۔ دونوں کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہیں اور زمانہ کس حال میں ہے۔

اتنے میں سید عبداللہ نے دیکھا کہ عربی لباس میں ملبوس لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور وہ صحن مسجد میں جمع ہونے لگے۔ اتنے میں ایک خوبصورت اور وجیہہ شخص بھی آ گیا۔ یہ شخص اپنی وضع قطع اور انداز واطوار سے آنے والوں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ کھڑا ہو کر کچھ دیر تو سنتا رہا۔ اس کے بعد کہا۔ "بارک اللہ ادیت حق القرآن" (اللہ برکت دے، تلاوت قرآن کا حق تو نے خوب ادا کیا ہے) اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

کچھ دیر بعد جب تلاوت ختم ہو گئی تو ان بزرگ نے سید عبداللہ سے پوچھا۔ "سید عبداللہ! ابھی یہاں کوئی آیا تھا؟"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں انہیں نہیں پہچانتا۔ لیکن وہ سب اپنے لباس سے عربی نظر آتے تھے۔"

بزرگ نے کہا۔ "صاحبزادے! اس وقت میری آنکھیں بند تھیں اور میں انہیں نہیں دیکھ سکا۔ لیکن تو یقین کر کہ اس وقت میں اتنا زیادہ ہیبت زدہ تھا کہ اگر آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنا چاہتا تو یہ کام ناممکن ہوتا۔"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ ''حضرت! ایسا کہ میں نے عرض کیا وہ سب عرب معلوم ہوتے تھے۔''
ان دونوں میں یہ باتیں جاری تھیں کہ مسجد میں ایک عرب داخل ہوا اور ان دونوں سے کہا۔ ''حضرات! کل رسول مقبول ﷺ اپنے اصحاب میں بیٹھے ہوئے اس جنگل کے حافظ کی تعریف و توصیف فرما رہے تھے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ کل ہم سب علی الصباح اسے دیکھنے جائیں گے اور اس کی قرأت بھی سنیں گے۔''
دونوں اس شخص کی باتیں سنتے رہے۔ عرب نے پوچھا۔ ''صاحبان کیا آپ ﷺ تشریف لائے تھے؟''
انہوں نے کہا۔ ''کیا وہ رسول مقبول ﷺ اور ان کے ساتھی تھے؟''
عرب نے جواب دیا۔ ''ہاں۔''
اب ان دونوں کو اس کا ہوش کہاں تھا کہ وہاں بیٹھے رہتے۔ دونوں اٹھ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بڑی دیر تک ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کر انہیں تلاش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ اس جدوجہد میں ایک بات واضح طور پر ان دونوں کو محسوس ہوتی رہی۔ پورا جنگل خوشبو سے معطر تھا۔ ہر طرف سے خوشبو کے فوارے سے چھوٹ رہے تھے۔ ہر طرف سے ناکام ہو کر جب واپس ہوئے تو سید عبداللہ کے استاد کے دل میں یہ خیال آیا کہ آخر عرب یہ کون تھا جس نے انہیں یہ اطلاع دی تھی۔ اب وہ عرب بھی غائب تھا۔ ان دونوں نے اس کو بھی تلاش کیا لیکن ناکام رہے۔
اس واقعے کے عرصہ بعد تک جنگل خوشبو سے مہکتا رہا اور اس جنگل سے جو بھی گزرا اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔
☆☆☆
حفظ قرآن کے کچھ عرصہ بعد ان بزرگ نے سید عبداللہ سے کہا۔ ''صاحبزادے! میرا کام ختم ہوا، اب تم جاسکتے ہو۔''
سید عبداللہ کو جدائی کے خیال سے دکھ پہنچا۔ پوچھا۔ ''اب میں کہاں جاؤں.....؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کہاں جاؤ، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرا کام ختم ہوا اور خدا تمہیں کسی صاحب ولایت کی خدمت میں ضرور پہنچا دے گا۔''
سید عبداللہ نے بہ چشم پرنم استاد کو جنگل ہی میں چھوڑا۔ اور خود مشرق کا رخ کیا۔ یہ گھومتے پھرتے سامانہ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں شیخ ادریس سامانی کا بڑا چرچا تھا اور طالبان حق دور دور سے ان کی خدمت میں پہنچا کرتے تھے۔ جن دنوں سید عبداللہ سامانہ میں داخل ہوئے، شیخ ادریس سامانی نے مکمل طور پر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کردیا تھا۔
سید عبداللہ ان کے در پر پہنچے اور اندر پیغام پہنچا دیا کہ ''ایک بے نوا زیارت کو حاضر ہوا ہے، باریابی کی اجازت دی جائے ورنہ میں اسی در پر پڑا رہوں گا۔''
شیخ ادریس نے جواب میں کہلوا دیا۔ ''میں نے عرصہ گزرا دنیا کو چھوڑ دیا۔ اب دنیا والوں سے کیا ملوں؟''
سید عبداللہ نے جواباً کہلوایا۔ ''حضرت! میں بھی دنیا کو چھوڑ چکا، بس زیارت کر کے چلا جاؤں گا۔''
شیخ نے اس ضدی کو اندر بلوا لیا۔ دیکھتے ہی کہا۔ ''زیارت کرلی اب واپس جاؤ۔''
سید عبداللہ نے عرض کیا۔ ''حضرت! سیری نہیں ہوئی، کچھ دیر اور.....''
شیخ نے فرمایا۔ ''جانتے بھی ہو سیری کسے کہتے ہیں۔ یہ وہ شے ہے کہ اسے پوری زندگی حاصل نہ کرسکو گے، اور جب اس دنیا سے جاؤ گے تو تشنگیوں کا ذخیرہ تمہارے ساتھ ہوگا۔''
سید عبداللہ رونے لگے، بولے۔ ''حضرت! مجھے جدا نہ کیجئے، میں آپ کے قدموں سے کہیں بھی نہ جاؤں گا۔''
شیخ مسکرا دیے، فرمایا۔ ''زیارت کرنے آیا تھا کہ اس در پر پڑے رہنے کی ٹھان لی۔ میاں ہم جیسوں کی کوئی کمی نہیں، بہت مل جائیں گے کہیں بھی چلے جاؤ۔''
سید عبداللہ نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن میں اس درویش کو چھوڑ کر کہیں بھی نہ جاؤں گا۔''
شیخ نے فرمایا۔ ''جانتے ہو میرے پاس کون رہ سکتا ہے؟''
سید عبداللہ نے عرض کیا۔ ''پتا نہیں، لیکن میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''یہاں ایک مردہ ہی رہ سکتا ہے، کسی زندہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''
سید عبداللہ نے کہا۔ ''حضرت! اگر اس کی وضاحت ہوجائے تو میں جواب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں۔''
شیخ نے فرمایا۔ ''وہ شخص جو طعام، لباس اور تعلقات دنیوی سے بالکل کٹ چکا ہو اور حوائج ضروریہ کے بغیر میرے دروازے

سے باہر قدم نہ رکھے میرے لیے مردہ ہے۔"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں ایک عرصہ سے مذکورہ چیزوں سے بے نیاز ہو چکا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کچھ فرمائیں گے اس پر عمل کروں گا۔ آپ مجھے مردہ تصور فرمائیں۔"

شیخ نے کچھ تامل کے بعد فیصلہ فرمایا۔ "اچھا اگر یہ بات ہے تو تم میرے پاس رہ جاؤ۔"

سید عبداللہ، شیخ ادریس یمانی کے پاس رہ گئے اور راہِ سلوک طے کرنے لگے۔

اس دوران سید عبداللہ شیخ ادریس کے لڑکے کو قرآن حفظ کرانے لگے۔ جب شیخ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں بڑی خوشی ہوئی اور اس کے نتیجے میں انہوں نے سید عبداللہ پر دوگنی توجہ مبذول کر دی۔

سید عبداللہ نے جب شیخ کی توجہ بہت زیادہ دیکھی تو وہ شیخ اور ان کے متعلقین کے کپڑے دریا پر لے جانے لگے اور انہیں دھو لاتے۔ یہ کام عموماً جمعرات کو انجام دیتے۔ سید عبداللہ مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

ایک بار وہ فاقے سے تھے۔ جمعرات جو آئی تو کپڑوں کی لادی لے کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ بھوک سے بہت برا حال تھا اوپر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد پیاس نے بھی۔ شدت اختیار کی۔ انہوں نے بھوک اور پیاس کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا انہیں اپنے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا معدہ روٹی کا مطالبہ کر رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اندر کوئی معدے کو کھرچ ڈال رہا ہے، پیاس کی شدت نے آنکھوں تلے اندھیرا سا پھیلا دیا اس وقت ان کے ہاتھ میں شیخ کی قمیص تھی۔ انہوں نے قمیص کے میل کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی۔ مگر چکر آ گیا اور وہ گر گئے اور بے ہوشی نے غلبہ کر لیا۔ وہ معلوم نہیں کتنی دیر تک بے ہوش پڑے رہے جب آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے چہرے پر ایک نقاب پوش کو جھکا ہوا دیکھا گھبرا کر پوچھا۔ "تم کون ہو...؟"

نقاب پوش نے پوچھا۔ "یہ تیرا کیا حال ہو گیا؟"

سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "اگر تم کوئی صاحب کمال شخص ہو، تو مجھے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر تم کوئی دنیادار ہو تو میں کچھ بتا کر خدا کا شکوہ نہیں کرنا چاہتا۔"

نقاب پوش نے کہا۔ "سید عبداللہ! کیا تو نے قرآن پاک میں یہ نہیں پڑھا۔ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو) جب بھوک اور پیاس غلبہ کر رہے تھے تو تمہیں ان کی فکر پہلے کرنا تھی۔ بعد میں کوئی دوسرا کام کرتے۔"

سید عبداللہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل میں رب سے کہا۔ "الٰہ العالمین! میں نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے لیکن جس طرح یہ مجھ سے مخاطب ہے اس سے میں اس کشمکش میں ہوں کہ کہیں یہ شیطان نہ ہو جو میرے نفس کو ورغلا کر ہلاکت میں ڈال رہا ہو۔"

نقاب پوش نے پوچھا۔ "کیا سوچنے لگے؟"

سید عبداللہ نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔ "اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم مجھ پر مہربان کیوں ہو؟"

نقاب پوش نے اپنے لباس کے اندر سے روٹی نکال کر ان کی طرف بڑھا دی اور کہا۔ "سید عبداللہ! شک کو اپنے دل سے نکال دو میں شیطان نہیں ہوں، یہ روٹی کھا لو۔"

اب سید عبداللہ کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص شیطان ہرگز نہیں۔ اس سے روٹی لے لی اور کھانے لگے۔ جب روٹی ختم ہو گئی تو سید عبداللہ نے دل میں سوچا کہ اس گرمی میں اگر کہیں سے ٹھنڈا پانی بھی میسر آ جائے تو خوب رہتا ہے، ابھی سید عبداللہ سوچ ہی رہے تھے کہ نقاب پوش نے نقاب کے اندر سے پانی کا پیالہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا، کہا۔ "لے، یہ ٹھنڈا پانی بھی پی لے۔"

سید عبداللہ نے پیالہ لے لیا اور جب اس کو ہونٹوں سے لگایا تو دل خوش ہو گیا۔ کیونکہ وہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

کچھ دیر بعد نقاب پوش نے کہا۔ "سید عبداللہ! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ بلاوجہ اپنی جان کو کبھی ہلاکت میں نہ ڈالنا۔ اس سے اللہ خوش نہیں ہوتا۔"

سید عبداللہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد نقاب پوش چلا گیا اور سید عبداللہ کپڑے دھو کر اپنے شیخ کے پاس چلے گئے۔ شیخ نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "سید عبداللہ! آج تم نے خضر علیہ السلام سے روٹی لے کر کھائی اور ٹھنڈا پانی بھی پی لیا۔"

سید عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔ "تو وہ خواجہ خضر علیہ السلام تھے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں وہ خواجہ خضر علیہ السلام تھے۔ ان کی روٹی کھائی اور پانی پی لیا۔ لیکن تو محمدی ہے اور محمدیوں کو خضر علیہ السلام کا احسان نہیں لینا چاہیے۔"

سید عبداللہ نے سوچا میں نے روٹی اور پانی سے بھوک پیاس بجھا کر سخت غلطی کی ہے۔ شیخ سے کہا۔
"حضرت! میں اپنی غلطی پر نادم ہوں، کفارے میں جو کرنا ہے فرما دیں میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔"
شیخ نے متبسم ہو کر جواب دیا۔ "میں غلطی کب کہہ رہا ہوں۔ اس کے کفارے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ مریدوں کو خضر علیہ السلام کا احسان نہیں لینا چاہیے۔"
سید عبداللہ نے کہا۔ "پیرومرشد! آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔"
اس طرح ایک جمعرات کو جب سید عبداللہ دریا پر سے کپڑے دھو کر لائے تو گھر میں کہرام برپا تھا۔ شیخ ادریس کا کہیں پتا نہ تھا۔ اور ہر شخص ان کی تلاش میں ہراساں اور سرگرداں تھا۔ یہ خبر سید عبداللہ نے سنی تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر والوں سے پوچھا۔ "کیا اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟"
گھر والوں نے متفقہ طور پر جواب دیا۔ "نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوا۔"
اب سید عبداللہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے۔ شیخ کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک ہفتہ بعد بے نیل ومرام واپس آ گئے۔ اور شرمندگی سے عرض کیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کہاں تلاش کروں؟"
گھر والوں نے جواب دیا۔ "اب تلاش فضول ہے وہ جس طرح غائب ہوئے ہیں، اسی طرح انہیں آ بھی جانا چاہیے۔"
بات ختم ہو گئی۔ مگر شیخ کا کہیں پتا نہ تھا۔
ایک دن گھاس کے گودام سے گھاس کا ذخیرہ کم کیا جانے لگا۔ تو اس میں سے شیخ ادریس بھی برآمد ہو گئے۔ ملازم نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ملازم کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے پانی کا چھینٹا منہ پر مارا اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ آخر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ملازم سے کمزور آواز میں دریافت کیا۔
"کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟"
ملازم نے اپنی پیشانی کو انگلیوں میں لے کر سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "حضرت! میں معلوم نہیں کب سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ تمام گھر والوں کا بھی یہی حال ہے۔ اب آپ تو گھاس کے ذخیرے میں سے نکال کر میں پریشان ہو رہا ہوں کہ جب آپ اپنے کنبے والوں سے یہ فرمائیں گے کہ آپ کو گائے بھینس کے بھوسے والے ذخیرے سے نکالا گیا ہے تو وہ سب میری جان کو آ جائیں گے۔"
آپ نے فرمایا۔ "میں خاموش رہوں گا تو بھی چپ رہ۔"
سید عبداللہ نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔ "حضرت! یہ قصہ کیا ہے؟ آخر اتنے دنوں تک آپ رہے کہاں؟ کچھ مجھے بھی تو بتایئے۔"
آپ نے فرمایا۔ "بات زیادہ بڑی نہیں ہے۔ چھ ماہ پہلے میں گھاس کے ذخیرے میں کسی کام سے گیا تھا۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ تک نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ اسی عالم میں ایک شخص گھاس کی گٹھری لے کر گودام میں داخل ہوا۔ اور مجھ کو دیکھے بغیر مجھ پر گھاس ڈال کر چلا گیا۔ لیکن خدا نے مجھ پر مہربانی کی کہ اس وقت مجھ پر مدہوشی کا دورہ پڑ گیا اور میں مراقبے میں چلا گیا۔ اور اب ہوش میں آیا۔"
شیخ نے جو کچھ فرمایا۔ سید عبداللہ کے علاوہ اس پر کسی کو بھی یقین نہ آیا۔
سید عبداللہ نے رو رو کر ان کے کپڑے جھاڑے اور بڑی عاجزی سے ان کا جسم دبانے لگے۔
شیخ نے سید عبداللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "مت پریشان ہو سید عبداللہ۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ اس میں کسی انسان کا بس نہیں چلتا۔"
ان کی شفقت نے سید عبداللہ کی بے قراری دور کر دی اور حالت میں اعتدال پیدا ہو گیا۔

☆☆☆

چاشت کے بعد شیخ نے قلم دوات اور کاغذ طلب کیا۔ سید عبداللہ کو بڑی حیرت ہوئی یہ کیا معاملہ ہے۔ لیکن پیرومرشد سے پوچھ نہیں سکتے تھے۔
شیخ ادریس نے کاغذ پر کچھ لکھنا شروع کر دیا اور کبھی کبھی سید عبداللہ پر ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈال دیتے۔ آخر کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ "سید! تیرا حال کیا ہے؟ تجھے کس فکر نے پریشان کر رکھا ہے؟"

سید عبداللہ نے عرض کی۔ ''حضرت! کیا عرض کروں، کچھ کہتا ہوں تو آپ فرمائیں گے کہ یہ جستجو کیسی؟''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آ، میرے پاس آجا۔''
سید عبداللہ اپنے پیر و مرشد کے پاس جا بیٹھے۔ شیخ نے فرمایا۔ ''سید! میں اس عہد کے ایک بہت بڑے ولی کو خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ چکنے کے بعد تجھے پڑھوا دوں گا۔ پریشان نہ ہو۔''
سید عبداللہ نے اپنے دل میں سوچا کہ کیا اس عہد میں شیخ اور یسیؒ سے بڑا ولی بھی موجود ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے؟
شیخ نے فرمایا۔ ''سید! مت پریشان ہو۔ میں اس ولی سے تجھ کو بھی ملوا دوں گا۔''
اس کے بعد وہ پھر خط لکھنے لگے۔ پھر وہ خط سید عبداللہؒ کی طرف بڑھا دیا۔ فرمایا۔ ''سید لے، اسے پڑھ لے۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس کو تجھ سے چھپایا جائے۔''
سید عبداللہ نے بڑی بے تابی سے خط لے لیا اور پڑھنے لگے اس میں لکھا تھا۔
''میرے آقا! ولیوں کے سردار حضرت آدم بنوریؒ! ان دنوں میرا عجیب حال ہے۔ مجھ کو ہر چیز میں ایک خدا نظر آتا ہے اور در و دیوار کو اس ایک نور کی تجلیات سے بھرپور پاتا ہوں۔ اگر میں زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو زمین کو نہیں پاتا۔ اور اگر آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوں تو اس کو معدوم پاتا ہوں۔ اس طرح عرش و کرسی، بہشت اور دوزخ بھی موجود نہیں پاتا۔ اگر میں کسی کے سامنے جاتا ہوں تو اس کا وجود بھی نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ اب میں اپنے وجود کو بھی موجود نہیں پاتا۔ اور وجود حق سبحانہ تعالیٰ مجھے بے پایاں نظر آتا ہے۔ اس کی حد اور انتہا کو میں نہیں پا سکا۔ تمام مشائخ بھی بس یہی نکتہ کہہ کر رہ گئے ہیں اور اس مقام سے آگے نہیں جا سکے۔ اگر آپ بھی اسی انتہا کو اپنا کمال سمجھتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی دوسری بات اس کمال سے بلند معلوم ہوتی ہے تو اس سے ہمیں بھی مطلع فرمایئے، تاکہ ہم اور ہمارے ایک ایسے دوست جو اس مقام تک پہنچنے کی بڑی خواہش رکھتے ہیں۔ وہاں تک پہنچ سکیں۔''
خط پڑھ چکنے کے بعد سید عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے پیر و مرشد کی طرف دیکھا۔ آپ ان کا مطلب سمجھ گئے، فرمایا۔
''میں جانتا ہوں، تو مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے! تو یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا آدم بنوریؒ اتنے پائے کے ولی ہیں جو میں ایک شاگرد کی طرح ان سے رجوع ہو رہا ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم سب اس اعلیٰ کے سامنے ادنیٰ ہیں۔ وہ علم کا آفتاب ہیں، ہم سب ذرے۔'' اس کے بعد کچھ توقف اختیار کیا اور کہا۔ ''اور دوسری بات تو یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں نے اپنے خط کی آخری سطروں میں جس دوست کا ذکر کیا ہے وہ کون ہے؟ تو سن لے میرا وہ دوست تو خود ہے۔''
سید عبداللہ نے شرمندگی سے کہا۔ ''میں آپ کا دوست نہیں ادنیٰ مرید ہوں، دوست کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔''
شیخ نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، بولے۔ ''شاید تو یہ بھی سوچ رہا ہے کہ جب اس خط کا جواب آجائے تو تجھے بھی دکھا دیا جائے تو اس کا جواب پڑھنے کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔''
سید عبداللہ نے کہا۔ ''آپ بجا فرما رہے ہیں یہی فکریں اور یہی وسوسے مجھے پریشان کر رہے ہیں۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''سید! تو فکر نہ کر، تیری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی سلوک کیا جائے گا۔ تو میرا مرید بھی ہے اور میرا دوست بھی۔''
اس دن سید عبداللہؒ کو جو خوشی محسوس ہوئی تھی وہ زندگی بھر پھر کبھی نہیں مل سکی۔
یہ خط آدم بنوریؒ کو بھیج دیا گیا اس کے جواب کا دونوں ہی کو انتظار تھا۔ لیکن شیخ اور یسیؒ سے زیادہ سید عبداللہؒ کو انتظار تھا۔
کچھ عرصہ بعد جب آدم بنوریؒ کا جواب آ گیا تو شیخ نے جواب پڑھ کر سید عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ اس میں لکھا تھا۔
''شیخ سامانی! آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ برکت اور عجیب ہے۔ لیکن اگر کاملین سلوک کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی! کسی کوچۂ تنگ سے گزرنے کا سوال نہیں۔ راہ سلوک میں اتنے سست کر رہ گئے ہو۔ یہاں تو ایک شاہراہ عظیم کھلی ہوئی ہے جس پر توسن فکر و خیال کو بڑھا چڑھا کر دوڑایا جا سکتا ہے۔''
سید عبداللہ خط پڑھ رہے تھے اور شیخ ان کی حالت پر غور کر رہے تھے۔ آخر میں پوچھا۔ ''سید! کیا حال ہے؟ اب کیا کہتے ہو؟''
سید عبداللہ نے کہا۔ ''حضرت! یہ تو بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔''
''آپ نے فرمایا۔ ''کیا خیال ہے؟ کیا تمہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے؟''
سید عبداللہ نے عرض کیا۔ ''میں آپ کا در چھوڑ کر کہیں اور جانے کو تیار نہیں۔''

شیخ نے فرمایا۔ "لیکن تمہیں ان کے پاس جانا پڑے گا۔"
سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "اگر آپ جبر فرمائیں گے اور مجھ کو اپنے پاس سے دور ہی فرمادیں گے تو میں چلا جاؤں گا۔"
شیخ نے فرمایا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے، میں تم کو زبردستی نہیں بھیجوں گا تم نفسی خوشی اور اپنی مرضی سے ان کے پاس چلے جاؤ گے۔"
سید عبداللہ نے دبی زبان میں کہا۔ "ممکن ہے ایسا ہو جائے میں آپ کو جھٹلا نہیں سکتا۔"
شیخ نے فرمایا۔ "بہرحال میں خود بھی اس ولی کامل سے ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں، خدا پورا فرمادے۔"
سید عبداللہ نے سکوت اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی رائے نہیں دی۔
چند دنوں بعد شیخ ادریسؒ کی طبیعت بگڑنے لگی اور وہ اپنی صحت سے مایوس نظر آنے لگے۔ سید عبداللہ اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ اپنے شیخ کے ساتھ آدم بنوریؒ کی خدمت میں حاضری دیتے۔ ایک دن شیخ سامانی نے سید عبداللہ کو اپنے سامنے بٹھالیا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ ان کی آواز میں نقاہت پائی جاتی تھی۔ دوران گفتگو شیخ نے فرمایا۔ "کیوں سید! آدم بنوریؒ کی بابت تم کیا سوچ رہے ہو؟"
سید عبداللہ نے کہا۔ "میں اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت اور درازی عمر کی دعائیں مانگ رہا ہوں تاکہ میں آپ کے ہمراہ آدم بنوریؒ کی زیارت کرسکوں۔"
شیخ نے فرمایا۔ "یہ کوئی ایسی خواہش تو نہیں کہ اگر میں موجود ہوں تو پوری ہو۔ تم اکیلے بھی ان کے پاس جاسکتے ہو۔"
سید عبداللہ رونے لگے۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ شیخ نے ان کے سر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا اور کہا۔ "ارے! یہ تم رو کیوں رہے ہو؟"
سید عبداللہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ نے اکیلے جانے کی بات کی تو میں نے اس کا یہ نتیجہ نکالا کہ اب آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ آپ کی صحبت غنیمت ہے۔"
شیخ نے تبسم فرمایا۔ بولے۔ "اس دنیا میں سدا کون رہا ہے، جو میں رہوں گا۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔" پھر فرمایا۔ "جب تم اکیلے رہ جاؤ تو اپنا ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آدم بنوریؒ کی صحبت میں پہنچ جانا، وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ ان سے تمہیں بہت فیض پہنچے گا۔"
اس کے چند دنوں بعد شیخ ادریسؒ نے وصال فرمایا اور سید عبداللہ تجہیز کے بعد آدم بنوریؒ کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔
در پر کھڑے ہوکر انہوں نے صدا لگائی۔ "حضور والا۔ شیخ سامانیؒ کا فرستادہ سید عبداللہ حاضر ہے، باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"
اندر سے جواب ملا۔ "آجاؤ، وہاں کیوں کھڑے ہو۔"
سید عبداللہ اجازت پاتے ہی اندر چلے گئے۔ آدم بنوریؒ نے انہیں سینے سے لگالیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں ایک دم ایسا لگا گویا ان کا سب کچھ چھن گیا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ خالی خالی سینہ اذیتیں پہنچانے لگا۔ سید عبداللہ کو اپنی تہی دستی پر رونا آگیا۔ شکایتاً کہا۔ "حضرت میں تو آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ مجھے جو کچھ مل چکا ہے اس میں کچھ اضافہ کروں لیکن یہاں تو جو کچھ تھا وہ بھی چھن گیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں، حضرت! یہ کیا ہوگیا؟"
آدم بنوریؒ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "سید! میرے ہاتھ ایک بوتل آگئی میں اس بوتل کو کام میں لانا چاہتا تھا۔ اور اس میں عرق گلاب رکھنا چاہتا تھا۔ مگر بوتل کو سونگھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں سرکہ رکھا تھا چنانچہ میرے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ پہلے اس سرکے کے اثر کو زائل کروں اس کے بعد اس میں گلاب کا عرق بھروں۔ میرے لیے تو تیری مثال بوتل جیسی ہے، جب تک تیرے سینے کو خالی نہ کردیا جاتا تو مجھ سے فیض نہیں پاسکتا تھا۔"
سید عبداللہ مطمئن ہوگئے اور آہستہ آہستہ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کا خالی سینہ بھرتا جارہا پھر جیسے وہ لبالب ہوگیا۔ اب ان میں آسودگی سی آگئی تھی۔
سید عبداللہ کو قرأت کا بڑا شوق تھا جب بھی موقع ملتا وہ قرأت میں مدہوش ہوجاتے۔ ایک دن وہ کسی ایسے درخت کے سائے میں بیٹھ کر قرأت فرمارہے تھے جہاں پر بے شمار چڑیاں ہر وقت چوں چوں کرتی رہتی تھیں۔ سید عبداللہ نے آنکھیں بند کرلیں اور دنیا ومافیہا سے غافل ہوکر قرأت فرمانے لگے۔ پرندوں پر اس قرأت کا اتنا اثر ہوا کہ وہ درخت پر سے بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگے۔ سید عبداللہ کو کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ قرأت میں گم رہے۔ کسی نے آدم بنوریؒ کو اس صورت حال کی خبر کی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے

اور سید عبداللہ کی قرأت میں گم ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ "سید! ہوش میں آؤ، یہ کیا کر رہے ہو؟"
سید عبداللہ اب بھی ہوش میں نہیں آئے۔ آخر آدم بنوری نے حکما کہا۔ "حافظ! اب بس بھی کرو، ہوش میں آؤ۔"
سید عبداللہ نے آنکھیں کھول دیں اور انکساری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے سامنے بے ہوش چڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔
آدم بنوری نے پوچھا۔ "سید! یہ تم نے کیا کیا؟"
سید نے جواب دیا۔ "میں نے کیا کیا؟ مجھے ہوش ہی نہیں، آپ کے سوال کا میں کیا جواب دوں؟"
آدم بنوری نے نصیحت کی۔ "سید! احتیاط سے کام لو۔"
سید عبداللہ چپ ہو گئے اور اس کے بعد واقعی احتیاط کرتے رہے۔
سید عبداللہ، آدم بنوری کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی خدمت اپنے ذمے لیں۔ اس دربار میں جو بھی تھا اس نے کوئی نہ کوئی ذمے داری قبول کر رکھی تھی۔ ناگاہ ان کی نظر اس شخص پر پڑی جو جنگل سے لکڑیاں لایا کرتا تھا۔ یہ ایک انتہائی لاغر اور کمزور شخص تھا۔ سید عبداللہ نے اس سے کہا۔ "اے بھائی! میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری صحت اس لائق نہیں کہ جنگل سے لکڑیاں لانے کا فرض ادا کر سکو۔ اس لیے یہ کام میرے سپرد کر دو۔ میں پیر و مرشد کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ تمہارا کام میں کر رہا ہوں۔"
اس شخص نے جواب دیا۔ "بہتر ہے، اس طرح میں چند دن آرام کر لوں گا۔"
اب انہوں نے جنگل سے لکڑیاں لانا شروع کر دیں۔ کچھ عرصہ بعد۔ آدم بنوری دریا پر غسل کرنے گئے۔ چند مریدوں نے جسم کی صفائی ستھرائی شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا۔ "سید عبداللہ کو بلاؤ۔"
سید عبداللہ کو ان کے پاس پہنچا دیا گیا۔ مرشد نے کہا۔ "سید! تم میرا جسم صاف کرو۔"
سید عبداللہ نے اس انہماک اور محنت سے یہ کام کیا کہ آدم بنوری بہت خوش ہوئے۔ سید عبداللہ سے فرمایا۔ "سید! تیرے انہماک اور محنت نے میرا دل جیت لیا ہے۔ ذرا میری طرف تو دیکھو!"
سید عبداللہ نے جیسے ہی ان کی طرف دیکھا بے ہوش ہو گئے۔ آدم بنوری کی نظروں میں معلوم نہیں کیا تھا جس کی وہ تاب نہیں لا سکے۔ سید عبداللہ مردے کی طرح دیر تک پڑے رہے آخر آدم بنوری کے حکم پر ان کے مریدوں نے انہیں اٹھایا اور پیر و مرشد کے گھر تک پہنچا دیا۔ دیر بعد جب ہوش میں آئے تو ان کا سینہ معرفت روحانی سے مالا مال ہو چکا تھا۔
چھ ماہ بعد وہی صورت پیش آئی۔ شیخ آدم بنوری دریا کے کنارے غسل فرما رہے تھے اور سید عبداللہ ان کا جسم مل رہے تھے۔
شیخ آدم بنوری نے اچانک سید عبداللہ پر نظر ڈالی اور پوچھا۔ "سید! کیا بات ہے؟ تم کچھ بولتے نہیں، خیریت تو ہے!"
پرسش احوال سے سید عبداللہ کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا، جیسے دل میں ایک شعلہ سا چمکا اور پوری کائنات پر جلوہ فگن ہو گیا انہیں کچھ ہوش ہی نہ رہا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔
شیخ نے تبسم ہو کر مریدوں کو حکم دیا۔ "اس کو میرے حجرے تک پہنچا دیا جائے۔"
مریدوں نے حکم کی تعمیل کی اور سید عبداللہ کو حجرے تک پہنچا دیا۔ دیر بعد جب انہیں ہوش آیا تو دیکھا شیخ بنوری ان کے پاس بیٹھے انہماک سے دیکھ رہے ہیں۔ شیخ نے پوچھا۔ "سید! کیا حال ہے۔"
سید عبداللہ نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "پیر و مرشد کیا عرض کروں اب میں خود کچھ محسوس کرنے لگا ہوں اور میرا سینہ معرفت کا گنجینہ بنتا جا رہا ہے۔"
شیخ نے فرمایا۔ "سید! اب تو آزاد ہے، میری صحبت میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔"
سید عبداللہ نے عرض کیا۔ "حضرت! میں آزادی نہیں چاہتا، میں اس در کو نہیں چھوڑ سکتا۔"
شیخ آدم نے کہا۔ "سید میں اپنے کنبے کے ساتھ حج کرنے جا رہا ہوں۔"
سید عبداللہ نے کہا۔ "تب پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے جائیے۔"
شیخ نے سختی سے منع کر دیا۔ "نہیں! تم نہیں جاؤ گے۔"
سید عبداللہ نے کہا۔ "حضرت! مجھ پر تو کوئی ذمے داری بھی نہیں۔ میں نے...... شادی تک نہیں کی، میں تو آپ کے ساتھ بہ آسانی سفر حج کر سکتا ہوں۔"
لیکن شیخ نے سختی سے جواب دیا۔ "سید! اس میں ایک مصلحت ہے جس کا بعد میں تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔ افسوس کہ میں تمہیں نہیں لے جاؤں گا۔"

شیخ آدم بنوری سفر پر روانہ ہو گئے اور سید عبداللہ کو ساتھ نہیں لیا۔ ان کی عدم موجودگی میں ایک لڑکے عبدالرحیم کی تعلیم و تربیت سید عبداللہ کے سپرد تھی۔ بعد میں یہ لڑکا شاہ عبدالرحیم کہلایا۔ اور یہ بہت بڑے فرزند کا باپ کہلایا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اس مصلحت نے سید عبداللہ کو حج سے باز رکھا تھا۔ کیونکہ اگر وہ اپنے پیر و مرشد کے ساتھ چلے جاتے تو شاہ عبدالرحیم کی تعلیم تربیت کے اعزاز سے محروم رہ جاتے۔

☆☆☆

شیخ آدم بنوری حج کرنے چلے گئے تو سید عبداللہ نے کامل آزادی سے اپنا منصب سنبھالا۔ اب ان کے پاس لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ ان کا شہرہ اور چرچا بادشاہ، امراء اور دوسرے بڑوں تک پہنچنے لگا۔

کسی نے آپ سے کہا۔ ”حضرت! میں نے ایک مجذوب کو دیکھا ہے جو بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرتا رہتا ہے۔ وہ عورتوں اور مردوں کی پروا کیے بغیر ننگا بھاگتا پھرتا ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اس کو کسی نے منع نہیں کیا۔ کہ وہ ایسا نہ کرے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”منع کیا کیوں نہیں، لیکن وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔“

آپ نے کہا۔ ”اچھا اب پھر تم مجھ کو وہاں لے چلو۔ میں اس کو منع کروں گا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”تو پھر اس میں دیر کیوں آپ اسی وقت چلیے میرے ساتھ۔“

آپ جانے کے لیے تیار ہو گئے اور اس شخص کو ساتھ لیا اور پیدل ہی چل پڑے۔ گلیوں کوچوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے وہ شہر کے ایک نہایت گنجان علاقے میں پہنچے اور وہاں لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ ایک جگہ جمع دیکھا۔ اس شخص نے اس ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیے اس جگہ موجود ہو گا وہ مجذوب ننگ دھڑنگ۔“

آپ نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اچھا اب تو یہیں ٹھہر ارہ، میں اس سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔“

سید عبداللہ اس مجذوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ مجمع کو چیرتے پھاڑتے مجذوب کے پاس پہنچے تو اس نے آپ کو دیکھتے ہی دیوانہ وار بھاگنا شروع کر دیا۔

سید عبداللہ نے اس کو آواز دی۔ ”ارے بھائی! کہاں جاتا ہے، میری بات تو سن لے۔“

لیکن وہ نہیں رکا اور مسلسل بھاگتا رہا۔ سید عبداللہ بھی اس کا پیچھا کرتے رہے۔ مجذوب شہر سے باہر نکل گیا۔ وہاں ایک درخت کے نیچے ایک بڑی بی لکڑیاں جمع کرنے میں مشغول تھیں۔ مجذوب نے بڑی بی کا دوپٹا چھین لیا اور اس کو اپنے جسم کے گرد باندھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں سید عبداللہ بھی وہیں پہنچ گئے اور مجذوب سے پوچھا۔ ”ارے بھائی! تم بھاگ کیوں رہے تھے؟“

مجذوب سے سر جھکا لیا، بولا۔ ”سید! تم نے میرا پیچھا کر کے ہلکان کر ڈالا۔“

سید عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن تم بھاگے کیوں تھے؟ مجھ سے خوفزدہ کیوں تھے؟“

مجذوب نے جواب دیا۔ ”میں بھاگا ہی اس لیے تھا کہ کسی انسان کے سامنے برہنہ پھرنا کسی طرح مناسب یا جائز نہیں، تمہاری شکل میں ایک انسان میرے سامنے آ گیا تھا۔“

سید عبداللہ نے فرمایا۔ ”مجذوب! میں کہتا ہوں ہوش میں رہ! انسانوں میں انسان بن کے رہ، اگر وہ تجھے جانور نظر آتے ہیں مگر یہ جانور تو ایک دوسرے کو انسان ہی کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر ان کے سامنے برہنہ پھرنا کہاں کی انسانیت ہے؟“

مجذوب نے بڑی حسرت سے آپ کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔ ”آپ کہتے ہیں تو میں کپڑے پہن لوں گا۔ ورنہ جی تو نہیں چاہتا۔“

اس کے بعد اس مجذوب نے کپڑے پہننا شروع کر دیے۔

☆☆☆

اب سید عبداللہ کے در پر ہجوم رہنے لگا۔ ان میں سبھی شامل تھے۔ غربا بھی امراء بھی، درباری بھی سرکاری بھی اور عامی بازاری بھی۔ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے، جو سید عبداللہ سے کشف و کرامات کے متمنی ہوئے۔ آپ انہیں اس خواہش سے باز رکھنے کی کوشش کرتے اور فرماتے۔ ”لوگو! تم اہل اللہ سے کشف و کرامات کا مطالبہ مت کرو بلکہ یہ دیکھو کہ ان میں استقامت کتنی ہے۔“

کسی جاہل نے عرض کیا۔ ”حضرت! ہم آپ کے پاس اسی لیے آئے تھے کہ کشف و کرامات کا مشاہدہ کریں۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو ہم یہاں اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔“

آپ کو جوش آ گیا۔ غصے میں فرمایا۔ ”کفش بر سر کشف و کرامات کے سر پر جوتے۔ تو نکل جا اس محفل سے، صوفیاء کے نزدیک

Scanned with CamScanner

استقامت معتبر ہے۔ اگر استقامت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے کشف و کرامت کے طالبوں کو نکال باہر کیا اور ان کا اپنی محفل میں آنا ممنوع قرار دے دیا۔

آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر روز اِدھر اُدھر نکل جاتے اور کمزوروں ضعیفوں اور بیماروں کے کام آتے۔ ان کی خدمتیں کرتے اور انہیں یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ ایسا کر کے وہ کوئی احسان کر رہے ہیں۔ شہر کے گلی کوچوں میں سید کے تذکرے گونجنے لگے۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے یہ خبریں بادشاہ اور شہزادگان تک پہنچانا شروع کر دیں۔ یہ شاہجہاں کا دورِ حکومت تھا اور ملک دارا شکوہ ولی عہد سمجھا جاتا تھا۔

دارا شکوہ کو جب سید عبداللہؒ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس نے ان کے آس پاس جاسوسوں اور مخبروں کے پہرے بٹھا دیے اور انہیں حکم دیا کہ جب بھی مشتبہ بات دکھائی دے ــــ تو وہ شہزادہ دارا شکوہ کو ضرور معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بعد شہزادہ دارا شکوہ ذرا مطمئن ہو گیا۔ لوگوں نے آپ کو بتایا کہ شہزادہ دارا شکوہ کا دل آپ کی طرف سے صاف نہیں ہے اس لیے آپ اس سے ہوشیار رہیں۔

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس سے کیا ہوشیار رہوں، ہوشیار تو اس کو ہم فقیروں سے رہنا چاہیے۔"

ایک دردمند، ارادت مند بولا۔ "حضرت! ہم جانتے ہیں۔ کہ شہزادہ یا بادشاہ آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن اس کے باوجود اگر آپ ان سے ہوشیار اور چوکس رہیں تو کیا حرج ہے۔"

آپ نے بے پروائی سے فرمایا۔ "چوکس میں کیا رہوں، میرے پاس ہے ہی کیا جو وہ چھین لے گا۔ ہاں اس کے پاس جو کچھ ہے اگر وہ چھن گیا تو شہزادہ کہیں کا بھی نہ رہے گا۔ اس لیے چوکس رہے یا نہ رہے تو وہ رہے ہیں۔ میں اس کی پروا کیوں کروں۔"

چند دنوں بعد فجر کے بعد سید عبداللہؒ کی خدمت میں نو قاری حاضر ہوئے اور ان سے بحثیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "جناب سید! ہم نے یہ سنا ہے کہ آپ کو قرأت بہت اچھی آتی ہے۔ آج ہم سب یہی دیکھنے آئے ہیں۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔"

آپ نے پوچھا۔ "تم لوگ میرا امتحان کس کی ہدایت یا حکم پر لے رہے ہو، میرا خیال ہے اس میں شہزادہ دارا شکوہ پیش پیش ہے، یہ وہی ڈور ہلا رہا ہے۔ مجھے اس سے نمٹنا آتا ہے۔ خوب اچھی طرح نمٹنا آتا ہے، دوستو! پروا نہ کرو۔"

آپ نے ان قاریوں کے روبرو قرأت شروع کر دی اور نو قاری پورے انہماک سے سننے لگے۔ انہیں ایک بات بھی ایسی نہیں ملی جو قابلِ گرفت ہوتی۔ انہوں نے دارا شکوہ کو مطلع کیا کہ عبداللہؒ جیسا قاری شاید روئے زمین پر نہ مل سکے۔

شہزادے نے آپ سے کہلا بھیجا۔ "حضرت! میں آپ کا مداح اور قدردان ہوں، ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے اور اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔"

آپ نے شہزادے کو کوئی جواب نہ دیا لیکن دل میں گرہ پڑ چکی تھی۔

دارا شکوہ مطمئن ہو شاہجہاں شک و شبے میں پڑ گیا۔ دربار کے بڑے بڑے لوگ سید عبداللہؒ سے حسد کرتے تھے۔ اور ان کے زوال کے خواہاں رہتے تھے۔ ان میں ایسوں کی تعداد حد و شمار سے باہر تھی جو سید عبداللہؒ کے بدخواہ تھے اور بادشاہ کو بھی گمراہ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

ایک دن شاہجہاں نے اپنے وزیر سعد اللہ خان اور عالم دین ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو حکم دیا۔ "دونوں سید عبداللہ کے پاس جائیں اور ان سے ادق مسائل پر بات شروع کر دیں۔ اگر یہ دنیادار ہے تو کوئی عالم دین اس کا پردہ بآسانی چاک کر دے گا۔"

چنانچہ چند دنوں بعد سعد اللہ خان وزیر اور عالم دین ملا عبدالحکیم سیالکوٹی آپ کے پاس پہنچے اور حاضری کی اجازت چاہی۔ آپ نے ان دونوں کو حجرے کے اندر بلوا لیا۔ اس وقت آپ مراقبے میں تھے، دونوں حضرات ان کے روبرو ادب سے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ "ہاں بھائی اب بتاؤ کہ یاروں کے پاس کس لیے آنا ہو گیا۔"

سعد اللہ خان وزیر کا خیال تھا کہ سید عبداللہؒ ان دونوں کی تعظیم بجا لائیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تو وزیر چراغ پا ہو گیا بولا۔ "جناب والا! میں تو اہلِ دنیا ہوں مشائخ کے نزدیک تعظیم کا مستحق نہیں ٹھہرتا لیکن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تو عالم دین ہیں، ان کی تعظیم ضروری ہے۔"

سید عبداللہؒ نے فرمایا۔ "سعد اللہ خان! زیادہ برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی عالم دین ہیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث تو ضرور پڑھی ہو گی۔ علماء محافظ دین ہیں جب تک کہ بادشاہوں سے دور رہیں۔ جب سلاطین کی بارگاہوں تک جا پہنچیں تو وہ علماء نہیں چور ہیں۔

دونوں کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ وزیر نے پوچھا۔ "آپ کا نسب کیا ہے؟"
سید عبداللہ نے جواب دیا۔ "سید ہوں لیکن ہماری مائیں افغان قبائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے عوام کی زبان پر افغان مشہور ہو گئے۔"
وزیر نے کہا۔ "میں نے سنا ہے آپ علم لدنی رکھتے ہیں۔"
انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں اور اس پر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا رہتا ہوں۔"
اس کے بعد دونوں آپ کے پاس سے چلے آئے اور شاہجہاں کو مطلع کیا۔ "سید عبداللہ ایک عامی اور متکبر فقیر ہے، یہ بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے اس کی اصل افغان ہے لیکن سید کہلاتا ہے۔ اگر اس کو چھیڑا گیا تو فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس لیے اس کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائے نہایت سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔"
شاہجہاں بگڑ گیا اور اس نے اسی وقت اپنے قاصد کے ذریعے حکم روانہ کیا کہ "آپ حج کرنے چلے جائیں۔"
قاصد کا خیال تھا کہ آپ اتنی آسانی سے یہ حکم نہیں مانیں گے لیکن وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ آپ نے اسی وقت سے سفر کی تیاری شروع کر دی۔
کسی ارادت مند نے عرض کیا۔ "آپ اتنی جلدی حج کرنے کیوں جا رہے ہیں؟ بادشاہ کے حکم کو ٹال دیجیے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "میں اس لیے جا رہا ہوں کہ کہیں بادشاہ اپنا یہ حکم واپس نہ لے لے۔ میری عدم موجودگی میں تم دیکھو گے کہ بادشاہ میری واپسی کا حکم صادر کرے گا اور میرے چلے جانے سے وہ بہت پریشان ہو جائے گا۔"
ارادت مند کی سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ گئیں۔
آپ نے سفر کی تیاریاں کیں اور سورت بندرگاہ پہنچ گئے، وہاں کا حاکم آپ کا بے حد معتقد اور ارادت مند تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ "مجھ کو یہاں سے جلد از جلد چلا جانے دے۔"
حاکم سورت نے آپ کو اسی وقت جہاز پر سوار کرا دیا۔ جہاز جیسے ہی ساحل سے آگے بڑھا۔ بادشاہ کا دوسرا فرمان حاکم سورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس میں لکھا تھا۔
"حاکم سورت کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک درویش سید عبداللہ نامی بغرض سفر حج وہاں پہنچا ہوگا۔ درویش کو روک لیا جائے اور ہمارے پاس واپس بھیج دیا جائے۔ ہم سے اس درویش کی شان میں چند گستاخیاں ہو گئی ہیں۔ پہلے میں اس کے بارے میں سوء ظنی کا شکار تھا۔ لیکن اب میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے کوئی خبردار کر رہا ہے کہ اس کو مت ناراض کرو۔ کیونکہ یہ صاحب ولایت ہے اور تیری حکومت کو کسی اور کے حوالے کر دے گا۔"
"مکرر تاکید کہ اس درویش کو فوراً ہمارے پاس روانہ کر دو۔"
لیکن درویش تو سورت سے روانہ ہو چکا تھا۔ اور وہ جہاز میں لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ "اب شاہجہاں اس لائق نہیں رہ گیا کہ بادشاہ رہے۔ میں نے اس کے ولی عہد کو بھی ہٹا دیا۔ اب اس کی جگہ وہ حکومت کرے گا جس کے دل میں اسلام اور اسلام کے پرستاروں کا درد ہوگا۔"
سید عبداللہ یہ فرما رہے تھے اور ہندوستان میں گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ شاہجہاں اور دارا شکوہ ایک طرف تھے اور دوسری طرف اورنگ زیب اور مراد بخش تھے، اس کشمکش میں شاہجہاں سے حکومت چھن گئی اور وہ قید کر دیا گیا۔ حکومت اورنگ زیب کو منتقل ہو گئی، کچھ عرصہ بعد دارا شکوہ قتل کر دیا گیا۔

☆☆☆

حج سے واپس آئے تو شاہجہاں کی جگہ اورنگ زیب حکومت کر رہا تھا آپ اکبر آباد میں مقیم ہوئے۔ واپسی پر صحت نے جواب دے دیا اور سید عبداللہ بیمار رہنے لگے۔ مریدوں اور ارادت مندوں نے بڑی کوشش کی کہ صحت یاب ہو جائیں لیکن آپ نے فرمایا کہ "یہ میرا آخری وقت ہے۔"
مریدوں نے روتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ کہیے، خدا آپ کو بہت زیادہ عمر دے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "بہت زیادہ عمر دے یا کم دے، انجام دونوں ہی صورتوں میں موت ہے، پھر کم زیادہ کی خواہش کیوں کی جائے۔"
حالت جب زیادہ خراب ہو گئی تو آپ نے مریدوں سے فرمایا۔ "لوگو، مجھے مسکینوں کے قبرستان میں دفن کرنا تاکہ میں پہچانا نہ جاؤں۔"

چنانچہ جب آپ وصال فرما گئے تو انہیں حسب خواہش اس طرح دفن کیا گیا کہ بعد میں لوگوں کو آپ کی قبر تک یاد نہ رہی۔ ایک مرید نے قبر کے محل وقوع کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا اور دل میں فیصلہ کیا کہ جب کوئی ارادت منداس سے آپ کی قبر کا اتا پتا پوچھے گا تو، پہنچا دیا کرے گا۔

ان دنوں شاہ عبدالرحیمؒ (شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد) سخت بیمار تھے اور بیماری اور کمزوری کی وجہ سے جنازے میں شریک نہیں ہوسکتے تھے، جب اللہ نے انہیں صحت یاب کیا تو اس مرید کا سہارا لیا جس نے سید عبداللہ کی قبر کو اس کے محل وقوع کے ساتھ ذہن نشین رکھا تھا۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ "کیا تجھے پیرومرشد کی قبر کا تہ پتا معلوم ہے؟"

مرید نے جواب دیا۔ "ہاں! مجھے معلوم ہے اور میں آپ کو ان کی قبر تک پہنچا سکتا ہوں۔"

شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا۔ "تب پھر میرے ساتھ چلو۔"

وہ مرید انہیں اپنے ساتھ لے کر قبرستان چلا گیا۔ وہ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا لیکن قبر کی شناخت نہ کرسکا۔

شاہ عبدالرحیمؒ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، وہ قبر مل کیوں نہیں رہی؟"

مرید نے جواب دیا۔ "اس کے سوا کیا عرض کروں کہ اس میں بھی سید کی کرامت کا دخل ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے مسکینوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے، تا کہ لوگ میری قبر تک نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ میں پہچان اور شناخت کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کے باوجود ان کی قبر تک نہیں پہنچ پا رہا۔"

شاہ عبدالرحیمؒ بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ سید عبداللہ کی قبر تک پہنچ کر رہیں گے۔

انہوں نے اپنے رہنما سے کہا۔ "بھائی! ذرا توجہ سے قبر تلاش کرو، بہت زیادہ دنوں کی بات تو نہیں۔"

مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! میں کوشش کررہا ہوں آپ بھی دعا فرمائیں کہ خدا میری مشکل حل کردے۔"

شاہ عبدالرحیمؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے زیر لب کہنے لگے۔

"پیرومرشد! میں آپ کی آخری رسوم میں بدرجہ مجبوری شریک نہ ہوسکا تھا۔ اب آیا ہوں تو آپ کی آخری آرام گاہ نہیں مل رہی۔ کیا میں واپس مایوس جاؤں؟"

ایک طرف سے مرید نے آواز دی۔ "حضرت! یہ رہی وہ قبر ادھر آجایئے۔"

شاہ عبدالرحیمؒ خوش خوش اس قبر کے پاس بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے۔

ابھی وہ قرآن پاک پڑھ ہی رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"شاہ عبدالرحیم! میری یہ قبر نہیں۔ میری قبر تمہاری پشت پر ہے۔ تلاوت جاری رکھو اور اس کا ثواب بھی اس کو پہنچاؤ جس کے پاس بیٹھے تلاوت کررہے ہو۔"

شاہ عبدالرحیمؒ نے مرید سے پوچھا۔ "تم نے کوئی آواز سنی؟"

مرید نے جواب دیا۔ "نہیں تو....."

شاہ عبدالرحیمؒ نے کہا۔ "دیکھو تم ایک بار پھر غور کرو کہ پیرومرشد کی قبر کون سی ہے؟"

مرید نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر غور سے دیکھا اور ایک دم شرمندگی سے عرض کیا۔ "حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی۔ پیرومرشد کی قبر تو آپ کی پشت پر ہے۔"

تھوڑی دیر بعد شاہ عبدالرحیمؒ نے قبر کی طرف منہ کیا اور تلاوت کرنے لگے اس بار ان کا دل بھر آیا اور طبیعت قابو میں نہیں رہی، تلاوت میں جذباتی دباؤ کی وجہ سے قرأت کے قواعد کی پابندی برقرار نہ رہی۔ اسی عالم میں شاہ عبدالرحیمؒ نے سنا، سید عبداللہ فرما رہے ہیں۔ "شاہ عبدالرحیم! یہ کیا کررہے ہو، ہوش میں آؤ۔ یہ قرآن پاک ہے تساہل سے کام نہ لو اور احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔"

اس بار شاہ عبدالرحیمؒ نے نہایت احتیاط سے قرآن پاک کی تلاوت کی اور بہ چشم گریاں گھر واپس گئے۔

کہتے ہیں شاہ عبدالرحیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے فیضان ربی میں سید عبداللہؒ کی نوازشوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

ماخذ: الطبقات الکبریٰ؛ علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ مروضتہ الریاحین؛ ابی محمد عبداللہ۔ سفینۃ الاولیاء؛ شہزادہ دارا شکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء؛ شیخ فرید الدین عطار

سیدی مولہ

جناب تسنیم بلگرامی

دوگھڑی دن چڑھے ایک خوبصورت اور بارُعب شخص حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شانِ استغنا سے گویا ہوا: "السلام علیکم!"

بابا فرید نے اس اجنبی کو بہ نظرِ خاص ملاحظہ فرمایا اور افسردہ لہجے میں جواب دیا: "وعلیکم السلام بابا سیدی مولہ!"

اجنبی نے مسکرا کر سوال کیا: "بابا فرید! آپ ہم سے واقف ہیں؟"

"ہاں، خوب۔" بابا فرید نے جواب دیا: "اور اس بات سے بھی کہ تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟"

اجنبی نے کہا: "فی الحال تو یہ ناچیز آپ کی خدمت میں رہے گا اور جو قدم بھی اٹھائے گا پہلے آپ کی مرضی معلوم کرے گا۔"

"کاش تم یہی کرتے۔" بابا فرید نے اُداسی سے کہا: "لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تم وہی کرو گے جو تقدیرِ الٰہی ہے، سیدی مولہ! ہماری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، امرا کی صحبتیں ہم فقرا کو راس نہیں آتیں اگر ہم ایسا کریں گے تو خود کو برباد کر لیں گے، تم بھی اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ ملوکیت اور امارت کا سایہ تک تمھیں راس نہ آئے گا، ان سے اس طرح بھاگنا جس طرح سورج سے ستارے۔"

سیدی مولہ بابا فرید کے سامنے دو زانو بیٹھ گئے، بولے۔ "بابا! جیسا آپ فرمائیں گے یہ گناہگار اس پر عمل کرے گا، فقیری اور امیری کا کیا میل؛ ایک دن کا نور ہے تو دوسرا شب کی سیاہی اس فرق سے یہ ناچیز بھی آگاہ ہے۔"

بابا فرید نے پوچھا: "اب کیا ارادہ ہے؟"

سیدی مولہ نے جواب دیا: "چند دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں، اس کے بعد مدعا عرض کروں گا۔"

بابا فرید نے رہنے کی اجازت دے دی، سیدی مولہ ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

بابا فرید نے سیدی مولہ کو سخت ترین عبادت و ریاضت میں مشغول دیکھا اور دل سے ان کی عزت کرنے لگے لیکن جب بھی سیدی مولہ سے ان کی نظریں ملتیں، بابا فرید اُداس ہو جاتے اور کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے۔ سیدی مولہ بھی بابا فرید کی اس ذہنی کیفیت اور رُوحانی کوفت سے واقف تھے لیکن کوئی سوال نہ کرتے تھے۔ کئی دن بعد ظہر کی نماز پڑھ کر بابا فرید جیسے ہی ذرا فراغت سے بیٹھے، سیدی مولہ سلام کر کے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

بابا فرید نے دریافت کیا: "کیا بات ہے سیدی مولہ؟"

سیدی مولہ نے عرض کیا: "حضرت! ناچیز دہلی جانا چاہتا ہے، بس بابا کی اک ذرا اجازت درکار ہے۔"

بابا فرید کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوئے، آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور چند ثانیے اسی حالت میں گزار دیے، پھر آنکھیں کھول کر دریافت فرمایا: "کیا یہ حتمی فیصلہ ہے؟"

سیدی مولہ نے ادب سے جواب دیا: "جیسا کہ یہ ناچیز پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ اپنا مدعا بعد میں ظاہر کرے گا وہ مدعا یہ ہے کہ دہلی چلا جائے، بس ذرا حضور کی اجازت درکار ہے۔"

بابا فرید نے کرب ناک لہجے میں کہا: "ہم تمھیں دہلی جانے سے کس طرح روک سکتے ہیں، دہلی جانا مقدرات میں سے ہے، آسمانی فیصلہ کس طرح بدل سکتا ہے۔"

سیدی مولہ نے انکسار سے سوال کیا: "کوئی نصیحت، کوئی ہدایت؟"

اس مضمون کی تیاری میں جن مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تاریخ فیروز شاہی — ضیاء الدین برنی
تاریخ فرشتہ — محمد قاسم فرشتہ
تاریخ مبارک شاہی — یحییٰ بن احمد سرہندی
خزینۃ الاصفیا — مفتی غلام سرور لاہوری

صہیب مرنگ

[illegible] سیدی ! ہم وہی باتیں پھر دہرائیں
[illegible] ہو تم دہلی جا رہے ہو اور وہاں پہنچ کر
[illegible] اخلاص رکھو اور نام پیدا کرو۔ ٹھیک
[illegible] طریقے میں اپنی بہتری اور بھلائی دیکھو
[illegible] ہم تمہیں ایک نصیحت ضرور کریں گے اگر تم اس پر
[illegible] میں رہو گے ورنہ ہلاکت میں پڑو گے۔"

[illegible] سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی سوال کیا:" ارشاد؟"

[illegible] افسوس سے کہا:" ملوک اور امراسے پرہیز، اپنی
[illegible] کو ہلاک اور وجہ تباہی سمجھنا ہمارا یہ قول ہمیشہ
[illegible] درویش ملوک اور امراسے میل جول کا دروازہ کھولتا
[illegible] دونوں خراب کرلیتا ہے۔"

[illegible] مولہ نے کسی خیال میں ڈوب کر آہستہ سے کہا:" بہتر
[illegible] گراں مایہ ہدایات کا بطور خاص خیال رکھے گا لیکن
[illegible] کوئی انسان کس طرح بچ سکتا ہے ؟"

[illegible] مولہ بابا فرید سے رخصت ہو کر دہلی چلے گئے۔ بابا
[illegible] سرد آہ بھری اور مغموم آواز میں ارشاد فرمایا:" بابا تم
[illegible] لوح محفوظ میں تو کچھ اور ہی رقم ہے۔ جاؤ اور اپنے
[illegible] کام انجام دو۔"

[illegible] مولہ نے دہلی پہنچ کر ایک شاندار خانقاہ کی تعمیر کا
[illegible] یہ منصوبہ معمولی رقم کا نہیں تھا، اس پر اتنا سرمایہ خرچ ہوا
[illegible] والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لوگ حیران تھے کہ
[illegible] پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی۔ مزدوروں اور کاریگروں کو
[illegible] چھوٹتے ہی چاندی کے نئے نئے سکے تقسیم کیے جاتے۔
[illegible] والے حیران تھے کہ سیدی مولہ ایک بے نوا اور بے سہارا اجنبی
[illegible] دہلی میں کوئی شناسا نہیں، حکومت کی طرف سے کوئی وظیفہ مقرر
[illegible] جاگیر میں کوئی گاؤں نہیں۔ پھر ان کے پاس یہ دولت کہاں سے
آگئی ؟ لوگ اس جگہ کی جستجو کرنے لگے جہاں سیدی مولہ نے اپنا
[illegible] چھپا رکھا تھا۔ سرکاری حکام کو یہ شبہ تھا کہ سیدی مولہ دنیادار
انسان ہیں اور کہیں ٹکسال لگا رکھی ہے جس میں چاندی کے سکے ڈھالا
کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی سیدی مولہ کے شب و روز کا خاموش محاسبہ
شروع کر دیا۔ محاسبے سے ایک بات کی تو تصدیق ہوگئی وہ یہ کہ سیدی
مولہ نماز جماعت سے نہیں پڑھتے، خانقاہ میں کہیں چھپ کر پڑھ
لیتے ہوں تو دوسری بات ہے ورنہ کسی نے انھیں نماز پڑھتے یا
ریاضت و مجاہدے میں مشغول نہیں دیکھا۔

خانقاہ کے تعمیر ہوتے ہی لنگر جاری ہو گیا اور دونوں وقت ہزاروں آدمیوں کے لیے لذیذ ترین کھانے پکنے لگے۔ زمانے کے ستائے ہوتے پریشان حال یہیں پناہ لیتے اور پیٹ کی آگ بجھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے۔ دہلی کے امرا اور حکام اس عجیب و غریب شخص کی زیارت کو حاضر ہونے لگے۔ سیدی مولہ ہر ایک سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے اور جب یہ امرا اور حکام ان سے مل کر واپس جانے لگتے تو سیدی مولہ انھیں ہزار دو ہزار چاندی کے سکے یا اشرفیاں بطور انعام عطا فرماتے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اور زیادہ چونکا دینے والا تھا۔

سیدی مولہ ایک چادر جسم پر لپیٹے دراز تھے۔ ان کے آس پاس مصیبت زدوں کا ہجوم تھا۔ یہ سب حاجت مند تھے۔ کسی کو اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور اس مد میں روپے درکار تھے۔ کوئی بوڑھا ہو چکا تھا اور لاولد ہونے کی وجہ سے بے سہارا تھا اور بڑھاپے کا ضعف اسے محنت و مشقت سے روکے ہوئے تھا، کوئی صاحبِ اولاد تو تھا لیکن ناکارہ، نالائق اور کام نہ آنے والی اولاد کے ہاتھوں تنگ تھا اور سیدی مولہ سے مدد کا طالب تھا، کسی کی ملازمت چھوٹ چکی تھی یا کاروبار ختم ہو گیا تھا، کوئی سرکاری معتوب تھا اور دانے دانے کو ترس رہا تھا، حاجت مندوں اور مصیبت زدوں کا یہ ہجوم ان کے گرد و پیش امداد کا طلب گار تھا، سیدی مولہ سبھی سے خوش اخلاقی سے پیش آرہے تھے۔

کسی سے کہہ دیا:" اُدھر ہمارے بستر کے پاس جاؤ اور تکیے کے نیچے سے دو ہزار تنکے (روپے) نکال لو۔"

کسی سے کہتے:" دیکھو اس ہانڈی میں جو کچھ رکھا ہے نکال لاؤ۔"

تکیے والے نے تکیے کے نیچے سے دو ہزار تنکے حاصل کر لیے اور ہانڈی والے نے ہانڈی کے اندر سے دو سو اشرفیاں نکال لیں۔

ایک ادھیڑ عمر شخص ہجوم کو چیرتا ہوا سیدی مولہ کے قریب پہنچا اور ان کے روبرو کھڑے ہو کر زار و قطار آنسو بہانے لگا۔ سیدی مولہ نے ہنستے ہوئے اُسے دیکھا اور دریافت فرمایا:" کیا بات ہے ؟ تم رو کیوں رہے ہو ؟"

اس شخص کی آنکھیں پرنالا بن گئیں اور داڑھی کے بال اُلجھ، جس سے آنسو کے قطرات ٹپ ٹپ قدموں میں گرنے لگے۔

سیّدی مولہ کے دل پر ان آنسوؤں نے کوئی اثر نہ کیا، بدستور لاپروائی سے پوچھا: "آخر بات کیا ہے اور تم یہ گرمچھ کے آنسو کیوں بہا رہے ہو؟"

اس شخص نے رقت زدہ آواز میں کہا: "افسوس کہ میں آپ کو نہایت ہمدرد اور انسان دوست درویش سمجھتا تھا لیکن آپ جو کچھ مجھ سے فرما رہے ہیں اس سے پتہ چلا کہ آپ نہایت سخت دل اور ظالم انسان ہیں، میں فلک زدہ، زمانے کا مارا، دل فگار انسان ہوں اور آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے اپنے درد کا درماں چاہوں گا لیکن آپ نے میرے زخم خوردہ دل سے بہنے والے آنسوؤں کو گرمچھ کے آنسو کہہ کر میرے دل پر آرا چلا کے رکھ دیا۔"

سیّدی مولا نے ترشی سے کہا: "لفاظی کی کوئی ضرورت نہیں، تمھیں جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دو!"

اس شخص نے کہا: "حضرت! میں کل تک بادشاہ کی فوج میں اعلا منصب پر فائز تھا لیکن معلوم نہیں کس بات پر بادشاہ کی نظر مجھ سے پھر گئی اور میں بادشاہ کا معتوب قرار پا گیا۔ اب عالم یہ ہے کہ میں بھاگتا اور منہ چھپاتا پھر رہا ہوں اور بادشاہ کے ملازمین مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت گرفتار کر لیا جاؤں اور فنا کے گھاٹ اتار دیا جاؤں اور اگر فنا کے گھاٹ نہیں اتارا گیا تو یہ یقینی امر ہے کہ اب میں کہیں ملازمت نہیں پا سکتا۔ ایک لڑکے اور چار جوان جہان لڑکیوں کا ساتھ ہے، سدا کی روگی بیوی ہے جس کا آئے دن علاج ہوتا رہتا ہے۔ ان گراں مصارف پر بیکاری اور بادشاہ کا عتاب، آپ ہی انصاف فرمائیں کہ میں اندر سے کتنا دکھی اور پریشان انسان ہوں۔"

سیّدی مولہ نے غیر متاثر لہجے میں پوچھا: "تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا: "صرف یہ کہ میں معاشی بدحالی اور تباہ کاری سے محفوظ رہوں۔"

"اور کچھ؟"

"اور یہ کہ میں اپنی چاروں لڑکیوں کی فوراً ہی شادی کر دینا چاہتا ہوں ان کے لیے کم از کم دس ہزار اشرفیاں درکار ہیں اگر میں ان چاروں کے بار سے سبک دوشی حاصل کر لوں تو میرا بوجھ بہت زیادہ ہلکا ہو جائے گا اور میں زمانے کی ستم رانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکوں گا۔"

"اور کچھ؟" سیّدی مولہ کا تکیۂ کلام معلوم ہو رہا تھا۔

"اور یہ کہ میری بیوی کی بیماری آزاری پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے اس مد میں کم از کم دو ڈھائی ہزار اشرفیاں مزید عطا فرما دیں کہ میں اس کا علاج جاری رکھ سکوں۔"

"اور کچھ؟"

"اور یہ کہ مجھے اپنے روزمرہ کے لیے کم از کم تین چار ہزار اشرفیاں مزید عنایت فرما دیں تاکہ اگر دو چار سال ملازمت نہ بھی ملے تب بھی میں اپنا کام بآسانی چلا سکوں۔"

سیّدی مولہ کے پاس ایک ہی سوال تھا: "اور کچھ؟"

اس شخص نے جواب دیا: "اور یہ کہ میں کم از کم چھ ہزار اشرفیوں کا مقروض ہو چکا ہوں، چاہتا ہوں آپ قرض کا یہ بوجھ بھی اتروا دیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

سیّدی مولہ نے جواب دیا: "جو چاہتے ہو، ہو جائے گا، اور کچھ؟"

"سر دست اگر یہی کچھ ہو جائے تو بندہ پروری ہوگی، آگے کیا عرض کروں؟"

سیّدی مولہ نے بے نیازی سے ارشاد فرمایا: "جن رقوم کا تم نے ذکر کیا ہے ذرا ان کا میزان تو کرو، کُل کتنی رقم بنتی ہے اور اپنی یہ مجموعی رقم اسی وقت لیتے جاؤ۔"

یہ شخص کچھ دیر حساب لگاتا رہا پھر بولا: "حضرت! یہ کُل رقم پچیس ہزار اشرفیاں بنتی ہے آپ خود بھی حساب لگا لیں۔"

سیّدی مولہ نے ہنستے ہوئے کہا: "ہمیں حساب لگانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کُل رقم بائیس ہزار پانچ سو اشرفیاں بنتی ہے لیکن تم ایک حریص اور دغاباز انسان ہو، تم جو بات کرو گے مبالغے اور جھوٹ کی آمیزش کے بغیر نہ کرو گے بہرحال ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تم پشیمانی اٹھاؤ، جاؤ اور جہاں خانقاہ کی بڑی دیگ رکھی ہے اسے ذرا کھسکا کر ایک طرف کر دو، اس کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے تم اس گڑھے میں جو کچھ بھی پاؤ، ہمارے پاس لے آؤ۔"

یہ شخص بھاگم بھاگ دیگ تک پہنچ گیا اور زور لگا کر دھکا دے کر دیگ کو ایک طرف کھسکا دیا، اس کے نیچے ایک گڑھا تھا اور گڑھے میں اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں پڑی ہوئی تھیں اور ہر تھیلی میں پانچ پانچ ہزار اشرفیاں تھیں۔ یہ ساری کی ساری بالکل نئی چمچماتی ہوئی تھیں۔ اس شخص کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دیگ کے نیچے گڑھے میں اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں کہاں سے آ گئیں اور ان میں مطلوبہ تعداد ہی میں اشرفیاں کیوں نکلیں؟

Scanned with CamScanner

یہ شخص اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر سیدی مولہ کے پاس پہنچ گیا، بولا "حضرت! تھیلیاں تو مل گئیں، بڑی نوازش! اس کرم گستری اور غریب پروری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

سیدی مولہ نے اسے ڈانٹ دیا، فرمایا: "ہم جانتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو لیکن ہمیں جھوٹے سوال کو بھی رَد کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی اس لیے تم جو کچھ چاہتے تھے اسے پورا کر دیا گیا، پھر اچھا کیا یہ سب کچھ جھوٹ نہیں تھا، جو داستان تم نے ہمیں سنائی، کیا اس میں ذرا سا بھی سچ موجود ہے؟"

یہ شخص تھر تھر کانپنے لگا۔

سیدی مولہ نے نرمی سے کہا: "ڈرو مت، تم صرف اس بات کا اقرار کر لو کہ تم نے ہم سے جو کچھ بھی کہا وہ سب جھوٹ ہے، دروغ گوئی ہے، افسانہ طرازی ہے، داستان نوائی ہے۔"

اس شخص کی قوتِ گویائی جواب دے گئی۔ وہ کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

سیدی مولہ نے کہا: "تم بادشاہ کے جاسوس، مخبر اور سُراغ رساں ہو جس کے سپرد بادشاہ نے یہ خدمت کی ہے کہ ہم سے ملے، اپنے دکھ درد کی ایک فرضی داستان سنائے اور امداد طلب کرے۔ پھر جب ہم اشرفیوں سے مدد کریں تو یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ یہ رقم کہاں سے دی جا رہی ہے اور ہمارے پاس کہاں سے آتی ہے! تم نے یہ سب کچھ دیکھ لیا، ہم نے تمھیں پچیس ہزار اشرفیاں بھی عطا کریں اور وہ جگہ بھی دکھا دی جہاں یہ اشرفیاں رکھی تھیں۔ اگر تم چاہو تو ہم تمھیں چند اور جگہیں بھی دکھا سکتے ہیں جہاں سے یہ اشرفیاں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن یہ ساری معلومات تمھارے اور تمھارے بادشاہ کے لیے فضول ہیں، اس سے کہو ہم فقیروں کی ٹوہ لگا کر کیا پائے گا، ہم تو وہ ہیں کہ پتھر پر نظر ڈال دیں تو وہ اشرفیوں کی تھیلی بن جائے، اللہ والوں کو کیوں چھیڑتا ہے۔"

یہ شخص سیدی مولہ کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر معافی مانگنے لگا اور اس بات کا اقرار کیا کہ اس کی بابت سیدی مولہ نے جو کچھ بھی کہا ہے، درست ہے، حرف بہ حرف سچ ہے۔

سیدی مولہ نے اشرفیاں واپس نہیں لیں اور یہ شخص اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر چلا گیا۔

سیدی مولہ کی خانقاہ کا خرچ روز بروز بڑھتا ہی رہا اور آخر کار اتنا بڑھا کہ ہزاروں آدمی شب روز خانقاہ سے کھانا کھاتے اور دُور دُور سے آنے والے اِدھر اُدھر سرائے کا رُخ کرنے کے بجائے اس خانقاہ کا رُخ کرتے۔ صبح و شام آٹے اور میدے کی ہزاروں بوریاں اور گھی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن، دودھ اور معلوم نہیں کیا کیا خانقاہ میں آتا اور سب کچھ خرچ ہو جاتا۔ لوگوں کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کہاں سے آتا ہے اور کون لاتا ہے! اور یہ کہ سیدی مولہ کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟

سیدی مولہ بندگانِ خدا کی ایک ہی خدمت کرنے کے قائل تھے، وہ خدمت تھی معاشی بدحالی کا علاج اور تدارک۔ ان کا قول تھا کہ ساری خرابیوں کی جڑ معاشی بدحالی ہے۔ اس موذی مرض کا علاج کرو تو بہت سارے مرض خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس غیر معمولی صَرفے کو دیکھتے ہوئے خود سیدی مولہ کی زندگی پر غور کیا جاتا تو وہ نہایت سادہ تھی، جسم ڈھانپنے یا ستر پوشی کے لیے انھیں ایک تہبند اور ایک چادر کی ضرورت رہتی تھی۔ کھانے میں چاول کی روٹی کو پانی اور کبھی کبھی شوربے میں ڈبو کر کھا لیا کرتے تھے۔

فرماں روائے ہند غیاث الدین بلبن کا انتقال ہوا تو سیدی مولہ کے مصارف میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ کیقباد حکمران ہو گیا، سیدی مولہ اپنی روش پر قائم رہے۔ وہ امرا اور سرکاری ملازمین جو ایک فرماں روا کے انتقال اور دوسرے کی آمد پر اس کی لاپروائی اور ناقدری سے بے کار یا بے روزگار ہو گئے تھے ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ سیدی مولہ کا لنگر خانہ کھلا ہوا تھا اور اس کے دَر ہر ایک پر وا تھے، ان پریشاں حال اور آشفتہ سر بے کاروں نے سیدی مولہ کی خانقاہ کا رُخ کیا، سیدی مولہ نے خوشی خوشی ہر ایک کو خوش آمدید کہی اور ان کی بہاں یک پزیرائی کی کہ یہ لوگ جب کھا پی کر گھر جانے لگتے تو سیدی مولہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد بھی مرحمت فرماتے۔

کوئی کہتا: "حضرت! خاندان کے دس افراد کی ذمہ داری مجھ تنہا پر عائد ہوتی ہے، آپ مستجاب الدعوات ہیں میرے حق میں دعا کیجیے"

سیدی مولہ ارشاد فرماتے: "تمھیں دُعا سے زیادہ دوا کی ضرورت ہے کیونکہ معاشی بدحالی وہ لعنت ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان خدا تک سے منکر ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد حکم دیتے: "سامنے کی طاق میں جو کچھ رکھا ہے خاموشی سے اٹھا لاؤ۔"

وہ شخص طاق سے ایک تھیلی اٹھا لاتا، سیدی مولہ حکم دیتے "دیکھنا تو اس میں کتنی رقم ہے؟"

[illegible] کھول کر سیدی مولہ کے رُوبرو الٹ دیتا اور
[illegible] اشرفیاں ہیں۔ اتنی نئی اور چمک دار گویا ابھی
[illegible] سے نکلی ہیں۔

[illegible] کہا اُٹھتا ہوا سیدی مولہ کے قدموں میں بیٹھ
[illegible] لیتا ہوا بولا: "سیدی! میں مرحوم سلطان
[illegible] ہوں، نئے بادشاہ نے مجھے الگ کر دیا ہے،
[illegible] مرحوم بھائی اور اپنے کنبے کا تنہا کفیل ہوں سمجھ
[illegible] دوبارہ ملازمت کس طرح حاصل کروں، نیا بادشاہ
[illegible] میرے حق میں بھی دُعا فرمائیں!"

[illegible] اسے حکم دیا: "دیکھو! سامنے کی دیوار کے نیچے
[illegible] رکھی ہوئی ہیں، انھیں اٹھاؤ اور ان کے نیچے سے جو
[illegible] میرے پاس لے آؤ۔"

اس بوڑھے نے حکم کی تعمیل کر دی اور ذرا سی دیر میں اینٹوں
[illegible] تین تھیلیاں اٹھا لایا۔ سیدی مولہ نے ان کی رقم بھی گنوائی
[illegible] اشرفیاں تھیں۔ آپ نے بوڑھے کو حکم دیا: "یہ اشرفیاں لے
[illegible] دیکھو نہایت احتیاط سے خرچ کرنا۔"

بوڑھے نے زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اشرفیاں لے کر رخصت ہو گیا۔

ایک شخص بیساکھی کے سہارے آگے بڑھا اور سیدی مولہ سے
[illegible] "حضرت! میری ایک ٹانگ لڑائی کی نذر ہو چکی ہے، اب جبکہ میں
[illegible] کے لائق نہیں رہا۔ نئے بادشاہ نے مجھے جواب دے دیا ہے۔
[illegible] آپ ہی انصاف فرمائیں کہ اِن حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سیدی مولہ نے سوال کیا: "تمہارا کنبہ کتنے افراد پر مشتمل ہے؟"

لنگڑے نے جواب دیا: "پانچ افراد پر۔"

سیدی مولہ نے کہا: "تم ہمارے کسی آدمی کو اپنا گھر دکھا دو،
[illegible] پانچ آدمیوں کا کھانا گھر پہنچا دیا کرے گا۔"

لنگڑے نے سیدی مولہ کا شکریہ تو ادا نہیں کیا۔ کھُردرے انداز
[illegible] "واہ حضرت واہ! یہ آپ نے کس طرح فیصلہ کر لیا کہ ہمارے
[illegible] کنبے والوں کو کھانے کے علاوہ کسی اور شے کی ضرورت ہی
[illegible] سکتی۔"

سیدی مولہ نے ہنس کر کہا: "او جلد باز انسان! تو نے ہماری پوری
[illegible] تو سنی ہی نہیں۔" پھر آپ نے حکم دیا: "ہمارے مصلّے کا داہنا
[illegible] اٹھانا تو ذرا۔"

لنگڑے نے داہنا کونا اٹھایا تو اس کے نیچے نئی نئی اشرفیاں
بھری نظر آئیں۔ وہ گھبرا گیا اور انھیں چھونے کی ہمت نہ کر سکا۔

حاضر جوابی

ہلاکو خاں کے دربار میں نصیر الدین طوسی کو بڑی عزّت حاصل تھی۔ وُہ منصبِ وزارت پر فائز تھا۔ لیکن وہیں طوسی کا ایک حاسد بھی موجود تھا اور ہر وقت طوسی کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ اتفاق کی بات کہ انہی دنوں ہلاکو خاں کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ طوسی کا حاسد ہلاکو خاں سے مخاطب ہوا۔ کہا: "جناب قبر میں مرنے والے سے منکر نکیر طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں، طوسی ایک عالم فاضل شخص ہے، اُسے بھی والدہ محترمہ کے ساتھ دفن کر دیجیے تاکہ یہ منکر نکیر کو سوالوں کے معقول جوابات دے سکے۔"

ہلاکو خاں نے طوسی سے اس مشورے کا ذکر کیا تو اُس نے کہا۔ "بے شک قبر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن مجھے تو آپ اپنے لیے مخصوص رکھیں اور اپنی والدہ کے ساتھ اس عالم کو دفن فرما دیں، جس نے آپ کو یہ بہترین مشورہ دیا ہے۔"

ہلاکو خاں نے طوسی کے مشورے سے اتفاق کیا اور اس حاسد کو اپنی ماں کے ساتھ ہی دفن کر دیا۔

سیدی مولہ نے اسے نرمی سے حکم دیا: "یہ تمھاری ہی ہیں سادہ دِل نوجوان! ڈرو مت، انھیں اپنے دامن میں بھر لو!"

لنگڑے نے ساری اشرفیاں دامن میں بھر لیں۔

جب یہ تینوں چلے گئے تو سیدی مولہ نے اپنے مریدِ خاص کو بُلایا اور دریافت کیا: "آج خانقاہ میں کتنے ایسے آدمی جمع ہیں جو پہلے غیاث الدین بلبن کے دربار سے وابستہ تھے؟"

مرید چلا گیا اور کافی دیر بعد یہ اطلاع لے کر واپس آیا کہ سیدی مولہ کے آس پاس کئی ہزار افراد ایسے ہیں جو پہلے سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔

"اچھا!" سیدی مولہ کو اچانک بابا فرید کی نصیحت یاد آ گئی کہ "دہلی پہنچ کر ملوک اور امرا کی صحبت اور دوستی سے بچنا کیونکہ فقرا کو ان کی صحبت اور دوستی راس نہیں آتی۔" سیدی مولہ سوچتے سوچتے چونک پڑے اور زیرِ لب خود سے ارشاد فرمایا: "بابا آپ ہی بتائیں یہ ناچیز ان سرکاری آدمیوں سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ ان میں گردشِ زمانہ کے ستائے ہوئے امرا بھی ہیں اور سرکاری حکام بھی۔ وہ خدا جو رب العالمین اور جانداروں کا رازق ہے اس نے ان کے رزق کی تقسیم اس ناچیز کے سپرد فرمائی ہے کیا میں اپنے رب کے اس حکم کی خلاف ورزی

کر سکتا ہوں؟ ہرگز نہیں۔"
سیدی مولہ کو ایسا لگا، جیسے بابا فرید افسوس سے کہہ رہے ہوں۔
"سیدی! ہماری بات نہیں مانو گے تو پچھتاؤ گے۔"
سیدی مولہ نے گویا انھیں جواب دیا: "خدا کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔ یہ ناچیز کیا کر سکتا ہے؟"

آپ نے نظریں اُوپر اٹھائیں تو معلوم ہوا، خانقاہ میں چاروں طرف حاجت مندوں کا ہجوم ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنے ملازموں اور خدام کو حکم دیا: "انھیں شکم سیری کی حد تک کھانا کھلایا جائے اور اس وقت تک برابر کھلایا جاتا رہے جب تک ان کے معاشی مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکل آتا۔"

پھر ایسا ہوا کہ کیقباد کے ہاتھ سے بھی حکومت نکل گئی اور اقتدار کی باگ ڈور جلال الدین خلجی کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ایک بار پھر سرکاری عملے میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ہزاروں آدمی بے روزگار ہو گئے اور یہ سب مل ملا کر ہزاروں کی تعداد اختیار کر گئے۔ ان سب کی ذمے داری بھی سیدی مولہ نے اپنے سر لے لی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سیدی مولہ ہزاروں آدمیوں میں گھرے کھڑے تھے کہ ایک جوان شانِ بے نیازی سے اپنے گھوڑے کو دُلکی چال سے لے کر خانقاہ کے دروازے تک آ گیا۔ سیدی مولہ نے ایک نگاہِ غلط انداز سے اس شخص کو دیکھا تو لوگوں سے سوال کیا:
"لوگو! یہ کون ہے؟"
کسی نے جواب دیا: "سلطان جلال الدین کا سب سے بڑا بیٹا اختیار الدین خان خاناں۔ اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضور ایک رحم دل درویش ہیں اور ان کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہیں اس لیے شرفِ قدم بوسی کی خاطر شہزادے خان خاناں نے بھی حضور کے دربار میں حاضری دی ہے۔"

شہزادہ ایک دم گھوڑے سے کود پڑا۔ لوگوں نے ادب سے راستہ دے دیا۔ شہزادہ دوڑتا ہوا سیدی مولہ کی طرف بڑھا اور جھک کر ان کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑاتا ہوا بولا: "حضرت اِک نظرِ کرم اِدھر بھی، اس مشتاقِ دید کو مایوس نہ کیجیے گا۔"

سیدی مولہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن شہزادہ اپنی آنکھیں ان کے تلوے سے مَلنے لگا۔ بولا۔
"بس یہیں اسی جگہ آپ کے قدموں میں صحیح ہوں۔"
سیدی مولہ نے پوچھا: "تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟"
شہزادے نے جواب دیا: "حضرت کی نظرِ کرم۔"
سیدی مولہ نے کہا: "شہزادے تم ولی عہد ہو لیکن افسوس کہ تم جلال الدین کے فرمودہ ولی عہد ہو، خدائی فرمودہ نہیں۔"

شہزادے نے حسرت بھری نظروں سے سیدی مولہ کو دیکھا پوچھا: "حضور کے ارشادِ گرامی کا مطلب؟"
سیدی مولہ نے جواب دیا: "تمھاری قسمت کی لوحِ محفوظ میں تمھاری ولی عہدی کا خانہ خالی ہے۔"
شہزادے نے مایوسی سے سوال کیا: "میری زندگی کتنی ہے؟"
سیدی مولہ نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے کھول لیں بولے: "شہزادے! ہم تمھارے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے ہیں، وہ تمھارے سوگ میں رو رہا ہے۔"

شہزادہ خانِ خاناں نے غمگین ہو کر خاموشی اختیار کی لیکن سیدی مولہ کو گویا بار بار بابا فرید سرزنش کر رہے تھے کہ "سیدی یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ امرا اور سلاطین زادوں سے خدا کے لیے بچو، شر، آفت اور فتنے ان کے دامنوں سے لگ کر خانقاہ میں بھی داخل ہو جائیں گے۔"

آپ نے وہی کیا جو فرمانِ خداوندی تھا۔ امرا اور سلاطین زادوں میں سے ایک بھی خانقاہ سے نہیں نکالا گیا: "اگر خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو اسے پورا ہونا چاہیے۔"
یہ کہہ کر سیدی مولہ نے اطمینان کی سانس لی۔



خانقاہ کے باہر زبردست شور و غل برپا ہوا، ہزاروں آدمیوں کے ازدحام اور ان کے واویلا سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ان کی آہ و فغاں بے ہنگم آوازوں کا مجموعہ تھی جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ سیدی مولہ نے چادر اپنے جسم پر لپیٹ لی اور خانقاہ کے باہر نکل گئے۔ لوگوں نے انھیں دیکھتے ہی اور زیادہ جوش و خروش کا اظہار کیا۔ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا اور یک بیک آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ ایسا لگا جیسے ہزاروں مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہیں۔

یکایک سیدی مولہ کی کڑک دار آواز گونجی: "تم اپنا ایک نمائندہ یا چند آدمی ہمارے پاس بھیجو جو ہمیں تمھاری پریشانی یا مصیبت سے مطلع کر سکے۔"

مجمع نے یک سوئی سے یہ آواز سنی اور پھر آپس کی چہ میگوئیوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

کچھ دیر بعد پانچ آدمی آہستہ آہستہ سیدی مولہ کی طرف بڑھے جب وہ قریب آ گئے تو سیدی مولہ انھیں اپنے ساتھ لے کر خانقاہ

[illegible] اور سوال کیا: "کیا تمھیں بادشاہ سے کوئی اذیت [illegible]"

[illegible] شخص نے اپنے چاروں ساتھیوں کو خاموش رہنے کا [illegible] بولا: "سیدی! ان پریشان حال لوگوں کی وکالت [illegible] کہ پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔"

[illegible] نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کہا [illegible] ہیں۔"

اس شخص نے سیدی مولہ کی بات کا کوئی اثر ہی نہ لیا، کہنے [illegible] کو جلال الدین کاشانی کہتے ہیں، اس خاکسار کو بادشاہ [illegible] منصب بھی حاصل ہے۔ میرا ان پریشان حال [illegible] سے یوں تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میری دلی ہمدردی اور [illegible] نے مجھے اس پر مجبور کردیا کہ میں آپ کی خدمت [illegible] سفارش کروں۔"

[illegible] مولہ نے نرمی سے کہا: "تمہید میں وقت مت ضائع [illegible] بیان کرو!"

امیر جلال الدین کاشانی نے کہا: "ملک الامرا فخر الدین کوتوال سے جناب بھی واقف ہوں گے، ان کا انتقال ہوچکا ہے ان کے ہزاروں پروردہ اور ملازمین اب بیکار ہوچکے ہیں اور سردست ان کی روزی کا متبادل کوئی انتظام نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں کا ہر شخص ایک کنبہ ایک خاندان رکھتا ہے۔ یہ لوگ اپنے معاشی مرض کے علاج کے لیے یہاں آئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بادشاہ کا خزانہ اور شاہی باورچی خانہ بھی جو ان کے لیے نہیں کرسکتا وہ جناب کی خانقاہ سے ممکن ہے؟"

سیدی مولہ نے جواب دیا: "پھر ان سب سے کہہ دیا جائے کہ جب تک وہ بے روزگار ہیں اور ان کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہماری خانقاہ سے ان سب کو کھانا اور خرچ کی رقم ملتی رہے گی۔"

امیر کاشانی نے سیدی مولہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور وہ اپنے باقی ساتھیوں کو لے کر خانقاہ سے باہر نکل گیا۔ اس دن سے خانقاہ نے کئی ہزار آدمیوں کے کھانے پینے اور روزمرہ اخراجات کی ذمہ داری قبول کرلی۔

اسی دن رات کو امیر کاشانی نے دوبارہ حاضری دی اور کہا: "حضرت! مجھے آپ کی صحبت میں ایک ناقابل بیان روحانی سکون حاصل ہوتا ہے اگر اجازت ہو تو بندہ روزانہ حاضری کی سعادت حاصل کرلیا کرے۔"

لقمان نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: بیٹے! دیانت اور ایمانداری کے بعد ایک مخلص اور دانا دوست کو تلاش کرنا ہرگز نہ بھولنا، کیونکہ ایک مخلص اور دانا دوست پھل دار درخت کی طرح ہوتا ہے کہ اگر اس کے نیچے بیٹھو گے تو سایہ دے گا اور اوپر چڑھو گے تو پھل پاؤ گے۔"

سیدی مولہ نے جواب دیا: "یہ ایک فقیر کی خانقاہ ہے، اس میں حاضری کی اجازت کیا معنی؟ کوئی شاہی محل یا بادشاہ کا دربار تو نہیں کہ تم حاضری کی اجازت طلب کرو۔"

امیر کاشانی بہت خوش ہوا اور سیدی مولہ کے قدموں میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

اسی رات دو آدمی اور آئے۔ ایک برناتھن نامی ہندو جو عہد بلبن میں شہر کوتوال رہ چکا تھا دوسرا ہتیا پائک پہلوان۔ یہ بھی ہندو تھا اور بلبن کے دربار سے وابستہ رہ چکا تھا۔ یہ دونوں بھی اب بے کار تھے اور معاشی بدحالی انھیں ایک مسلمان درویش کی خانقاہ تک لے آئی تھی۔ یہ دونوں دھوتیوں میں منہ چھپائے سیدی مولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کی نظریں امیر کاشانی پر پڑیں تو واپس جانے لگے لیکن سیدی مولہ نے انھیں روک لیا اور پوچھا "تم دونوں واپس کیوں جارہے تھے؟"

برناتھن نے بات بنائی: "بابا جی! آپ کے درشن کرنے آئے تھے دیکھ کر جی خوش ہوگیا، اب واپس جارہے تھے۔"

امیر کاشانی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

ہتیا پائک پہلوان سیدھا سادا آدمی تھا، اس کے پاس برناتھن کوتوال جیسی عقل نہیں تھی۔ صاف صاف بتادیا: "مہاتما جی! بلبن بادشاہ ہمارا اَن داتا تھا، ہم دونوں اس کے سیوک تھے۔ وہ بیکنٹھ سدھارا تو دوسرے بہت سے سیوکوں کی طرح ہم دونوں بھی بے آس و بے سہارا ہوگئے، اب ہمارے اَن و جل کا کوئی ٹھکانا نہیں، آپ کی دیا کا چرچا چاروں اور پھیلا ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں آپ اس جگ کے سب سے بڑے دیالو ہیں، آپ کا اُپکار ہماری جیون نیا کو آسانی سے پار لگادے گا۔"

سیدی مولہ نے جواب دیا: "زندگی کی ناؤ کو پار لگانے والا خدا ہے ہم تو اس کے نائب ہیں، بہرحال تم دونوں بھی کوئی فکر نہ کرو اللہ نے چاہا تو تم دونوں کو بھی معاشی پریشانیاں نہیں اٹھانی پڑیں گی۔"

برناتھن کو واپسی کی جلدی تھی، فوراً اجازت طلب کی: "اچھا

باباجی! پھر کسی وقت حاضری دیں گے، اجازت دیجیے۔"

"اجازت!" سیدی مولہ نے ہاتھ اور گردن کے اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔

جب یہ دونوں چلے گئے تو امیر کاشانی نے منہ بنا کے کہا "حضرت! یہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ دونوں ہندو تھے؟"

"خوب اچھی طرح!" سیدی مولہ نے جواب دیا۔

امیر کاشانی نے تعصب کا انداز اختیار کیا، کہا "دونوں کا فرہیں۔ ایک کافر اور مسلمان میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ آپ اس فاصلے کو کس طرح ختم کر دیں گے؟"

"خلجی امیر!" سیدی مولہ نے بے چینی سے کہا "جب خدا خود ہی قرآن پاک میں یہ فرما رہا ہو کہ وہ رب العالمین ہے تو معاشی مسئلے میں ہم مسلمان اور کافر کی تفریق کیوں کریں اگر خدا سورۃ فاتحہ میں یہ فرماتا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْمُسْلِمِیْنَ تو ہم بھی معاشی مسئلے میں ہندو مسلم کی تفریق پر کاربند ہو جاتے۔"

امیر کاشانی نے لاجواب ہو کر کہا "ظاہر ہے میں آپ سے کس طرح بحث کر سکتا ہوں لیکن اگر اس خانقاہ کے فیوض محض مسلمانوں کے لیے مختص ہو جائیں تو بہت اچھی بات ہو۔"

"ناممکن!" سیدی مولہ نے مضبوط لہجے میں کہا "ایسا قطعی ناممکن ہے۔"

امیر کاشانی نے پھر اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ خاموشی اختیار کی اور کچھ دیر بعد اُٹھ کر چلا گیا۔



دوسرے دن صبح ہی صبح امیر کاشانی کی عدم موجودگی میں برناتھن اور ہتیا پائک سیدی مولہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا "باباجی! کل رات ہم دونوں اس خلجی امیر کی وجہ سے واپس چلے گئے تھے، آپ بھی اس سے ہوشیار رہیں۔ لوگ کہتے ہیں، یہ امیر ذرا فسادی ہے، شر پھیلاتا رہتا ہے۔"

سیدی مولہ نے جواب دیا "ہاں آدمی تو اچھا نہیں نظر آتا لیکن ہم بھی کیا کریں، خدا نے ہمارے اوپر جس شخص کو مسلط کر دیا ہے اس کا پاس لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

دونوں لاجواب ہو کر چپ ہو رہے۔ تھوڑی دیر بعد سیدی مولہ نے انھیں حکم دیا "جاؤ سامنے پانی کے گھڑوں کے نیچے جو کچھ رکھا ہے اٹھا لو اور اس سے اپنا کام چلاؤ۔"

دونوں گھڑوں کے پاس پہنچے اور ان کے نیچے سے بہت سارے سونے کے سکے نکال کر اپنی اپنی جیبوں میں بھر لیے اور دوبارہ پھر سیدی مولہ کی خدمت میں دو زانو بیٹھ گئے۔

سیدی مولہ نے کہا "اب یہاں وقت مت برباد کرو، گھر جاؤ اور بیوی بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کرو، وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

دونوں دوبارہ باریابی کی پیشگی اجازت لے کر چلے گئے۔

اب خانقاہ کے لنگر خانے کا خرچ کئی گنا زیادہ ہو چکا تھا اور اشرفیوں اور چاندی کے سکوں کی تقسیم بھی نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔

اب امیر کاشانی کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے آنے جانے کا کوئی خاص وقت نہیں تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت سیدی مولہ کی خدمت میں گزارنے لگا۔ دُوسری طرف برناتھن اور ہتیا پائک کی حاضری اور نشست و برخاست میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے تو امیر کاشانی ان دونوں سے جلتا تھا اور درمیان میں کفر اور اسلام کی خلیج حائل کر دی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ خلیج رواداری کے ملبے سے پاٹی جانے لگی اور کچھ ہی دنوں بعد یہ خلیج بالکل پٹ گئی۔ اسی مجلس میں جلال الدین خلجی کا ولی عہد شہزادہ خانِ خاناں بھی حاضری دیتا رہا، اسے سیدی مولہ نے اپنا فرزند قرار دیا تھا۔ خود سیدی مولہ نے شادی نہیں کی تھی۔

ایک رات عشا کی نماز کے بعد امیر کاشانی نے سیدی مولہ سے کچھ تامل سے کہا "حضرت! یہ خاکسار چند ایسی باتیں کہنی چاہتا ہے جو ممکن ہے بارِ خاطر ہوں لیکن ان کی افادیت پر ہرگز شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

سیدی مولہ نے خندہ پیشانی سے جواب دیا "بے تامل کہہ گزرو، گھبراؤ مت!"

امیر کاشانی نے ہندو مصاحبین کی طرف دیکھا تو چالاک برناتھن نے کہا "باباجی! ہم دونوں مجلس سے اُٹھے جاتے ہیں کاشانی جی جو باتیں کہنا چاہتے ہیں ہمارے پیچھے آسانی سے کہہ لیں گے۔"

سیدی مولہ نے کہا "نہیں نہیں مجلس سے اُٹھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، انھیں جو کچھ کہنا ہے ہم سب کے سامنے کہیں گے ورنہ زبان کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو شخص دُوسروں کی موجودگی میں کسی کے کان میں بات کرنے کی خواہش کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ عیار اور خطرناک ہے، حق بات کے لیے تخلیے یا کان میں کھسر پھسر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

امیر کاشانی بہت شرمندہ ہو گیا۔ کچھ دیر کی ندامت کے بعد آہستہ سے گویا ہوا "حضرت! بات حقیقتاً یوں ہے کہ اس ناچیز نے

[illegible] دیکھ لیا ہے۔ آپ میں کسی عظیم مصلح کی روح
[illegible]

[illegible] نے بیک زبان تائید کی: ”بے شک، بے شک،
[illegible]“

[illegible] کاشانی نے کہا: ”یہ ناچیز ایک عرصے سے یہ محسوس
[illegible] خداوند تعالیٰ نے جو اوصاف اور خصوصیات حضورِ والا
[illegible] ان سے اس دور کا ہر انسان محروم ہے۔ اُس رات
[illegible] نے ارشاد فرمایا کہ خداوند تعالیٰ ربّ المسلمین نہیں ربّ العالمین
[illegible] آنکھیں فرطِ حیرت و انکشاف سے کھلی کی کھلی رہ
[illegible] کی صفات اور اوصاف کا جیسا علم حضورِ والا کو
[illegible] لیے اس کی بابت سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ سلطانی
[illegible] ایسے ہی آدمیوں کا حق ہے۔ اس خاکسار کی تو یہ رائے
[illegible] والا اقتدار اور فرماں روائی کے تخت پر متمکن ہونے کی کوشش
[illegible] رحم دل اور خدا پرست ہیں، مخلوق اور رعایا کے دُکھ درد
[illegible] احساس اور خلوص حضورِ والا رکھتے ہیں، جلال الدین خلجی کے
[illegible] ایسا رحم اور خلوص نہیں ملے گا۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے حامیوں
[illegible] کے توسط سے حکومت کا تختہ اُلٹ دیں اور خود اقتدار
[illegible] لیں۔ اگر حضورِ والا ایسا نہیں کریں گے تو اللہ اور اس کے
[illegible] ناراض کر دیں گے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر
[illegible] میں بھیجا ہے۔ اگر جناب نے اس ملک کو ظالموں کے پنجوں سے
[illegible] دلائی تو کل قیامت میں خدا اور رسُول کو کیا منہ دکھائیں گے؟“

برناتھن سینہ تان کر کھڑا ہو گیا، جوش اور ولولے سے
[illegible]: ”[illegible] کی خدمت یہ ناچیز انجام دے گا۔“

ہتیا پالمک نے پوچھا: ”وہ کس طرح؟“

برناتھن نے جواب دیا: ”جب بادشاہ کی سواری گزرے گی تو
[illegible] کی زیارت کرنے والے ہجوم میں میں بھی شامل ہو جاؤں گا پھر جیسے
[illegible] بادشاہ میرے قریب آئے گا میں پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کا کام
[illegible] کر دوں گا۔“

امیر کاشانی برناتھن کا منصوبہ نہایت غور سے سُن رہا تھا۔
[illegible] تجویز سُن کر دریافت کیا: ”لیکن بادشاہ کے قتل کے بعد تمھارا کیا
[illegible] ہو گا؟“

”مجھے اپنے حشر کی کوئی پروا نہیں۔“ برناتھن نے جواب دیا۔
[illegible] اگر میں اپنے جیون کی بھینٹ دے کر باباجی کو بادشاہ بنا دوں گا
تو [illegible] دیش کے باسیوں کی سیوا ہو گی۔“

ہتیا پالمک ابھی تک خاموش تھا۔ اس نے بھی زبان کھولی،
بولا: ”بادشاہ کو مارنے کا جو منصوبہ بھی بنے ضروری ہے کہ اس کے ہر
پہلو پر نہایت عقل مندی سے غور کر لیا جائے اور اگر برناتھن جی کے
جیون کا کسی طرح بچاؤ ممکن ہو تو اس کا بھی خیال رکھا جائے۔“

”میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب بھی ہے جس سے بادشاہ
کو ہلاک کر کے برناتھن کو بچایا جا سکتا ہے۔“ امیر کاشانی دماغ پر زور
دیتا ہوا بولا۔

سیدی مولہ ان کی باتیں نہایت توجہ سے سُن رہے تھے اور خود
منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال رہے تھے۔

ہتیا پالمک نے پوچھا: ”برناتھن جی کا بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟“

امیر کاشانی نے جواب دیا: ”حضرت جی کے مریدوں اور
معتقدوں کی تعداد غیر معمولی ہے، ہزاروں میں پھیلے ہوئے ہیں جس
روز بھی برناتھن جی کو اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہو حضرت اپنے دس بارہ ہزار
معتقدوں کو بھی اس ہجوم میں شامل فرما دیں اور برناتھن جی جیسے ہی اپنا
کام پورا کر چکیں، یہ ہجوم انھیں اپنی حفاظت میں لے لے۔“

برناتھن اور ہتیا پالمک اس تجویز پر اُچھل پڑے۔ ہتیا پالمک
نے خوش ہو کر کہا: ”بھائی ہم ٹھیرے پہلوان، ہمارے پاس تو بس شریر
ہی شریر ہے، بُدھی تو سرکار دربار کے عہدے داروں ہی کے پاس
ہوتی ہے، امیر کاشانی کی بُدھی کا ہم کیا مقابلہ کریں گے۔“

جب یہ تینوں اس منصوبے پر متفق ہو گئے تو انھوں نے تائید
اور منظوری کے لیے سیدی مولہ کی طرف دیکھا۔ سیدی مولہ نے پوچھا
”پھر ہماری تخت نشینی کس طرح عمل میں آئے گی؟“

امیر کاشانی نے فوراً جواب دیا: ”حضورِ والا کے جملہ مرید اور
معتقد جو اس موقع پر موجود ہوں گے ایک جلوس کی شکل میں اپنے باباجی
کو لے کر شاہی محل میں داخل ہوں گے اور وہاں تخت نشینی کی رسم
ادا کر دی جائے گی۔“

برناتھن نے کہا: ”اگر باباجی ہم سب کی کوششوں سے تاج و
تخت حاصل کر لیں گے تو شاید میں ایک بار پھر شہر کوتوال ہو جاؤں۔“

ہتیا پالمک نے کہا: ”اور مجھے درباری پہلوان ہو جانے کا موقع
مل جائے گا جس سے دال روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

امیر کاشانی نے خوشی سے منہ کھول دیا، بولا: ”اور یہ خاکسار
اس وقت حضرت جی سے یہ درخواست کرے گا کہ اس ناچیز کو حضورِ
مستقلاً اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیں، میرے لیے
یہی سب سے بڑا اعزاز ہو گا۔“

سیدی مولہ ماضی میں پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا، بابا فرید انھیں گھور رہے ہیں اور ہونٹوں پر انگلی رکھے اشاروں سے منع فرما رہے ہیں کہ خبردار جو انھیں اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی۔ آپ نے بلند آواز میں ارشاد فرمایا: "ہم نے تم سب کی تجویزیں سنیں اور تمھارے وہ احساسات جو مجھ ناچیز سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے علم میں آئے لیکن اگر ہم تم سے اتفاق کرتے ہیں تو اس سے بابا فرید کی ناراضی کا خدشہ رہتا ہے اور انھوں نے ہمیں منع کر رکھا ہے کہ ہم امرا اور حکام کو اپنی صحبت میں نہ آنے دیں، ان سے راہ و رسم نہ بڑھائیں کیونکہ امیری اور فقیری کا کوئی جوڑ نہیں۔ انھوں نے اس ناچیز کو یہاں تک سرزنش فرمائی تھی کہ اگر ہم نے ان کی نصیحت پر عمل نہ کیا تو گویا ہم اپنے لیے ہلاکت خرید لیں گے۔"

امیر کاشانی نے کہا: "آپ امرا اور حکام کو اپنی خدمت میں آنے دیں یا نہ آنے دیں یہ تو ایک بات ہی دوسری ہے۔ ہم سب تو یہ چاہتے ہیں کہ حضور والا خلیفۃ المسلمین بننا قبول فرمالیں۔ اگر خلافت اور امارت ایسی ہی بُری چیز ہے تو پھر خدا نے رسُول مقبولؐ کے معزز اور مقدس ساتھیوں کو خلافت کا منصب کیوں عطا فرمایا؟ خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین ہونا حقیقتاً آپ ہی جیسے انسان کا حق ہے آپ مانیں یا نہ مانیں یہ کارِ خیر انجام ضرور دیا جائے گا۔"

سیدی مولہ نے انکار کیا: "جلال الدین خلجی بھی کوئی بُرا حکمراں نہیں ہے اس لیے اسے ہٹا کر ہمیں بٹھانا مناسب نہیں ہے۔"

برنا حسن نے کہا: "اگر وہ بُرا آدمی نہیں ہے تو پھر اور کون بُرا ہے۔ اس کے برسرِ اقتدار آتے ہی ہزاروں عہدے دار بے کار اور بے روزگار ہو گئے۔ ان کا قصُور کیا تھا؟ صرف یہ کہ وہ پچھلے بادشاہ کی ملازمت میں رہ چکے تھے۔"

ہتیا پائک نے کہا: "اگر بابا جی پناہ نہ دیتے تو یہ برسوں کا پالا ہوا ہاتھی جیسا شریر پھلنگا چارپائی کی طرح زمین سے لگ چکا ہوتا۔"

سیدی مولہ اپنی مسند پر قائم رہے اور مضبوط لہجے میں کہا: "بہر حال کچھ بھی ہو ہم تمھیں بادشاہ کے قتل کا مشورہ ہرگز نہ دیں گے اور نہ ہی تمھیں اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیں گے۔ آخر خدا نے ہمیں کیا نہیں دیا، دولت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہزاروں انسان ہماری خانقاہ سے دونوں وقت کا کھانا حاصل کرتے ہیں، اسی طرح سینکڑوں کی ہر روز مالی مدد کی جاتی ہے۔"

امیر کاشانی نے ڈرتے ڈرتے کہا: "اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو یہ ناچیز کچھ دریافت کرے؟"

سیدی مولہ نے کہا: "پوچھو!"

امیر کاشانی نے کہا: "آپ کے پاس اتنا بڑا خزانہ آیا کہاں سے؟ اتنی دولت آپ کے ہاتھ آئی کہاں سے؟"

سیدی مولہ نے جواب دیا: "مولا کا کرم ہے، بس اس کے سوا کوئی جواب نہیں۔"

امیر کاشانی نے خوشامد سے کہا: "حضور والا کا سچا ہمدرد اور غم خوار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ناچیز ہے خدا حضور کو ہزاروں سال زندہ و سلامت رکھے، یوں موت زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، اگر حضرت مناسب سمجھیں تو اس ناچیز کو بھی وہ عمل بتا دیں جس کے پورا کرنے سے دستِ غیب حاصل ہو سکتا ہے۔"

سیدی مولہ نے کہا: "ریاضت کرو ریاضت۔ خدا محنت رائیگاں نہیں کرتا، جب دل سے ریاکاری دماغ سے رعونت اور اندر سے خبثِ باطنی نکل جائیں گے تو تمھاری نظر بھی کیمیا اثر ہو جائے گی۔"

امیر کاشانی نے بڑی کوشش کی کہ سیدی مولہ دستِ غیب کا عمل بتا دیں لیکن انھوں نے نہیں بتایا۔ آخر جب وہ ان سے رخصت ہونے لگا تو کسی مرید نے سُنا، امیر کاشانی یہ کہتا ہوا خانقاہ سے نکلا تھا کہ "ہم تو حضرت کو بادشاہت دینے کو تیار ہیں اور حضرت ہمیں دستِ غیب کا وظیفہ تک بتانے کو تیار نہیں، حضرت جی نے 'نا' کر کے ہمارا دل توڑ دیا ہے جو اب شاید کبھی بھی نہ جُڑ سکے۔"

امیر کاشانی نے ایک رات دیکھا کہ سیدی مولہ نہایت سوز اور جذبے سے چند اشعار پڑھ رہے ہیں۔

در مطبخِ عشق جز نکو را نہ کشند
لاغر صفتان و زشت خو را نہ کشند
گر عاشق صادق ز کشتن مگریز
مردار بود بر آنچہ اُو را نہ کشند

(عشق کے باورچی خانے میں نیکوں کے سوا کسی کو بھی نہیں مارتے بُری صفتوں اور بُری عادتوں والے نہیں مارے جاتے۔ اگر تو سچا عاشق ہے تو موت سے نہ بھاگ، جس کو نہ ماریں وہ مُردار ہے)

امیر کاشانی نے پوچھا: "حضرت جی! ان اشعار کے ورد اور گردان کا مطلب؟"

سیدی مولہ نے جواب دیا: "چند دنوں بعد مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا، لیکن ہم نے تجھے معاف کیا۔"

امیر کاشانی نے پریشان ہو کر سوال کیا: "یہ ناچیز آپ کی اشاروں کی بات چیت سمجھنے سے قاصر ہے۔"

Scanned with CamScanner

سیدی مولہ نے جواب دیا: "باتیں اشاروں کی نہیں مستقبل کی ہیں۔ والی معانی و مطالب خود ہی سمجھائے گا۔"

پھر ادا افسردگی سے کہا: "لیکن تم یہ مت سمجھو کہ دنیا ہی سب کچھ ہے۔ تم ہماری خانقاہ میں کثرت سے آتے جاتے رہے ہو اور ہمارے الفاظ شمار کیے جاتے ہو۔ یہی وجہ ہے جو ہم تمھیں معاف کر رہے ہیں۔"

امیر کاشانی نے جھنجلا کر سوال کیا: "آخر میری خطا کیا ہے جسے آپ معاف فرما رہے ہیں؟"

سیدی مولہ نے کہا: "خطا؟ — تمھاری خطا؟ — تمھاری باتوں میں سازش کی بو آ رہی ہے، تمھارے جسم تمھارے لباس سے سازش کی بو آ رہی ہے اور یہی تمھاری خطا ہے کہ تمھارے پاس سے سازش کی بو آ رہی ہے۔"

امیر کاشانی جھنجلا کر چلا گیا۔ وہ سخت برہم تھا کہ یہ درویش آخر اس سے اشاروں میں بات کیوں کرتا ہے؟

❁

کسی مخبر نے بادشاہ کو اس سازش سے مطلع کر دیا اور شرکائے سازش کے نام بھی گنوا دیے۔ بادشاہ نے اسی وقت امیر کاشانی کو طلب کر لیا اور اس سازش کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔

امیر کاشانی نے کہا: "جہاں پناہ نے جو کچھ بھی سُنا ہے اس کا ایک ایک لفظ درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ یہ گناہ گار بھی شرکائے سازش میں پیش پیش تھا لیکن اس ناچیز کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ خدانخواستہ حضور کو قتل کرا کے سیدی مولہ کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ یہ گناہ گار تو محض اس لیے ان میں شامل ہو گیا تھا کہ اس سازش سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کر کے جہاں پناہ کو مطلع کر دے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "لیکن تو اب تک خاموش کیوں تھا اور تیرے ذریعے ہم تک کیوں نہیں پہنچی؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا: "محض اس لیے کہ یہ ناچیز اس کا قائل نہیں ہے کہ 'کاٹا اور لے دوڑی'۔ ناچیز چاہتا تھا کہ جب تک اس سازش کے دن، وقت اور لمحوں تک کا تعیین نہ ہو جائے، راز کھولنا مصلحت کے خلاف ہے، اب جبکہ سازش قبل از وقت بے نقاب ہو چکی ہے تو پھر یہی مناسب ہے کہ میں گواہ کی حیثیت سے اس کی تصدیق کر دوں۔"

بادشاہ نے پوچھا: "آخر تُو کس طرح ہمیں اس سازش سے آگاہ کرتا؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا: "جب اس ناچیز کو یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں دن اور فلاں وقت یہ سازش روبہ عمل ہو گی تو میں حضور کو اس سے مطلع کر کے یہ مشورہ دیتا کہ حضور اُس دن اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیں اور جب اس فرضی بادشاہ پر قاتلانہ حملہ کیا جاتا تو حضور کے پہلے ہی سے متعینہ سپاہی سازشیوں اور قاتلوں کو گرفتار کر کے حضور کے رُوبرو پیش کرتے۔ اس طرح حضور کو ان کے خلاف گواہی شہادت کے لیے آدمی نہیں تلاش کرنے پڑتے لیکن اب؟ جہاں تک اس ناچیز کی سمجھ کا تعلق ہے یہ سمجھتا ہے کہ سیدی مولہ اور اس کے رفقائے کار کے خلاف میرے سوا ایک شہادت بھی نہ مل سکے گی اور شرعاً ایک گواہ کی شہادت ہی کیا، مجھے جھٹلایا بھی جا سکتا ہے۔"

بادشاہ نے افسوس سے کہا: "خیر اب تو جو کچھ ہوا اس کا ملال بے سُود ہے، اب یہ بتاؤ کہ کیا تو اب بھی اس مکّار اور دنیادار فقیر سیدی مولہ کے خلاف لب کشائی کی ہمت رکھتا ہے؟"

"بالکل، حضور جب چاہیں اس کا امتحان لے لیں۔"

"تو سیدی مولہ اور اس کے ساتھیوں کے سامنے اس سازش کا اقرار کرے گا؟"

"بالکل کروں گا، مجھے کس بات کا ڈر اور ایک حقیقت کو جھٹلانا کیا معنی؟"

بادشاہ نے پوچھا: "اس سازش میں اور کون کون شریک ہے؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا: "برناتھن، بلبنی عہد کا شہر کوتوال

یُونان کا مشہور مفکر اور فلکیات کا ماہر بطلیموس اپنے ایک دوست کا غم ہلکا کرنے گیا جو چند دنوں پہلے تک دولت مندوں میں شمار ہوتا تھا لیکن کسی طرح اُس کی دولت دُوسروں کے پاس چلی گئی تھی۔ دوست بطلیموس کو اپنے سامنے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا — بولا "بطلیموس! میرے دوست! مجھے لوگوں نے تباہ کر دیا، میری دولت ان کے قبضے میں جا چکی ہے اور مَیں تہی دست و تہی جیب ناداری کی آگ میں پُھنک رہا ہوں!"

بطلیموس نے جواب دیا: "دوست! تم غلط فہمی کے شکار ہو۔ وہ تمھاری دولت کب تھی اگر وہ واقعی تمھاری ہوتی تو دُوسروں سے تم تک نہ آتی اور آ کر تمھارے قبضے سے دُوسروں کے پاس نہ چلی جاتی۔"

ہتیا پائک، بلبنی دربار کا پہلوان، ان دونوں کے علاوہ غالباً پچھلی حکومتوں کے بعض امرا، خان زادے اور شاہی خاندان کے افراد بھی شریک ہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "ہم ان سب کی گرفتاری کا فرمان اسی وقت جاری کیے دیتے ہیں اگر تو نے سازش کے عینی اور شریک گواہ کی حیثیت سے بیان نہ دیا تو تیری بھی خیر نہیں۔"

امیر کاشانی نے جھک کر بادشاہ کے قدموں میں زمین کو بوسہ دیا اور کھڑے ہو کر عرض کیا: "اور اگر اس ناچیز نے اس دُنیادار حریص فقیر سیدی مولہ کے خلاف گواہی دے دی تو جہاں پناہ انعام کیا عطا فرمائیں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "صلے میں تجھے بدایوں کا قاضی بنا دیا جائے گا۔"

امیر کاشانی نے بادشاہ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

اسی وقت سیدی مولہ، برنا حسن اور ہتیا پائک کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ آناً فاناً ان سب کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔ سیدی مولہ کو رسیوں سے جکڑ کر بادشاہ کے روبرو کھڑا کر دیا گیا۔ بادشاہ سے کچھ فاصلے پر سیدی مولہ کے دائیں جانب امیر کاشانی شاہی رعب اور جلال سے مؤدبانہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ شاہی نقیب نے باآواز بلند سیدی مولہ کو ان کا جرم بتایا جس سے سیدی مولہ نے صاف انکار کر دیا۔

بادشاہ نے غصے میں کہا: "او دنیادار مکار درویش تو جھوٹا ہے۔"

سیدی مولہ نے تحمل سے جواب دیا: "ہم جھوٹ نہیں بولتے، بادشاہ کو غلط فہمی ہو گئی ہے یا شاہی مخبروں نے بادشاہ کو صحیح خبر نہیں پہنچائی۔"

بادشاہ نے امیر کاشانی کو حکم دیا: "تو سازش کے عینی اور شریک گواہ کی حیثیت سے جو کچھ جانتا ہے صاف صاف بیان کر دے۔"

امیر کاشانی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "یہ ناچیز خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کرتا ہے کہ سیدی مولہ پر جو جرم عاید کیا گیا ہے وہ صد فی صد درست ہے۔ سیدی مولہ اپنے فدائیوں کی مدد سے جہاں پناہ کو قتل اور خود سریر آرائے سلطنت ہونا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے اس خاکسار کو ملتان کی ولایت عطا فرمانے کا وعدہ کیا تھا۔"

سیدی مولہ نے سختی سے انکار کیا: "کاشانی! تو حقیقتِ حال سے باخبر ہے اور تو ہی جھوٹ بول رہا ہے، خدا سے ڈر، یہ بہت بڑی بات ہے۔"

امیر کاشانی نے مزید کہا: "اس ناچیز نے جو کچھ کہا ہے خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کیا ہے۔"

بادشاہ نے مفتیانِ دین سے پوچھا: "کیا جلال کاشانی کے بیان پر سازشیوں کو سزا دی جا سکتی ہے؟"

درباری مفتی نے جواب دیا: "نہیں، جلال کاشانی کی شہادت سچی اور معتبر نہیں قرار دی جا سکتی۔"

بادشاہ بے بس ہو گیا، اس نے مشورہ طلب کیا: "پھر ہمیں اس سلسلے میں کیا قدم اٹھانا چاہیے؟"

مفتی نے جواب دیا: "جب تک سیدی مولہ اور شرکائے سازش پر جرم ثابت نہ ہو جائے ان کے خلاف کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔"

بادشاہ نے حکم دیا: "جب تک سیدی مولہ اور ان کے ساتھیوں کی سازش کا جرم ثابت نہ ہو اور کوئی ایسا معقول اور مستند طریقۂ کار نہ دریافت ہو جس سے جرم کی قطعی تصدیق ہو جائے انھیں قید خانے میں رکھا جائے!"

سیدی مولہ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ برنا حسن اور ہتیا پائک پہلے ہی قید میں پڑے ہوئے تھے۔

کئی دن کے غور و فکر کے بعد بادشاہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزموں کو آگ کے الاؤ میں سے گزار کر جھوٹ سچ کی تصدیق کرائی جائے جب حکم کی تعمیل میں آگ روشن کی جا چکی تو بادشاہ نے اعلان کرا دیا کہ اس آگ پر سے سیدی مولہ اور ان کے رفقا کو گزارا جائے۔ اگر وہ اس پر سے صحیح سلامت گزر جائیں گے تو انھیں سچا مان لیا جائے گا لیکن اگر وہ جل مریں گے تو گویا اس طرح وہ کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔

بادشاہ کے لیے آگ کے الاؤ کے قریب ایک خاص کوشک تعمیر کرائی گئی جس میں بادشاہ نے اپنے امرا، اعزا اور خواتین کے ساتھ قیام کیا۔ ان میں مفتیان دین اور علما اور مشائخ بھی موجود تھے۔ اس عبرت ناک نظارے کو دیکھنے کے لیے ہزاروں شہری بھی وہیں پہنچ گئے۔

سیدی مولہ، برنا حسن اور ہتیا پائک شاہی کوشک کے سامنے ڈال دیے گئے۔

بادشاہ نے ایک بار پھر مفتیان دین، علمائے کرام اور مشائخ عظام سے فتویٰ طلب کیا اور پوچھا: "کیا ان ملزموں کو ان کے جرم کی تصدیق یا تکذیب کے لیے آگ کے الاؤ پر سے گزارا جانا جائز ہے؟"

تمام علما، مشائخ اور مفتیانِ دین نے بیک زبان کہا: "آگ کا کام جلانا ہے، ملزم حق پر ہوں یا ناحق پر، آگ سے گزریں گے تو

...ہو جائیں گے۔"

بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا: "پھر ان سے ان کے جرم کی تصدیق کس طرح کرائی جائے؟"

علماء نے جواب دیا: "بہرحال یہ طریقہ ناجائز ہے۔"

بادشاہ نے ایک گرز بردار کو حکم دیا: "بلبنی پہلوان ہتیا پائک کو گرز کی ضربات سے ہلاک کر دیا جائے۔"

گرز بردار دیوانہ وار آگے بڑھا اور ہتیا پائک پر گرز کی مسلسل ضربات لگا کر پچی کر دیا، دم توڑتے ہتیا پائک کی خوفناک اور دلدوز چیخوں سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

اس کے بعد بادشاہ نے شاہی فیل بان کو حکم دیا: "برنا ہتھن پر ہاتھی گزار دیا جائے۔"

فیلبان نے ہاتھی کی گردن میں آنکس اتار دیا۔ ہاتھی چنگھاڑ مار کر تیزی سے برنا ہتھن کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں اسے روند کر آگے بڑھ گیا۔ فیلبان نے ہاتھی کو موڑ کر ایک بار پھر برنا ہتھن پر سے گزار دیا۔ یہ عمل کئی بار دہرایا گیا۔ یہاں تک کہ برنا ہتھن کی لاش ہتیا پائک کی لاش کی طرح پامال ہو گئی۔ شہری اور شاہی متعلقین اس دلدوز منظر کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔

اب سیدی مولہ کی باری تھی۔ بادشاہ نے سیدی مولہ سے سوال جواب شروع کر دیے۔ سیدی مولہ نے بادشاہ کے سوالات کے جوابات نہایت بے باکی اور بے خوفی سے دیے۔ اسی دوران اس عہد کے درباری شیخ ابوبکر طوسی حیدری اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ بادشاہ نے انھیں اپنے قریب بلایا اور شکایتاً کہا: "شیخ! آپ ذرا سیدی مولہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ آپ خود بھی درویش ہیں اور سیدی مولہ بھی درویش ہے۔ دیکھیے تو سہی اس درویش نے ہمارے خلاف کیسا خطرناک منصوبہ بنایا تھا، اگر اس منصوبے میں یہ شخص کامیاب ہو جاتا تو آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ ملک میں کیسا فتنہ و فساد برپا ہو جاتا۔"

شیخ طوسی حیدری نے پوچھا: "بادشاہ کا اس شکایت سے منشا کیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "انصاف، صرف انصاف۔ اس شخص کو ہم خود کوئی سزا نہیں دینا چاہتے۔ یہ درویش ہے اسے آپ جیسا درویش ہی کوئی سزا دے سکتا ہے یا جیسا فیصلہ مناسب سمجھیں صادر فرما دیں۔"

ابھی طوسی حیدری نے اپنا فیصلہ سنایا بھی نہ تھا کہ اس کا ایک مرید جیب سے اُسترا اور جوال دوز (بوری سینے کا سُوا) نکال کر سیدی مولہ پر جھپٹا اور ان پر پے در پے کئی وار کر کے زخمی کر دیا۔ بندھے ہوئے سیدی مولہ نے بلند آواز میں بادشاہ سے کہا: "بادشاہ! ہم اپنی موت سے ہراساں نہیں ہیں اب بھی وقت ہے کہ ہمیں ہماری خانقاہ میں پہنچا کر آنے والی مصیبت سے نجات حاصل کی جائے۔"

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا اور طوسی حیدری کا مرید بدستور اُسترے اور سُوئے کے زخم لگاتا رہا۔ جب سیدی مولہ زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تو آخری بار بادشاہ کو متنبہ کیا: "بادشاہ! ہمیں اپنی موت کا کوئی غم نہیں کیونکہ ہمیں تمام ذی حیات کی طرح ایک نہ ایک دن تو موت کا مزہ چکھنا ہی تھا لیکن تجھے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور یہ ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔ تجھے نہیں معلوم کہ درویش کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں۔"

بادشاہ خاموشی سے یہ عمل دیکھ رہا تھا، اس کے قریب ہی شہزادہ ارکلی خان بیٹھا تھا۔ چونکہ سیدی مولہ نے اس کے بڑے بھائی اختیار الدین خاں، خان خاناں کو بیٹا بنا لیا تھا اس لیے ارکلی خان سیدی سے نفرت کرتا تھا۔ اسے شبہ گزرا کہ شاید بادشاہ سیدی مولہ کو معاف کر دے گا اس لیے اس نے فوراً ہی فیلبان کو اشارے سے حکم دیا کہ

ہارون الرشید

کی بہن عباسہ کی جس شخص سے شادی ہوئی تھی۔ اس کا کچھ عرصے بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عباسہ ایک دوسرے شخص سے وابستہ کر دی گئی۔ کچھ عرصے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ پھر عباسہ ایک اور شخص سے منسوب ہو گئی اور یہ تیسرا شخص بھی کچھ عرصے بعد مر گیا۔ ابھی چوتھے شخص سے شہزادی منسوب نہیں ہوئی تھی کہ ہارون رشید نے ایک باغی کے خلاف سزائے موت کا حکم صادر کیا۔ دربار میں موجود ایک شاعر کی رگِ ظرافت پھڑکی اور اس نے جان کا خطرہ مول لے کر چند شعر عباسی خلیفہ کو سنا دیے۔

شاعر نے اپنے اشعار میں کہا۔

"امیر المومنین! خطاکار باغی کو تلوار سے مارنے کا حکم خواہ مخواہ دے رہے ہیں۔ قتل کا آسان طریقہ یہ ہے کہ امیر المومنین مجرم سے عباسہ کو وابستہ فرما دیں۔ مجرم خود بخود ٹھکانے لگ جائے گا۔"

ہارون رشید اس تلخ اور دل آزار مزاح کو برداشت کر گیا اور مسکرا کر چپ ہو رہا۔

سیدی مولہ کو ہاتھی سے کچل دیا جائے۔

فیلبان نے ہاتھی کو آنکس مار کر سیدی مولہ پر چڑھا دیا اور پلک جھپکتے ہی سیدی مولہ کی روح پرواز کر گئی۔

شہریوں نے آہ و فغاں بلند کی۔ ابھی بادشاہ اور شہری واپس بھی نہ ہوتے تھے کہ سیاہ آندھی نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور لوگ پاگلوں کی طرح پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگنے اور آپس میں متصادم ہونے لگے۔

جب بادشاہ محل میں واپس پہنچا تو پتہ چلا کہ ولی عہد خان خاناں بیمار پڑ چکا ہے۔ شاہی اطبا علاج میں لگ گئے لیکن یہ مرض علاج کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ خان خاناں وفات پا گیا، بادشاہ پر ولی عہد شہزادے کی موت قیامت کی طرح گزر گئی۔

امیر کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔

سیدی مولہ کی خانقاہ سونی ہو گئی، تنور بجھ گئے، ہزاروں متوسلین خانقاہ بے آسرا ہو گئے، ہزاروں خاندان بھوکوں مرنے لگے اسی سال شہر میں زبردست قحط پڑا اور شہر پر موت کے سائے منڈلانے لگے۔ ہزاروں آدمیوں نے فاقے کی موت پر جمنا میں ڈوب مرنے کی موت کو ترجیح دی۔

اس واقعے کے چند سال بعد جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد علاء الدین اس سے ناراض یا خوف زدہ ہو کر الہ آباد میں رہنے لگا۔ بادشاہ نے اسے منانے اور واپس بلانے کی بہتیری کوششیں کر ڈالیں لیکن علاء الدین واپسی پر رضامند نہ ہوا۔ علاء الدین نے بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ خود تشریف لائیں اور غلام کو پابجولاں واپس لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی علاء الدین نے اپنے خسر اور چچا بادشاہ کو یہ بھی لکھا کہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے جو سونا اور جواہر جمع ہیں انھیں بھی حاصل کر لیں۔ بادشاہ بعجلت دریائی سفر سے الہ آباد روانہ ہو گیا۔ علاء الدین مانک پور میں اس کا منتظر تھا۔ دریا کی سطح پر اسے جیسے ہی شاہی چتر نظر آیا وہ بادشاہ کے استقبال کو آگے بڑھا۔ یہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی۔ اس وقت بادشاہ تلاوتِ کلام پاک میں مشغول تھا علاء الدین نے نہایت ادب سے بادشاہ کا استقبال کیا اور اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر آنسو بہانے لگا۔

بادشاہ نے پیار سے بھتیجے کے گال پر ایک چپت رسید کر دی اور کہا "ہم نے تجھے کتنے لاڈ اور پیار سے پال پوس کر بڑا کیا ہے اور ہمیشہ تجھے اپنے حقیقی بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھا، تیرے بچپن کی بو ہمارے لباس میں ابھی تک محفوظ ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ تو ہم سے بدظن اور بدگمان ہے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے علاء الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلنے کے لیے قدم اٹھائے۔

علاء الدین نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ سمانہ نامی علاء الدین کے سپاہی نے بادشاہ پر تلوار کا وار کیا۔ بادشاہ کی چیخ نکل گئی، بلند آواز میں کہا "اے بدبخت علاء الدین! یہ تو نے کیا کیا۔"

لیکن ایک دوسرے سپاہی نے بادشاہ کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہ دیا، اس نے بادشاہ کو پچھاڑ دیا اور سینے پر چڑھ کر نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا پھر سر کاٹ کر علاء الدین کی خدمت میں پیش کر دیا۔

بادشاہ کے تمام ساتھی بھی قتل کر دیے گئے اور علاء الدین نے اسکندر ثانی السلطان الاعظم، علاء الدنیا والدین محمد شاہ خلجی کے نام اور لقب سے ہندوستان کا اقتدار سنبھالا۔

ارکلی خان جس نے سیدی مولہ پر ہاتھی چڑھوایا تھا جب علاء الدین کے قابو میں آگیا تو اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا دی گئیں اور زندگی بھر کے لیے قید کر دیا گیا۔ نہ صرف ارکلی خان کو یہ سزا دی گئی بلکہ علاء الدین خلجی نے جلال الدین خلجی کے کسی وارث کو بھی معاف نہیں کیا اور چند ہی دنوں میں بادشاہ کا خاندان نیست و نابود ہو گیا۔

بابا فرید نے سیدی مولہ کو متنبہ کیا تھا کہ امرا اور حکام کی صحبتیں تمھیں راس نہیں آئیں گی بلکہ ڈرتے رہو کہ یہ تمھیں ہلاکت کی طرف لے جائیں گی۔

لیکن سیدی مولہ نے اپنی خانقاہ میں لنگر خانہ عام جاری کر کے بلاتخصیص بے سہاروں اور بھوکوں میں رزق کی تقسیم شروع کر دی تھی۔ اس میں عوام بھی آتے تھے اور شاہی ملازمین اور حکام بھی۔ وہ خدا کو رب العالمین سمجھتے تھے، رب المسلمین نہیں اور اپنے اس اعتقاد اور یقین میں اتنے راسخ اور مضبوط تھے کہ دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر خدا کی مشیت یہی ہے کہ میں بابا فرید کی تنبیہ کے مطابق ہلاک کر دیا جاؤں تو مجھے مشیت الٰہی میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔"

چنانچہ وہ مشیتِ الٰہی پر قربان ہو گئے لیکن کچھ ہی عرصے بعد بادشاہ کو بھی اسی طرح اپنی عبرت ناک موت کو خوش آمدید کہنا پڑا۔



سب رنگ

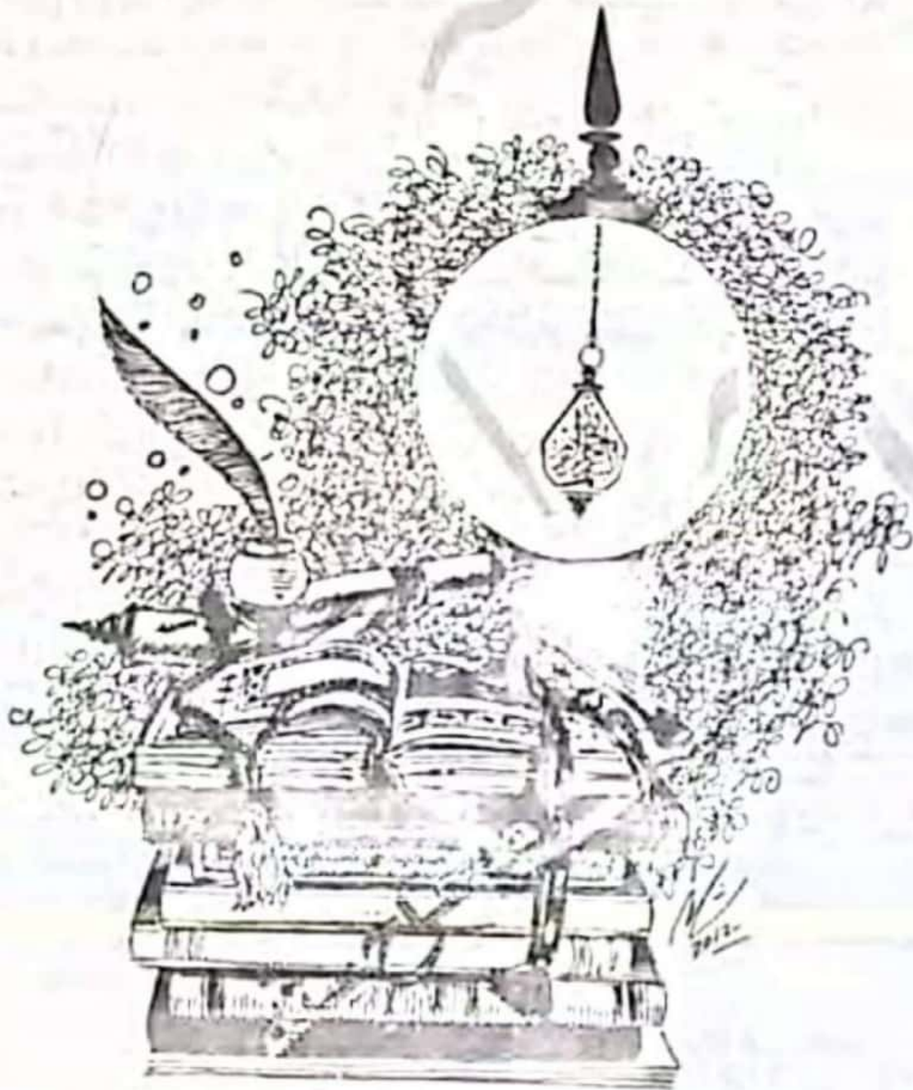
Scanned with CamScanner

شمع صوفیاں

ضیا تسنیم بلگرامی

رشد وہدایت کا سلسلہ کہنے میں جتنا آسان ... اتنا ہی اس کے میزان پر پورا اترنا مشکل... مگر اللہ جنہیں اس کام کے لیے منتخب کرتا ہے انہیں ویسا ہی حوصلہ اور عزم عطا کرتا ہے... ایسے رستے ان کے قدموں تلے بچھا دیتا ہے وہ ہر آزمائش پر پورا اترتے چلے جائیں... یوں وہ علم و معرفت کی ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر امتحان ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

دشوار گزار راہوں پر استقامت کے پیکر..... ایک ولی کا قصہ



چشت کے سات سالہ بچے مودود کی ابھی عمر ہی کیا تھا۔ جب لوگوں نے یہ سنا کہ مودود نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہے تو اکثر کو اس خبر کی صداقت پر یقین نہیں آیا۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سات سال کا بچہ قرآن پاک کے تیسوں پارے تجوید کے ساتھ حفظ کر لے۔ یہ لوگ اپنی اپنی چوپالوں میں دوست احباب کے ساتھ بیٹھ جاتے اور مودود کا ذکر لے بیٹھتے۔

بہار کا موسم تھا، موسلا دھار بارش نے ہر شے کو دھو ڈالا تھا، ہرے بھرے درخت کچھ زیادہ سرسبز دکھائی دینے لگے تھے۔ آس پاس کی پہاڑی چٹانیں اور راہوں میں پڑے ہوئے پتھر دھل دھلا کر نکھر گئے تھے۔ بارش کا پانی جب اوپر سے بہہ کر نیچے آیا تو اس نے دریا کی شکل۔۔ اختیار کر لی۔ اس کے بہاؤ میں اس بلا کی تندی اور سرکشی تھی کہ اس نے چشت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اِدھر کا آدمی اُدھر نہ جا سکتا تھا اور اُدھر کا آدمی اِدھر نہ آسکتا تھا۔ دونوں طرف سیکڑوں تماشائی پانی کی سرکشی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سامنے کی چوپال میں چند بے فکرے مودود کے حفظ قرآن پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ ان میں ایک بڑے میاں بھی تھے۔ انہیں مودود کے کارنامے پر ذرا بھی تعجب نہیں تھا۔

وہ کہہ رہے تھے۔ ''آخر تم لوگوں کو اس پر تعجب کیوں ہے؟''

ایک نوجوان نے قہقہہ لگایا، کہنے لگا۔ ''اجی قبلہ! آپ کی کیا عمر ہوگی؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''میری عمر...... میری عمر یہی کوئی پینسٹھ، سرسٹھ رہی ہوگی۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''آپ قرآن پاک کو کتنے دنوں میں حفظ کر سکتے ہیں؟''

بڑے میاں چکرا گئے، گھبرا کے جواب دیا۔ ''اب میں اس لائق کہاں رہا کہ قرآن پاک کو حفظ کرلوں، مجھے تو لوگوں کے نام تک نہیں یاد رہتے۔''

چوپال میں موجود لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جب آپ اتنی پختہ عمر میں داخل ہو جانے کے بعد بھی حفظ قرآن کی ہمت نہیں رکھتے تب پھر اس سات سالہ بچے نے قرآن پاک کو اپنے سینے میں کس طرح محفوظ کرلیا؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''بھائی! تم لوگ میری بات سمجھتے کیوں نہیں، مودود کا خاندان ولیوں کا خاندان ہے۔ اس کا باپ ولی، دادا ولی، مودود سے جو کچھ بھی ظاہر ہو جائے کم ہے۔''

اتنے میں کسی کی سامنے نظر پڑی تو مودود کو گزرتے دیکھا۔ سب چوپال سے نکل کھڑے ہوئے اور مودود کو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ دوسری طرف تماشائی جو پانی کے بہاؤ سے لطف اندوز ہو رہے تھے آپس میں شرط لگا رہے تھے۔

کسی نے مودود سے پوچھا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے قرآن پاک حفظ کرلیا ہے؟''

مودود نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے قرآن حفظ کرلیا ہے۔''

اچانک مودود کے کان میں آواز آئی، کوئی تماشائی کہہ رہا تھا۔ ''اجی جناب! اس پانی کو کوئی بھی عبور نہیں کر سکتا۔ ایک تو اس کا چوڑا پاٹ، دوسرے اس کا پرزور بہاؤ۔ گھوڑے اور اونٹ تک اس کے زور کے آگے نہیں ٹھہر سکتے۔''

ایک گرانڈیل پانی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ''اگر میں اسے عبور کرلوں تو؟''

کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔ ''ہم سب تمہارے مرید ہو جائیں گے۔''

یہ دیو جیسا آدمی پانی میں داخل ہوا اور ابھی چند ہی قدم چلا ہوگا کہ پانی کے زور نے اسے لڑکھڑا دیا۔ وہ کئی بار آگے پیچھے ہلا اور آخر ڈر کے باہر نکل آیا، شرمندہ ہو کر بولا۔ ''میں نہیں جا سکتا اس پانی میں خطرناک بہاؤ ہے۔''

لوگوں کی اُمید کے خلاف سات سالہ بچہ آگے بڑھا اور تماشائیوں سے کہا۔ ''میں اس طرف چلا جاؤں گا۔''

تماشائیوں نے آنکھیں پھاڑ کے مودود کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''صاحبزادے! تم اپنے گھر جاؤ۔ اگر بہہ گئے تو تمہارے بزرگ ہماری جان لے لیں گے۔''

مودود پانی کے کنارے پہنچ گئے۔ بولے۔ ''تم ڈرو مت۔ میں سامان اٹھائے بغیر اُدھر جا سکتا ہوں اور اسی طرح کسی نقصان کے بغیر واپس بھی آسکتا ہوں۔''

تماشائیوں میں سے ایک بزرگ بولے۔ ''مودود تم پانی میں مت جانا۔ مجھے معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔''

لیکن مودود نے ان کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''بہر حال میں تم سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ پانی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔'' یہ کہتے ہوئے مودود پانی میں اتر گئے۔ بعض کا اس کا انجام سوچ کر چیخیں نکل گئیں۔ بعض مبہوت اور پریشان ہو کے خوفناک انجام کو تصور میں دیکھنے لگے۔ ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ چند بزرگوں نے آگے بڑھ کر مودود کو پکڑ لینا چاہا لیکن وہ ہاتھ نہیں آئے۔ مودود تیزی سے پانی کے بہاؤ میں داخل ہو گئے اور دھارے کو کاٹ کر دوسری طرف بڑھنے لگے۔ تماشائی دیکھ رہے تھے کہ مودود بڑے اطمینان سے پانی پر یوں چل رہے تھے جس طرح ہوا میں بعض اوقات پرندے اپنے پروں کو سمیٹ کر تیرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ مودود پانی سے نہ نکل سکے تو ان کے والدین کو کیا

جواب دیا جائے گا لیکن تماشائیوں نے یہ حیرت انگیز تماشا بھی دیکھ لیا کہ مودود پانی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر لوگوں کو اشارے سے بتایا کہ میں پانی عبور کر چکا ہوں اور اسی راہ سے واپس بھی آ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد آپ پانی میں دوبارہ اتر پڑے اور جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس بھی آنے لگے۔

یہ جیسے ہی پانی سے نکلے، لوگوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انہیں حیرت تھی کہ مودود کی کوئی چیز بھیگی نہیں تھی۔

چوپال میں لوگ بحث ومباحثے میں الجھے رہ گئے تھے۔ ان میں سے بڑے میاں نے اپنے ساتھیوں کو شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم لوگ کیا کہو گے؟ مودود کے قرآن پاک حفظ کرنے پر یقین نہ کرنے والو، بتاؤ تم اس حیرت انگیز واقعے پر تبصرہ کرو گے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ ہم انسان کیا کہہ سکتے ہیں۔" لوگوں نے مودود کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اصرار کر رہے تھے کہ انہیں مرید کر لیا جائے۔

☆☆☆

اس واقعے کے دو سال بعد، چشت خشک سالی کا شکار ہو گیا۔ لوگوں پر غربت چھا گئی، اناج کی کمی اور گرانی نے لوگوں کا سامان بکوا ڈالا۔ بھوک نے غریبوں سے شرم وحیا چھین لی، گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ کھانے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ امرا کے دروں پر صدائیں لگتیں۔ جس کا اگر جواب ملتا تو لقمے میں، ورنہ ایک چپ ہزار بلائیں ٹال دیتی۔

مودود اپنے مکتب سے نکلے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان میں چند کہنے لگے۔ "میاں صاحبزادے! دو سال پہلے تم نے لمبا چوڑا دریا اس طرح عبور کر لیا تھا کہ تمہارے جوتے اور کپڑے بالکل خشک رہے تھے۔"

نو سالہ مودود نے دریافت کیا۔ "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

لوگوں نے جواب دیا۔ "ہم بھوکے ہیں، ہمیں کچھ کھلاؤ، اللہ کے برگزیدہ بندے۔"

مودود نے پوچھا۔ "کیا کھاؤ گے؟"

لوگوں نے جواب دیا۔ "جو کچھ تم کھلا دو گے، کھا لیں گے۔"

مودود نے اپنا ہاتھ آستین میں ڈال دیا اور لمحوں میں باہر نکال کر کچھ زمین پر پھینک دیا۔ چاروں طرف مٹھائیاں ہی مٹھائیاں بکھر گئیں۔ آپ نے لوگوں کو حکم دیا۔ "تم لوگ کھڑے میری صورت کیا تک رہے ہو، مٹھائیاں اٹھا اٹھا کر کھانا شروع کر دو۔ یہ سب تمہارے لیے ہے۔"

لوگ بے تحاشا مٹھائیوں پر ٹوٹ پڑے اور چن چن کر کھانے لگے۔

مودود نے جب یہ دیکھا کہ ہجوم بڑھتا ہی جا رہا ہے اور لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر مٹھائی سمیٹنے میں مشغول ہیں تو آپ نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اندر کی طرف ڈال کر باہر جو نکالا تو مٹھائی غائب ہو گئی۔ لوگوں سے کہا۔ "میرے نادان دوستو!" آپ نے انہیں مخاطب کیا۔ "کہیں میں دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں؟"

بہت سے آدمیوں نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر مودود کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔

یہ خبر مودود کے والد کو بھی پہنچ گئی۔ باپ نے بیٹے کو فوراً ہی بلوایا۔ جب یہ اپنے والد کے پاس پہنچے تو انہوں نے مودود کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ پہلے سوال کیا۔ "مودود میں نے عوام الناس میں تیری کرامتوں کے بڑے چرچے سنے ہیں، کیا وہ صحیح ہیں؟"

مودود نے جواب دیا۔ "جی ہاں وہ خبریں صحیح ہیں۔ کیوں، کوئی خاص بات؟"

باپ نے ناگواری سے کہا۔ "مودود! تو ابھی بچہ ہے اور تجھے کچھ نہیں پتا کہ تجھے کیا کرنا چاہیے اور کن چیزوں کو طلب کرنا چاہیے اور کن سے پرہیز واجب ہے؟"

مودود انتہائی سعادت مندی سے باپ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور باپ کی نصیحتیں سننے لگے۔

باپ کی زبان تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "بیٹے مودود! کیا میں نے تمہیں یہ نہیں بتا دیا تھا کہ ہمارے خاندان میں کرامتوں کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا، ہمیں محنت مشقت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کرامتوں کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ ضرور ہونا چاہیے لیکن برسرِعام نہیں ہونا چاہیے۔"

مودود نے شرمسار لہجے میں کہا۔ "آئندہ میں اس سے گریز کروں گا۔"

باپ نے کہا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ تم کرامتیں نہ دکھاؤ بلکہ میں کثرت سے منع کرتا ہوں کیونکہ اگر تمہیں اس کا چسکا پڑ گیا تو پھر

دن رات اسی میں الجھے رہو گے اور میں قیامت کے دن شرمندگی اٹھاؤں گا۔"
مودود نے وعدہ کیا۔"باواجان! میں وعدہ کرتا ہوں آیندہ اس کا خیال رکھوں گا۔"
کچھ عرصے بعد شکاریوں کی ایک جماعت کے ساتھ شکار کھیلنے تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک سرائے ملی، مودود اپنی جماعت سے الگ ہو کر چپ چاپ سرائے کے اندر چلے گئے اور عبادت کرنے لگے۔ آپ کے ساتھیوں نے آپ کی کمی کو اس وقت محسوس نہ کیا اور شکار میں مشغول ہو گئے لیکن بھاگ دوڑ میں تھک گئے اور سب ایک جگہ جمع ہوئے تو اپنے درمیان مودود کو نہ پا کر بہت فکرمند ہو گئے۔ آرام کرنا بھول گئے، مودود کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ کافی دیر بعد یہ لوگ سرائے میں داخل ہوئے تو وہاں مودود کو اس حال میں دیکھا کہ یہ خود کو عبادت میں لگائے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف سبز لباس میں ملبوس لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ یہ سبز پوش مختلف مصروفیتوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ تو زمین پر سر رکھے سجدے میں پڑے تھے اور کچھ اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔
شکاری ساتھیوں نے کہا۔"حضرت! ہم سب تو آپ کو اپنی جماعت میں نہ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں، خوب۔"
مودود نے اشارے سے پوچھا۔"کوئی خاص بات؟"
ایک شخص نے کہا۔"ہم سب نے جو کچھ شکار میں حاصل کیا ہے آپ کو پیش کر دیتے ہیں، آپ جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔"
آپ نے پوچھا۔"کچھ زندہ جانور بھی ہیں؟"
لوگوں نے جواب دیا۔"ہاں چند زندہ جانور بھی ہیں۔"
آپ نے کہا۔"ان کا دودھ پیش کرو۔"
لوگوں نے کہا۔"لیکن وہ دودھ دینے کے لائق نہیں ہیں۔"
آپ نے باصرار کہا۔"جیسا میں کہہ رہا ہوں کرو، وہ دودھ کیوں نہیں دیں گے؟"
لوگوں نے آپ کے حکم پر ان جانوروں کو دوہنا شروع کر دیا اور حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ جانور... دودھ دے رہے تھے۔
لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور یہ سب بیعت کی خاطر آپ کے گرد جمع ہو گئے، بولے۔"آج تو ہم مرید ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔"
آپ نے ان سب کو مرید کر لیا۔ بعد میں ان سبز پوشوں کی بابت پوچھا۔"حضرت! یہ کون لوگ ہیں؟"
آپ نے مسکرا کر کہا۔"تم لوگ انہیں نہیں پہچانتے؟"
انہوں نے جواب دیا۔"اگر پہچانتے تو آپ سے سوال کیوں کرتے۔"
آپ نے کہا۔"یہ اجنہ ہیں، جن۔ یہ سب مجھ سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔"
لیکن اس سوال کے جواب کے بعد جب ان لوگوں نے سبز پوشوں کو پھر دیکھنے کی کوشش کی تو وہ سارے ہی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

آپ نے پندرہ سال کی عمر میں منہاج العارفین نامی نادر روزگار کتاب تصنیف فرمائی۔
ابھی آپ چوبیسویں سال میں داخل ہی ہوئے تھے کہ والد کی حالت بگڑنے لگی۔ ان کی صحت جواب دیتی جا رہی تھی۔
ایک دن انہوں نے مودود کو اپنے روبرو طلب کیا اور بولے۔"مودود! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت میں نے تمہیں کیوں طلب کیا ہے؟"
آپ نے لاعلمی کا اظہار کیا، بولے۔"حضور خود ہی ارشاد فرما دیں میں کیا عرض کروں۔"
باپ نے کراہتے ہوئے کہا۔"بیٹے مودود! میری زندگی کا آفتاب غروب ہونے کو ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنا خرقہ، فقر و خلافت تمہارے حوالے کر دوں۔"
مودود نے پوچھا۔"کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ میں اس کا اہل ہوں؟"
باپ نے پیار بھری نظروں سے مودود کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔"اگر میں تمہیں اس کا اہل نہ سمجھتا تو یہ سب تمہیں ہرگز نہ دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ہم میں تم جیسا ایک بھی نہیں ہے اس لیے تم حیل و حجت مت کرو اور جو کچھ مجھ سے لینا ہے، لے لو۔"

مودود چپ ہو گئے۔ ان کے والد نے انہیں کمبل کا خرقہ پہنا دیا اور کہا۔ ''بیٹے مودود! یہ خرقہ رسول اللہ اور حضرت علی مرتضیٰ کا ہے اور یہ اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو صاحب ریاضت ہو۔''

اس کے بعد باپ نے انہیں وہ وظائف بتائے جو نسل در نسل چلے آرہے تھے۔ ان وظائف کے ورد نے مودود کی باطنی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا، جواب تک نہ دیکھا تھا، وہ سامنے آ گیا۔ جو آپ کی صحبت میں بیٹھتا وہ یکسر بدل جاتا۔

کچھ عرصے بعد باپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا شہرہ پھیلنے لگا۔ ارادت مندوں میں اضافہ ہونے لگا۔ آپ کی خدمت میں حاضریاں دینے والے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ مودود سلام کرنے میں سب سے سبقت لے جایا کرتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، لونڈی غلام میں کوئی فرق نہ کیا جاتا۔ یہی حال تعظیم بجالانے کا تھا۔ آپ ہر ایک کی تعظیم میں کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دن چند مریدوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کو جو مرتبہ ملا ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اپنی تعظیم کروانے کے بجائے، دوسروں کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ سلام کرنے میں بھی دوسروں کے مقابلے میں پہل کرتے ہیں اور یہ دو ایسے عمل ہیں کہ ان میں آپ کو پہل نہیں کرنا چاہیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''میرے اس عمل میں برائی کیا ہے؟''

ایک مرید نے جواب دیا۔ ''استغفراللہ، استغفراللہ۔ ہم ناچیز برائی کا تو اپنے دل میں خیال تک نہیں لا سکتے، ہاں یہ ضرور سوچتے ہیں کہ جب آپ آنے والے کے مرتبے اور مقام کی تخصیص کا خیال کیے بغیر تعظیم بجالاتے ہیں اور سلام میں پہل کر گزرتے ہیں تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ آنے والا غالباً مرتبہ و مقام میں آپ سے نمایاں ہے۔''

مودود مسکرانے لگے، فرمایا۔ ''میرے سادہ لوح دوستو! ہماری حس اور ادراک کا ہر فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں کوئی بڑا انسان ہوں اور نہ ہی میں دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہوں۔ میں اپنے اعمال اور اشغال سے رسول ﷺ کی متابعت ضرور کرتا ہوں۔ ہمارے رسول ﷺ سلام کرنے میں ہمیشہ سبقت لے جایا کرتے تھے، وہی میں بھی کرتا ہوں اس کے علاوہ جب ہمارے رسول ﷺ شب معراج اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچے تو خدائے عزوجل نے انہیں پہلے ہی سلام کر لیا تھا یعنی فرمایا تھا۔ السلام علیک ایھا النبی ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ تو کیا اس سے اللہ تعالیٰ کے مرتبے میں فرق آ گیا؟ جب رسول ﷺ سلام میں پہل فرمایا کرتے تھے تو اس سے نعوذباللہ، کیا خود رسول ﷺ کے مرتبے میں کوئی کمی آ جایا کرتی تھی؟''

مریدوں کو سانپ سونگھ گیا۔ خاموش ہو گئے اور ان کے دلوں میں مودود کے لیے بے پایاں عقیدت اور محبت پیدا ہو گئی۔

☆☆☆

ایک دن مرید گھبرائے ہوئے آپ کے پاس آئے اور عرض کیا۔ ''حضور والا! ایک خطرہ جام سے چل کر ہرات تک پہنچ چکا ہے اور وہ بہت جلد چشت میں داخل ہونے والا ہے۔ اگر آپ نے اس پر کوئی توجہ نہ فرمائی تو اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کیسا خطرہ، کہاں کا خطرہ، جو کچھ تمہیں معلوم ہے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟''

ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضور والا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی سجادہ نشینی کی خبر سن کر شیخ الاسلام حضرت شیخ احمد جام زندہ فیل، جام سے چشت کے لیے چل چکے ہیں اور ان دنوں ہرات میں مقیم ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ چشت میں داخل ہو کر آپ کو ولایت سے ہٹا دیں اور اس پر خود فائز ہو جائیں حالانکہ ایک دنیا جانتی ہے کہ جو ولایت آپ کو ملی ہے اس کے آپ نہ صرف مستحق تھے بلکہ یہ آپ کا موروثی حق بھی تھا۔''

مودود نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں، فرمایا۔ ''تمہارے اندیشے غلط اور بے بنیاد ہیں، شیخ الاسلام میری تقویت کو آرہے ہیں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

یہ مرید اپنا سا منہ لے کر چلے گئے لیکن چند دنوں بعد پھر حاضر ہوئے اور پہلے سے زیادہ گھبرا کر عرض کیا۔ ''حضور! شیخ الاسلام بالکل قریب آ چکے ہیں۔ ان کے مقابلے کا انتظام کیجیے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ شیخ الاسلام ایک غنیم ہیں جو اپنے ارادت مندوں اور مریدوں کی فوج لیے آپ کے چشت اور ولایت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ وقت بھی خوش فہمی اور تساہل میں گزار دیا تو آپ کی ولایت کا اللہ مالک ہے۔''

آپ نے ان مریدوں کو حکم دیا۔ ''شیخ الاسلام واقعی چشت کے قریب آ چکے ہیں، ہم ان کے چشت میں داخلے سے پہلے ہی مل لینا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کریں گے کہ شیخ الاسلام چاہتے کیا ہیں؟''

چند مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ ان کے مقابلے میں اپنے جاں نثار مریدوں کو روانہ فرما دیں اور اگر آپ واقعی وہاں جانا ہی چاہتے ہیں تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ آپ اپنے ساتھ مریدوں کی بڑی تعداد لے چلیں تا کہ اگر وہاں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آ جائے تو آپ اس کا مقابلہ بھی کر سکیں۔''

مودود نے اپنے چار ہزار مریدوں اور صوفیوں پر مشتمل جمعیت کو ساتھ لیا اور شیخ الاسلام کی پیشوائی کو چل پڑے۔ دوسری طرف یہی منافق شیخ الاسلام کی خدمت میں بھی پہنچ گئے اور ان سے کہا۔ ''حضور والا! کچھ پتا ہے کہ مودود آپ کی نسبت کیا گمان رکھتے ہیں؟''

شیخ الاسلام نے دریافت کیا۔ ''کیا گمان رکھتے ہیں؟''

منافقوں نے جواب دیا۔ ''وہ کہتے تو یہی ہیں کہ وہ اپنے مریدوں اور صوفیوں کے ساتھ آپ کے استقبال کو آ رہے ہیں لیکن بات یہ نہیں ہے۔ ان کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔''

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ''ان کے کیا ارادے ہیں؟''

منافقوں نے جواب دیا۔ ''جناب والا! مودود کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام آخر چاہتے کیا ہیں، کیا وہ میری ولایت پر قابض ہونا چاہتے ہیں؟ اگر ان کے یہ ارادے ہیں تو ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔''

شیخ الاسلام نے انہیں جھڑک دیا بولے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں، تم لوگ منافق ہو اور ہم دونوں کو آپس میں لڑا دینا چاہتے ہو۔''

منافقوں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں کیا ہے، ہم نے جو کچھ حضور کو بتایا ہے نیک نیتی سے بتایا ہے اگر حضور کی سمجھ میں ہماری بات نہیں آتی تو نہ آئے، ہم واپس جاتے ہیں۔''

یہی لوگ مودود کی خدمت میں پہنچ گئے، بولے۔ ''حضرت! ہم لوگ سیدھے شیخ الاسلام کے پاس سے چلے آ رہے ہیں، ان کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے۔''

مودود نے دریافت کیا۔ ''ان کے کیا ارادے ہیں؟ اور تمہارے خیال میں وہ کیا چاہتے ہیں؟''

منافقوں نے جواب دیا۔ ''شیخ الاسلام خود تو نہیں ان کے بعض مرید یہ بتا رہے تھے کہ اب دیکھنا ہے خواجہ مودود کس طرح اپنی ولایت پر فائز رہتے ہیں۔ آخر وہ شیخ الاسلام شیخ احمد کے مقابلے میں ہیں کیا۔''

مودود نے انکساری سے جواب دیا۔ ''اگر شیخ الاسلام کا میری بابت واقعی یہ خیال ہے تو میں بھی یہی کہوں گا کہ میں ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔''

منافقوں نے کہا۔ ''حضرت! اس پسپائی سے کام نہیں چلے گا، آپ کو ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔''

مودود نے بیزاری سے کہا۔ ''تم لوگ چپ رہو، جیسا مناسب سمجھوں گا کروں گا۔''

دونوں بزرگ اپنے اپنے ساتھیوں اور مریدوں کے ساتھ ماران اور سافلان کے درمیان پہنچ گئے۔ یہاں ان دونوں کے درمیان دریائے ٹونک حائل تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ شیخ الاسلام نے باآواز بلند مودود کو مخاطب کیا۔ ''ابن ابو یوسف! ہم ایک طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک آ گئے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں دریا عبور کر کے تمہارے پاس آ جاؤں یا تم خود آنا پسند کرو گے؟''

شیخ الاسلام کو منافقوں نے ورغلایا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ہماری بات سمجھتے کیوں نہیں، خواجہ مودود کے ساتھ چار ہزار آدمیوں کی موجودگی کیا خطرے کی علامت نہیں ہے؟''

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ''تم لوگ بکواس بند کرو، ہمیں معلوم ہے کہ خواجہ مودود کیا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ چار ہزار مریدوں کی موجودگی کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتی۔''

دوسری طرف خواجہ مودود نے جواب دیا۔ ''حضرت آپ اتنی طویل مسافت طے کر کے اس ناچیز کی خاطر تشریف لے آئے ہیں اس لیے اب یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ کو مزید زحمت دی جائے۔''

ادھر بھی منافق موجود تھے، انہوں نے خواجہ مودود کو ورغلایا۔ ''حضرت آپ کیا غضب فرما رہے ہیں، ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیے گا۔ آپ شیخ الاسلام کو طلب فرمائیے خود ادھر ہرگز نہ جائیے ورنہ آپ سمجھ لیجیے کہ آپ کی ہر چیز خطرے میں ہے۔ ولایت، مرتبہ، اعزاز اور احترام، شیخ الاسلام آپ کا سب کچھ چھین لیں گے۔''

خواجہ مودود نے انہیں ڈانٹا، بولے۔ ''تم لوگ اپنی بکواس بند کرو، اللہ تعالیٰ انہیں سخت ناپسند کرتا ہے جو دو دلوں میں نفرت اور

نفاق کا بیج بوتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک وہ پسندیدہ ہیں جو دودلوں میں محبت اور اتفاق پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔"

دوسری طرف شیخ الاسلام کی آواز آئی۔ "تب پھر دیر مت کرو اور ہمارے پاس چلے آؤ۔"

خواجہ مودود نے جواب دیا۔ "حضرت! ناچیز آرہا ہے۔ انتظار فرمائیں۔" اس کے بعد آپ نے مریدوں سے کہا۔ "میں شیخ الاسلام کے پاس جارہا ہوں۔"

یہ کہہ کر خواجہ مودود پانی میں اتر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا کے اس پر پہنچ گئے۔ شیخ الاسلام آپ کے استقبال کو آگے بڑھے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے مرید بھی خواجہ مودود کے قریب پہنچ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ ضرور پیش آئے گا لیکن شیخ الاسلام نے اپنے مریدوں کو مخاطب کیا۔ "تم لوگ خواجہ مودود سے دور رہو کیونکہ اب تک منافقوں نے جو کچھ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے وہ سب غلط ہے، خواجہ مودود کا ملانِ روزگار میں سے ہیں۔" خواجہ مودود نے فرطِ محبت میں شیخ الاسلام کو سینے سے لگالیا۔

خواجہ مودود کے مرید دوسرے لوگ مختلف ذریعوں اور طریقوں سے دریا عبور کررہے تھے۔ شیخ الاسلام نے مسکرا کر کہا۔ "منافق کہتے تھے کہ تم ہم سے جنگ کرنے آرہے ہو اور مریدوں کی یہ کثیر تعداد تمہاری سپاہ ہے۔"

خواجہ مودود نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "اور یہی منافق مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کررہے تھے کہ آپ میری ولایت پر قبضہ کرنے کی غرض سے تشریف لارہے ہیں۔"

دونوں بزرگ کچھ دیر منافقوں کی شرارت پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر خواجہ مودود نے کہا۔ "آپ ہمارے مہمان ہیں اس لیے غریب خانے پر تشریف لے چلیں۔"

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ "ہم تو تم سے ملاقات کرنے آئے تھے سو ملاقات ہوگئی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" خواجہ مودود نے کہا۔ "آپ اس ناچیز کے غریب خانے پر ضرور تشریف لے چلیں وہیں ہمارے خواجگان کی زیارت بھی کرلیجیے گا۔"

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ "نہ بابا ہمارے آنے کا مقصد تم سے ملاقات کرنا تھا جو بہت اچھی طرح پورا ہوچکا ہے اب رہا تمہارے خواجگان کی زیارت کرنے کا مسئلہ تو وہ ہمیں یہیں سے حاصل ہورہی ہے کیونکہ اولیا اللہ کی ارواح کا تصرف اور ان کی ولایت کا اثر ہر جگہ ہے میں جہاں سے چاہوں ان کی زیارت کرسکتا ہوں۔"

اس کے بعد شیخ الاسلام نے چشت کی طرف منہ کرکے فاتحہ پڑھی اور خواجہ مودود سے کہا۔ "بابا مودود! تم میرے ساتھ چلو، ہم دونوں وہیں چل کر قیام کرتے ہیں۔"

خواجہ مودود نے کہا۔ "کہاں؟"

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ "جہاں ہم لے چلیں۔"

اس کے بعد یہ دونوں ایک طرف چل دیے۔ ان کے ساتھ ساتھ دونوں کے مرید اور ساتھی بھی چل رہے تھے۔ راستے میں شیخ الاسلام کے ایک معتقد خواجہ علی حکیم کا گھر پڑتا تھا۔ شیخ الاسلام ان کے گھر ٹھہر گئے۔ یہاں دونوں بزرگ سماع میں مشغول ہوگئے۔ اس چھوٹے سے گھر میں دونوں بزرگوں کے مرید تو نہیں ٹھہر سکتے تھے اس لیے شیخ الاسلام کے خادم نے حاضر ہوکر دریافت کیا۔ "حضور والا! ہم پڑاؤ کہاں ڈالیں؟"

آپ نے معنی خیز جواب دیا۔ "ابھی ٹھہرو، مہم درپیش ہے۔" پھر رات ہوگئی اور دونوں بزرگ پھر سماع میں مشغول ہوگئے۔ رات کی تاریکی میں کئی سائے آہستہ آہستہ مجلس سماع کی طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیغ وخنجر تھے۔ انہوں نے اپنے چہروں کو رومالوں میں چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے مجلس میں گھستے ہی شیخ الاسلام پر اپنے ہتھیاروں سے حملہ کردینا چاہا لیکن خواجہ مودود تڑپ کر ان کے درمیان آگئے اور غصے میں فرمایا۔ "نابکار! یہ کیا کررہے ہو۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی؟"

حملہ آوروں نے خواجہ مودود کی طرف دیکھا تو ان کے ہوش ہی باقی نہ رہے اور وہ بے دم ہوکر ڈھیر ہوگئے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی دونوں بزرگ پھر سماع میں مشغول ہوگئے اور یہ منافق یہیں بے ہوش پڑے رہے۔ مجلس سماع کے خاتمے پر شیخ الاسلام نے ان منافقوں کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا۔ "مودود یہ کیا معاملہ ہے، یہ کون لوگ ہیں؟"

خواجہ مودود نے جواب دیا۔ "حضرت! یہ وہی منافق ہیں جو ہم دونوں کو آپس میں لڑادینا چاہتے تھے لیکن جب اپنے مقصد میں ناکام رہے تو دھوکے سے آپ کو قتل کروانے کا منصوبہ بناڈالا اور میں نے انہیں عین حملے کے دوران میں بے ہوش کرکے گرادیا۔"

شیخ الاسلام نے رنج اور افسوس سے انہیں دیکھا اور فرمایا۔ ''بابا مودود! ان لوگوں نے جو کچھ کیا، اس کی سزا بھگتی، اب انہیں معاف کردو۔''

خواجہ مودود نے جواب دیا۔ ''بابا شیخ الاسلام! اب بدبختوں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ آپ کے خلاف تھا اس لیے میں معاف کرنے والا کون؟ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے میں کس طرح معاف کرسکتا ہوں۔''

شیخ الاسلام نے ان کے چہروں کو دیکھا وہ سیاہ ہو رہے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ انہیں ان بدبختوں کے حال پر بڑا رحم آیا، بولے۔ ''میں ان کا قصور معاف کرتا ہوں، اب تم بھی معاف کردو۔''

خواجہ مودود نے کہا۔ ''جب آپ نے معاف کردیا تو میں بھی معاف کرتا ہوں۔''

ابھی یہ جملہ پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ سارے منافق ہوش میں آگئے اور ان کے چہرے پہلے جیسے ہوگئے، ان کے منہ سے بہتے ہوئے جھاگ بند ہوگئے۔ منافق ہوش میں آتے ہی دونوں بزرگوں کے قدموں میں گر گئے اور دیر تک اپنی غلطیوں اور شرارتوں کی معافی مانگتے رہے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام نے خواجہ مودود سے کہا۔ ''بابا مودود! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، وہ یہ کہ علم کے بغیر درویشی بے معنی چیز ہے۔ تم علم معرفت میں جتنا کمال چاہو حاصل کرلو لیکن یاد رکھو کہ علم ظاہری کے بغیر کام نہیں چلتا۔ درویش کے لیے ضروری ہے کہ وہ ظاہری اور باطنی دونوں ہی علوم حاصل کرے اس سے درویش کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کا ظاہر اور باطن یکساں ہوجاتا ہے۔''

خواجہ مودود نے عقیدت مندی سے سر جھکا دیا اور عرض کیا۔ ''حضور والا کی نصیحت میں نے گرہ سے باندھ لی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی جلدی علم ظاہر حاصل کرتا ہوں۔''

شیخ الاسلام جام واپس چلے گئے اور خواجہ مودود نے چشت کا رخ کیا۔

☆☆☆

آپ اسی سال بلخ روانہ ہوگئے۔ وہاں کے عوام و خواص نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور انہیں نہایت عزت و احترام سے شہر کے اندر لے گئے۔ شہر کے امرا، مشائخ اور اکابران کی خدمت گزاری میں لگ گئے۔ اس قدر و منزلت نے شہر کے علما میں حسد پیدا کردیا۔ انہوں نے شہر والوں کو ورغلانا شروع کردیا۔

چند عالموں نے خواجہ مودود کے عقیدت مندوں سے پوچھا۔ ''آخر تم لوگوں نے اس شخص میں کیا خوبی دیکھی ہے جو دن رات اسی کے قصیدے پڑھتے رہتے ہو؟''

عقیدت مندوں نے جواب دیا۔ ''ہمیں ان جیسی عظیم ہستی دوسری نظر نہیں آتی اور ان کی ذات میں کچھ ایسی دلکشی پائی جاتی ہے جس کا لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن اس کا اثر محسوس ضرور کیا جاسکتا ہے۔''

عالموں نے ہنس کر کہا۔ ''تم لوگ بہت بھولے ہو ہم سیدھی سی بات یہ جانتے ہیں کہ یہ شخص بہت چالاک ہے اور تم جیسے بھولے بھالے لوگوں کو ورغلانے آگیا ہے۔''

لوگوں نے غصے میں کہا۔ ''آپ لوگ حضرت خواجہ کی شان میں گستاخی نہ کریں ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔''

عالموں نے کہا۔ ''اچھا ایک بات کا جواب دو۔''

لوگوں نے کہا۔ ''پوچھو۔''

علما نے کہا۔ ''کسی شخص کا جب تک امتحان نہ لیا جائے، اس وقت تک اسے کامل کس طرح سمجھ لیا جائے ہم چاہتے ہیں کہ اس شخص سے اس کے کمال کی نشانیاں کرامات کی شکل میں طلب کریں، اگر یہ شخص اس امتحان میں پورا اتر جائے تو خیر ورنہ اسے شہر بدر کروا دیا جائے۔'' سادہ لوح عوام نے علما کے اس منصوبے کو مان لیا۔

جمعے کے دن بلخ کی جامع مسجد میں بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ ان میں خاص و عام شہریوں کے علاوہ تقریباً چار سو علما اور مفتیان بلخ بھی موجود تھے۔ خواجہ مودود بھی جمعے کی نماز پڑھنے تشریف لائے۔

جب آپ نماز پڑھ چکے تو مخالفین کی جماعت آپ کے آس پاس جمع ہوگئی اور مختلف علوم و فنون پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ آپ نے ان سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیے۔ جب یہ لوگ عاجز آگئے تو آخر میں سوال کیا۔ ''حضرت! بس ایک آخری سوال۔ آپ جانتے ہیں کہ سماع کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے اور ابھی ابھی سوال و جواب سے آپ کی علمی فضیلت اچھی طرح ثابت ہوچکی ہے پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسی عالم و فاضل شخصیت سماع جیسے غیر شرعی اور غیر اسلامی فعل کو کیوں پسند کرتی ہے اور اس

میں خود کو مشغول رکھتی ہے؟''
خواجہ مودود نے پوچھا۔''ابراہیم بن ادھم سے تو تم لوگ خوب اچھی طرح واقف ہو؟''
ان لوگوں نے جواب دیا۔''خوب اچھی طرح لیکن ان کا اس جگہ کیا ذکر ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔''ان کا میں ذکر کیوں کر رہا ہوں، اس کا جواب بعد میں دوں گا پہلے تم مجھے یہ جواب دو کہ تم ابراہیم بن ادھم کو جانتے ہو یا نہیں؟''
انہوں نے جواب دیا۔''ابراہیم بن ادھم کو کون نہیں جانتا وہ بلخ کے حکمراں تھے اور انہوں نے درویشی کی خاطر تاج و تخت کو لات ماردی۔''
آپ نے کہا۔''وہ بھی سماع سے بڑی رغبت رکھتے تھے اور پھر ہمارے وہ پیر، جن کا دور تک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے اور جو علوم ظاہری و باطنی میں عدیم المثال کمال رکھتے تھے اور جن سے خلاف شرع کوئی فعل سرزد نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے سماع کو بدعت یا حرام نہیں قرار دیا اور ہمیشہ اس کے پابند رہے۔ پھر ہم، جو انہی کے مرید اور عقیدت مند ہیں اور ان کی پیروی کو فرض سمجھتے ہیں کس طرح سماع سے باز آجائیں؟''
علما نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔''تمہارا ابراہیم بن ادھم سے کیا مقابلہ۔ وہ کاملین روزگار اور مجتہدین عصر میں سے تھے۔ کیا تم نے یہ سنا کہ جب وہ سماع سنتے تھے تو ان پر بعض اوقات ایسی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی کہ وہ حالت وجد میں کئی کئی ہاتھ زمین کے سہارے کے بغیر ہوا میں معلق ہو جاتے تھے اور اسی معلق حالت میں وہ پرواز کرنے لگتے تھے۔ کیا ان کے بعد کسی نے بھی یہ کیفیت طاری کر کے دکھائی ہے؟ کیا تم جو ان کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہو ایسا کر سکتے ہو؟''
خواجہ مودود نے انکساری سے جواب دیا۔''میں ان کی متابعت کا دعویٰ تو خیر کیا کروں گا بلکہ یہ سمجھ لو کہ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ابراہیم بن ادھم کا ادنیٰ سا عقیدت مند ہوں اور اسی عقیدت مندی نے مجھ میں وہ وصف پیدا کر دیا ہے کہ میں انہی کی طرح ہوا میں معلق ہو کر پرواز کرنے لگوں۔''
اس کے بعد آپ اچانک زمین سے بلند ہوئے اور کسی سہارے کے بغیر ہوا میں رک گئے پھر ہوا میں ہی شمال سے جنوب میں پرواز کی، لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ دیر بعد آپ زمین پر واپس آ گئے۔ لوگوں پر سکتے نے موت جیسی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس مسجد میں تقریباً دس ہزار آدمی موجود تھے۔ یہ سارے ہی آپ کے مرید ہو گئے لیکن دس ہزار کے علاوہ چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہ طے کر چکے تھے کہ خواجہ مودود کی بہر حال مخالفت کی جائے گی، وہ کیسا ہی کمال دیں، کیسی ہی کرامت پیش کر دیں، وہ ان کی ہر حال میں مخالفت کریں گے۔
ان مخالفین میں سے چند نے ہٹ دھرمی سے کہا۔''اس قسم کے شعبدے تو کافر جوگی بھی دکھا دیا کرتے ہیں۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم نے دکھایا وہ رحمانی ہے یا شیطانی؟''
ان لوگوں نے کہا۔''ذرا ہمارے ساتھ مسجد کے باہر تک آؤ۔'' آپ خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لیے۔ مسجد کے باہر ایک چٹان سی پڑی ہوئی تھی۔ آپ کے حاسد مخالفوں نے کہا۔''جناب! یہ ایک پتھر ہے جسے پچاس ساٹھ آدمی مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے اگر تم اسے اٹھا دو اور اس سے اپنی صداقت اور سچائی کی گواہی دلوا دو تو ہم سب تم پر ایمان لے آئیں گے۔''
آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کے عرض کیا۔''الٰہ العالمین! یہ لوگ اسی طرح مجھ ناچیز سے کرامتیں مانگ رہے ہیں جس طرح تیرے نبیوں سے ان کی قومیں معجزات طلب کرتی ہیں، میری عزت و آبرو تیرے ہی ہاتھ ہے۔''
اس کے بعد آپ نے اس پتھر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہلایا۔ جو نہیں ہلا پھر ہلایا، پھر نہیں ہلا۔ آخر آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس پتھر کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ ان لوگوں کے منہ سے واہ و تحسین کے کلمات نکل گئے۔ آپ اس پتھر سے ذرا دور جا کھڑے ہوئے اور اسے حکم دیا۔''میں تجھ سے اپنی صداقت کی گواہی چاہتا ہوں۔''
پتھر اسی طرح لڑھکا جس طرح کوئی جاندار شے لڑھکا کرتی ہے۔ یہ لڑھک کر ان سب کے قریب پہنچا تو انہوں نے ادھر ادھر ہٹ کر اپنی جانیں بچائیں، آپ نے پوچھا۔''تم لوگ بھاگ کیوں رہے ہو؟''
''واہ جناب واہ! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم سب اس کے نیچے دب کر اپنی جانیں دے دیں؟''
''نہیں، ہم یہ نہیں چاہتے لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ آپ لوگ بھی سیدھے سچے مسلمان بن جائیں۔''
لوگوں نے کہا۔''ہم سب مطمئن اب بھی نہیں ہیں اور اس وقت تک ہم کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں جب تک کہ یہ پتھر

تمہاری گواہی نہ دے دے۔"
اس کے بعد آپ نے پتھر سے کہا۔"اے پتھر! یہ لوگ میری بزرگی اور عظمت کا لوہا نہیں مانتے۔ تو ان پر آج کسی طرح بھی یہ ثابت کردے کہ میں شیطانی طاقت نہیں رکھتا۔"
پتھر ایک بار پھر ہوا میں معلق ہوا اور کسی انسانی آواز نے کہا۔"تم لوگ خواجہ مودود سے کرامتیں چاہتے ہو؟ حالانکہ خواجہ مودود وہ ذات ہے جس کی بزرگی اور عظمت کے چرند، پرند گیت گاتے ہیں۔ لوگو! خواجہ مودود ولی اللہ ہیں اور ان کے قول و فعل میں شرعی مطابقت ہوتی ہے۔"
آپ کے حاسد اور مخالف خوف زدہ اور شرمندہ ہو کر قدموں میں گر گئے اور معافی کے طلب گار ہوئے۔ آپ نے انہیں معاف کر دیا۔
اس کے بعد آپ نے بلخ کو چھوڑا اور بخارا روانہ ہو گئے۔ راستے میں پھر دریا ملا، ملاح کشتیوں کے ذریعے لوگوں کو پار اتار رہے تھے۔ خواجہ مودود کے ساتھ مریدوں اور صوفیوں کی کثرت تھی اس لیے ملاحوں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آپ دیر تک اس انتظار میں کھڑے رہے کہ ملاح ان پر توجہ دیں تو ان سے پار اترنے کی اجرت معلوم کی جائے لیکن ملاح دوسرے مسافروں میں الجھے رہے۔ آپ نے ایک ملاح سے کہا۔"بابا! کچھ ہم پر بھی توجہ دو، ہم بھی اس پار جانا چاہتے ہیں۔"
ملاح نے بے پروائی سے جواب دیا۔"یہاں تو سبھی اس پار جانے کے لیے جمع ہوئے ہیں، خاموش کھڑے رہو ہم خود تمہیں بلا لیں گے فکر مت کرو۔"
آپ کو ملاح کی بات بری لگی۔ آپ نے اپنے مریدوں اور صوفیوں کو مخاطب کیا۔"دوستو! ہم کشتیوں کا کہاں تک انتظار کریں گے۔ اللہ کا نام لے کر ہم اپنا گھوڑا دریا میں ڈالتے ہیں تم بھی ہماری پیروی کرو اور ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ، اللہ نے چاہا تو ہمارے جانور ہی کشتی کا کام کریں گے اور ہم خیریت کے ساتھ اس پار پہنچ جائیں گے۔"
ملاحوں نے ان کی یہ بات سنی تو ہنسنے لگے۔ ایک نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔"بھائیو! سنا کچھ۔ یہ صاحب اپنے جانوروں کو کشتی بنانے کا حکم دے رہے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ دریا کا دھارا کتنے زوروں پر ہے۔ یہ حضرت خود بھی ڈوبیں گے اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی غرق کروا دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا، اس کے ساتھ ہی دوسرے ملاح اور مسافر بھی ہنس دیے۔
آپ نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، آپ کے پیچھے پیچھے مریدوں اور صوفیوں نے بھی اپنے گھوڑے پانی میں اتار دیے۔ گھوڑے پانی میں کچھ اس طرح تیر رہے تھے گویا ان کے پیروں میں چپو باندھ دیے گئے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سب دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ کسی ایک کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تھوڑی دیر پہلے جو ملاح ان کی ہنسی اڑا رہے تھے اب وہ حیرت زدہ اور شرمندہ ہو کر خود کو اس قابل نہ سمجھ رہے تھے کہ آپ کے پاس جا کر معافی مانگتے اور اپنی شرمندگی کا اظہار کرتے۔ جس ملاح نے آپ کی ہنسی اڑائی تھی اور قہقہہ مار کر ہنس دیا تھا۔ کشتی کو کھیتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچا اور کشتی سے پھلانگ کر ساحل پر اترا اور آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ آپ کی رحم دلی یہاں بھی عود آئی اور آپ نے اسے معاف کر دیا۔

☆☆☆

آپ نے بخارا شیخ المشائخ نجم الدین عمر سے فقہ کی تکمیل کی۔ ان کے ہم سبق شاگردوں میں ایک شخص انسانوں سے مختلف تھا۔ آپ کی اس سے گہری دوستی ہو گئی۔ اس گہری دوستی کے باوجود آپ نے یہ محسوس کیا کہ وہ آپ کو اپنا گھر نہیں دکھانا چاہتا۔
ایک دن آپ خود ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ جگہ بخارا کے نواح میں تھی اور دور تک کھنڈرات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے ان کھنڈرات میں داخل ہو کر اپنے ہم سبق کو آواز دی تو ایک بل سے ایک خوب صورت سانپ نکلا اور لوٹ پوٹ کر انسانی روپ میں تبدیل ہو گیا۔ آپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔"ہم نے تمہیں بہت پہلے پہچان لیا تھا لیکن تم اپنے دوست سے بھی پردہ رکھنا چاہتے تھے اور یہ بات دوستی کے منافی ہے۔"
اس نے جواب دیا۔"میں بھی اس بات سے واقف تھا کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے اس لیے خاموش رہا ورنہ کب کا بتا چکا ہوتا۔"
آپ نے پوچھا۔"تم جنوں کے بادشاہ ہونا؟"
اس نے شرمندگی سے جواب دیا۔"جی ہاں۔"

معلوم ہو چکا ہے اب اس شناسائی کا ہمیشہ اظہار کس طرح ہوتا رہے گا؟"
اس نے جواب دیا۔ "میں اپنی قوم کے لوگوں کو یہ حکم دیے دیتا ہوں کہ وہ کبھی بھی آپ کی نسل کے کسی شخص کو نہ ستائیں اور آپ بھی مطمئن ہو جائیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اس وقت تک عمل ہوتا رہے گا جب تک اس زمین پر ہم دونوں کی نسلیں موجود ہیں۔"

بخارا میں بھی آپ کا بہتوں سے مباحثہ ہوا اور آپ نے اپنے ہر مقابل مخالف کو پُرزور دلائل اور براہین سے لاجواب اور خاموش کر دیا۔

آپ تحصیلِ علوم کے بعد اپنے وطن چشت واپس آ گئے اور لوگوں کو رشد و ہدایت فرمانے لگے۔ آپ کی مجلسوں میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور وہ اس طرح خاموشی سے آپ کے مواعظ سنتے کہ گمان گزرتا، گویا وہاں خواجہ مودود کے علاوہ کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

ایک دن اس مجلس میں ایک اجنبی نوجوان داخل ہوا۔ اس نے درویشی کا خرقہ پہن رکھا تھا اور سجادہ بغل میں تھا۔ وہ آتے ہی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ دورانِ وعظ آپ کی نظر اس نوجوان پر پڑ گئی۔ آپ نے وعظ بند کیا اور فرمایا۔ "تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟"

یہ نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قریب چلا گیا، بولا۔ "بہت دنوں سے ایک سوال میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ کیا آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں گے؟"

آپ نے کہا۔ "پوچھو، کیا سوال ہے؟"

نوجوان نے کہا۔ "رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

آپ نے نوجوان کے سراپا کا جائزہ لیا اور جواب دیا۔ "نوجوان! اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنا زنار توڑ دو اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آؤ، مومن بن جاؤ۔"

نوجوان نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ نعوذ باللہ زنار اور میرے پاس، آپ مجھے اتنے بہت سارے حاضرین میں ذلیل و رسوا کیوں کر رہے ہیں؟"

آپ نے ایک خادم کو اشارہ کیا۔ "تم ادھر آؤ میرے قریب۔"

یہ خادم آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے حکم دیا۔ "اس نوجوان کا خرقہ اتار دو۔"

خادم نے حکم کی تکمیل کی اور نوجوان کا خرقہ اتار دیا۔ خرقے کے دور ہوتے ہی اندر سے زنار نکل آیا۔ نوجوان شرم سے پانی پانی ہو گیا اور زار و قطار رونے لگا۔

آپ نے فرمایا۔ "روتے کیوں ہو؟ زنار توڑ دو اور مسلمان ہو جاؤ۔"

نوجوان نے اسی وقت زنار توڑ دیا اور آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور خجالت سے کہا۔

"آج میں مومن کی فراست کا قائل ہو گیا۔ اس حدیث کی اس سے بہتر تشریح اور توضیح نہیں ہو سکتی۔"

☆☆☆

آپ کو سماع کا اتنا شوق تھا کہ اس کا بڑا اہتمام فرماتے اور اس محفلِ سماع میں اس وقت کے بڑے بڑے لوگ شریک ہوتے، طرح طرح کے کھانے پکتے اور آنے والوں کو کھلائے جاتے۔ مجلسِ سماع کا آغاز اور اختتام تلاوت کلام پاک سے ہوتا۔ سماع کے دوران خواجہ مودود کی عجیب حالت ہو جاتی۔ کبھی یہ روتے روتے بے حال ہو جاتے، کبھی متبسم ہو جاتے اور کبھی آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ کبھی کیف و مستی کی یہ حالت ہو جاتی کہ منہ سے کف جاری ہو جاتا۔

ایک بار اسی طرح محفلِ سماع گرم تھی کہ حاضرینِ محفل نے دیکھا کہ خواجہ مودود ان کی نظروں سے ایک دم اوجھل ہو گئے۔ آپ کافی دیر تک محفل سے غائب رہے اور پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ جس جگہ سے غائب ہوئے تھے آہستہ آہستہ بتدریج اسی جگہ پر دوبارہ نمودار ہو گئے۔

ایک معتقد سماع کے اختتام پر آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "حضرت! یہ سماع کے دوران آپ غائب کہاں ہو گئے تھے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "عزیز من! تمہیں یہ راز نہیں معلوم کہ صاحبِ سماع محو کا نورانی لباس زیب تن کر لیتا ہے اور سب سے بیگانہ ہو کر محبوب کے ساتھ یگانہ ہو جاتا ہے۔ محبوبِ حقیقی اسے اپنا لباس پہنا کر اپنے ہی جیسا بنا لیتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ تم لوگوں کو کس طرح نظر آ سکتا ہے؟"

کی تیمارداری اور دیکھ بھال کا فریضہ سنبھالنا تھا لیکن آج رات مس ریڈنگ کی موجودگی ضروری نہیں تھی۔ ایک تو اس لیے کہ ولبر مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ نرس اب اس کے سرہانے بیٹھ کر سوائے اس کی آخری سانس کا انتظار کرنے کے اور کیا کرسکتی تھی؟ یہ کام میرینا اپنی فطرت کے خلاف خود کرنا چاہتی تھی۔ ولبر کی زندگی کی آخری گھڑیوں میں وہ خود کو اس کے قریب رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے فون کر کے مس ریڈنگ کو آج رات آنے سے منع کر دیا۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ ولبر کی سانسیں مدھم ہوتی جارہی تھیں۔ میرینا تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ اٹھا کر اس کلاک کی طرف دیکھ لیتی تھی جس میں وہ ہمیشہ آدھا گھنٹے آگے کا وقت سیٹ کر کے رکھ لیتی تھی۔ اس طرح ولبر کو اس کی تمام تر سستی کے باوجود وقت پر تیار کروا کر کام پر بھیجنے میں آسانی رہتی تھی۔

رات گہری ہونے پر میرینا کو بار بار اونگھ آنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور گردن آگے جھکنے لگتی تو وہ ہڑبڑا کر سنبھل جاتی ۔ ایسے ہی ایک جھٹکے کے دوران میں اس نے ولبر کو انگڑائی لیتے اور پھر اٹھ کر بیٹھتے دیکھا۔

''ہیلو میرینا۔'' اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔''میں کہاں ہوں؟''

میرینا کا منہ کھلا مگر زندگی میں پہلی مرتبہ یہ اتفاق ہوا کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ ولبر نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کی حرکات وسکنات میں صرف معمولی سی نقاہت نظر آرہی تھی۔''اوہ مجھے یاد آیا میں بیمار تھا، ہے نا؟''

میرینا اب بھی خاموش تھی۔ ولبر پر تین دن سے مکمل سکتہ طاری تھا اور تقریباً ایک ہفتے سے اس نے بات نہیں کی تھی اور اب وہ بڑے آرام سے پلنگ پر بیٹھا روشن آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''تت...... تم کیا محسوس کر رہے ہو ولبر؟'' بالآخر میرینا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''میں صرف بھوک محسوس کر رہا ہوں ۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے میرینا؟''

میرینا کرسی کا سہارا لے کر بہ مشکل اٹھی تو وہ بولا۔ ''میرے لیے کچھ چانپیں تل لاؤ اور ہاں بیئر کی ایک بوتل بھی لے آنا۔''

میرینا کمرے سے نکلی تو عقب میں ولبر نے ہانک لگائی۔''دیکھنا شاید فریج میں مرغ کی ران بھی موجود ہو۔''

میرینا حواس باختہ ہو کر فریج سے کھانے پینے کی چیزیں نکالنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس بیماری میں کوئی مریض کچھ عرصے کے لیے جانبر بھی ہوجاتا ہے لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کوئی مریض ولبر بھی تو ہوسکتا ہے اور اب میرینا کو کئی ایسی مثالیں یاد آرہی تھیں جب ڈاکٹروں نے کئی مریضوں کے بارے میں حتمی فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچ سکتے مگر ہوا یہ تھا کہ مریض تو بھلے چنگے ہو کر اٹھ بیٹھے اور ڈاکٹر ملک عدم کو سدھار گیا۔

میرینا نے بے دھیانی کے عالم میں کچھ چیزیں الٹی سیدھی تیار کر کے ٹرے میں رکھیں اور ولبر کے کمرے کی طرف چل دی۔ اس کا ذہن ان متوقع پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا جو حالات کے اس طرح پلٹا کھانے کی وجہ سے پیش آنے والی تھیں۔ اس نے تمام انتظامات شیڈول کے مطابق بڑے نظم وضبط سے مکمل کیے تھے مگر ولبر کی موت کی حسرت سے بے وقت واپسی نے سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ رشتے داروں کو آنے سے روکا جاسکتا۔ اب تک تو وہ یقیناً اپنے گھروں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ کل تک گھر مہمانوں سے بھر جاتا تھا۔ اب انہیں جنازے کے انتظار میں ہفتہ دو ہفتہ یا اس سے زیادہ تو نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کہاں سے ہوتا؟ اس کے بیٹے اور داماد کو اتنی لمبی چھٹی کیسے ملتی؟ ادھر پھولوں کی دکان والا بھاری مقدار میں پھولوں کا آرڈر بذریعہ تار شہر روانہ کر چکا تھا اور تو اور اب وہ اخبار بھی چھپنے کے لیے پریس جاچکا تھا جس میں ولبر کے جنازے کی خبر شائع ہو رہی تھی۔

شدید پریشانی اور صدمے کی حالت میں وہ ٹرے اٹھائے ولبر کے قریب آئی اور ٹرے تپائی پر رکھ دی۔ ولبر اس کی طرف سادگی سے دیکھ کر مسکرایا۔''واقعی بڑی بھوک لگی ہے۔''

''لیٹ جاؤ ولبر۔'' میرینا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی تم بہت کمزور ہو۔''

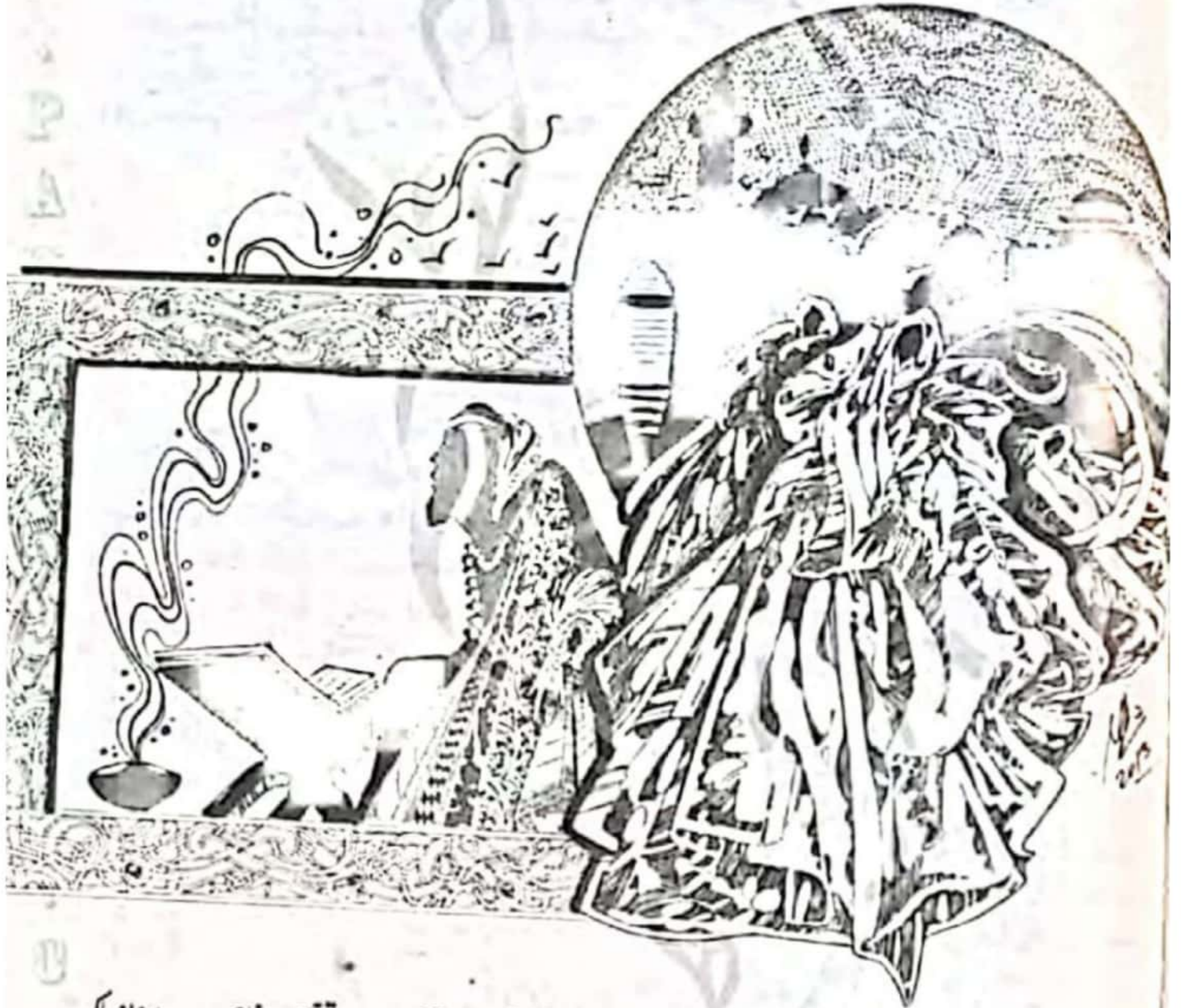
وہ سعادت مندی سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ میرینا نے دوسرا تکیہ اٹھایا اور اس کی گردن پر رکھ کر پوری طاقت سے دبانے لگی۔ ولبر نے کمزور سے انداز میں مزاحمت کی۔

''ہلنے جلنے کی کوشش مت کرو۔'' وہ غرّائی۔''غضب خدا کا اگر میں نہ ہوتی تو تم نے خود اپنے جنازے میں تاخیر ہی کر دینی تھی۔ ہر کام میں دیر کرنے کی تمہاری پرانی عادت ابھی تک نہیں گئی۔''

ضیا تسنیم بلگرامی

شیخ المشائخ

دنیا کی تاریکی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگ ایسے بھی پیدا کیے جو لہو و لعب سے دور ہو کر روشنی پھیلانے کا سبب بنتے رہے... اور اللہ کے ولی ٹھہرے۔ اس راہ کی کٹھنائیوں کو عبور کرنا خاص الخاص لوگوں کا وتیرہ رہا۔ آپ کا شمار بھی انہی روشن ضمیر انسانوں میں ہوتا ہے جن کا فیض مخلوق خدا کو پہنچتا رہا۔



لوگ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد عبداللہ تکلفات اور تعیشات شاہی سے بے نیاز بلکہ نفور، نفس کشی اور چلوں میں مشغول رہتا ہے۔ ٹاٹ کا لباس زیب تن کیے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے۔ خاندان کے لوگ آپ کے پاس آتے اور کہتے۔ ”عبداللہ! یہ تمہیں کیا سوجھی ہے؟ اللہ نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے لیکن تم نے ٹاٹ کا لباس پہن رکھا ہے۔ کیا یہ کفرانِ نعمت نہیں ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کفران نعمت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضائے جسمانی کو اپنے معبود کی عبادت اور شکر گزاری سے

محروم رکھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسی عقل عطا فرمائی جس سے میں اپنے دنیوی اور آخروی نفع ونقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔''

انہوں نے اپنے کاموں کے لیے ایک آدمی رکھ لیا تھا جو گھر کے کام کے علاوہ آپ کے کھانے کی خاص فکر رکھتا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ جب دن بھر کے روزے کے بعد افطار کا وقت آئے تو خادم گن کر سات منقے دے دیا کرے۔ ایک عرصے تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کی صحت گرتی رہی لیکن آہ نیم شبی میں لذت محسوس ہوتی رہی۔ اس لذت نے ان کے دل سے ضعف و نقاہت کا خیال تک نکال دیا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کی بارگاہ میں گرے ہوئے آہ و زاری میں مشغول تھے لیکن آج روز جیسی لذت اور کیفیت سے وہ محروم تھے۔ وہ جب بھی اپنی زبان سے ''اللہ'' کہتے تو دل میں وہ چمک اور وہ لذت نہیں پیدا ہوتی جو ہمیشہ کا خاصہ تھا۔ ان کا دل سوز دروں سے محروم ہو چکا تھا۔ عبداللہؒ بہت پریشان تھے۔ ان کی تو گویا متاعِ حیات ہی چھن چکی تھی۔ اب ان کا دل اللہ کی یاد میں نہیں، اس میں مشغول تھا کہ اس ستم کا پتا چلایا جائے جس نے ان کی لذت و کیفیت چھین کر انہیں خالی کر دیا ہے۔ انہوں نے رات کے پچھلے پہر اپنے خادم کو طلب کیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آپ کے سامنے آکھڑا ہوا، ادب سے عرض کیا۔ ''خلاف معمول طلبی پر یہ عاجز پریشان اور خوفزدہ ہے۔ اس ناچیز سے کوئی غلطی تو نہیں سرزد ہو گئی؟''

آپ نے دریافت کیا۔ ''میں تجھ سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔''

خادم نے عرض کیا۔ ''یہ میری مجال کہ میں جھوٹ بولوں اور وہ بھی آپ سے، مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ حوصلہ۔''

آپ نے کہا۔ ''آج رات معلوم نہیں کیوں، مجھ پر نیند غلبہ کر رہی ہے اور اعصاب آسودگی سی محسوس کر رہے ہیں۔ میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ ان لذتوں اور کیفیتوں کا مزہ چکھوں، جو ہر رات مجھے حاصل رہی ہیں لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود میں ان سے محروم ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے افطار میں مجھے جو منقے دیے تھے، ان میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا، کوئی تبدیلی کوئی تغیر؟''

خادم سناٹے میں رہ گیا، بڑی بے بسی سے آپؒ کی صورت دیکھنے لگا، بولا۔ ''میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضور کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ اور ضعف و نقاہت سے حضور کی آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہیں اور اوپر کا نصف جسم جھکتا جا رہا ہے۔ میں اس کا اور کوئی علاج تو نہیں کر سکتا تھا، فوری اور قابل عمل جو تدبیر میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں حضور کے منقوں کی تعداد میں نہایت ہوشیاری سے اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منقوں کی تعداد میں ایک معتد بہ اضافہ حضور کی کمزوری اور نقاہت پر غالب آجائے گا۔''

آپ نے غصے میں پوچھا۔ ''تو نے آج افطار میں مجھے کتنے منقے دیے تھے؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''آٹھ منقے آج میں نے ایک کا اضافہ کیا تھا۔''

آپ کو رونا آگیا، گلوگرفتہ آواز میں بولے۔ ''ظالم! تو نے یہ کیا غضب کر دیا؟ تو جانتا ہے اس ایک منقے نے میرے جسم میں کیا فتور کر رکھا ہے۔ میرے اعصاب آرام طلبی میں مبتلا ہیں اور دل و دماغ سو جانے پر مائل ہیں۔ آہ! مجھ سے میری آہ نیم شبی کی لذت اور کیفیت چھن گئی۔ تو نے یہ کیا کر دیا ظالم انسان!''

خادم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ بھی بڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے، آخر فرمایا۔ ''اب جا، آرام کر میں تجھ سے صبح بات کروں گا۔ لیکن صبح مجھ سے یہ امید ہرگز نہ رکھنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گا۔ تو مجھے جسمانی اذیت پہنچاتا تو میں تجھے معاف بھی کر دیتا لیکن تو نے میری زندگی بھر کی کمائی چھین لی، میرا سوز چھین لیا، میری آہ کی لذت لوٹ لی پھر میں تجھے کس طرح معاف کر دوں گا۔''

خادم نے لجاجت سے عرض کیا۔ ''میں نے جو کچھ کیا تھا آپ کی بھلائی کے پیش نظر کیا تھا۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے نادان دوست کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا ہے۔ تو نے جو کام میری فلاح کے خیال سے کیا تھا اس سے مجھے زبردست نقصان پہنچ گیا۔ کل ایسی نوع کا تو کوئی اور کام میری بہبود کی خاطر کرے گا اور اس سے میں بالکل ہی تباہ و برباد ہو گیا تو کیا ہوگا؟ میں نادان دوست کو نہیں برداشت کر سکتا۔''

خادم خوفزدہ و لرزیدہ سامنے سے ہٹ گیا اور آپ پوری قوت ارادی سے خدا سے لو لگاتے رہے لیکن اس وقت ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کسی کسی لمحے سوز دروں کی شمعیں جھلملاتی تھیں اور پھر بجھ جاتیں وہ رونے لگے۔ انہوں نے بارگاہِ ایزدی

میں عرض کیا۔ "اے الہ العالمین! ایک منکے کی اتنی بڑی سزا نہ دے کہ میں اپنی لذت آہ نیم شبی ہی سے محروم ہو جاؤں۔ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں اس غلطی کو نظر انداز فرما دے۔ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

صبح آپؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خادم کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ آپ کو خفیف کہنے لگے۔

توکل اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی سے اپنا کوئی کام نہ کہتے تھے نہ لیتے۔ ہاں دوسروں کا کام البتہ کر دیا کرتے تھے۔ آپؒ نے حج کا ارادہ کیا تو قافلے والوں سے اتنی بے تکلفی اختیار کی کہ صرف پیاس کا خیال رکھا اور کسی چیز کی پروا نہ کی۔ سامان سفر میں ایک ڈول اور ایک رسی ساتھ لی اور حج کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے۔ قافلے والوں کی اتباع، پیروی یا پابندی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ کچھ دور تک تو آپ قافلے کے ساتھ رہے اس کے بعد آپ اس سے الگ ہو گئے۔ بھوک لگتی تو چند منکے کھا لیتے اور پیاس لگتی تو کسی چشمے سے اپنا ڈول بھر کر پیاس بجھا لیتے۔

دوران سفر ایک ایسا مرحلہ بھی پیش آیا کہ کافی دور تک آپ کو کوئی چشمہ نہ ملا۔ پیاس آپ کو تنگ کرنے لگی۔ آپ چشمے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے تھے۔ آخر آپ نے کافی فاصلے پر ایک ہرن کو زمین کی طرف سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہرن پانی پی رہا ہے۔ آپ بے چینی سے اس طرف چل پڑے۔ جب قریب پہنچے تو ہرن ان کی آہٹ محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو نشیب میں ایک چشمہ رواں تھا۔ پانی کی سطح اتنی بلند تھی کہ ڈول رسی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر سطح نیچی ہوتی تو ہرن اپنی پیاس نہ بجھا سکتا۔ آپ نے دونوں ہاتھوں کو چلو بنا کے پانی پینا چاہا لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جیسے جیسے وہ ہاتھ پانی کی طرف لے جاتے تھے، پانی کی سطح نیچے ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کی طرف منہ کے بل کافی جھک گئے اور بڑی کوشش کی کہ پانی پی لیں لیکن پانی تک ان کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ "میرے مولا! یہ ایک اسرار ہے کہ اسی چشمے سے ہرن نے بھی پانی پیا تھا اور اس وقت اس کی سطح اونچی تھی لیکن جب میں نے پانی پینا چاہا تو اس کی سطح حیرت انگیز طور پر نیچی ہوتی چلی گئی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟"

یہ خاموش ہو کر رونے لگے۔ ان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ "اے اللہ! میں اپنی گریہ و زاری کا جواب چاہتا ہوں۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ کیا میرا مرتبہ ہرن سے بھی کم ہے؟"

انہیں اپنے قریب ہی سے جواب ملا، کوئی کہہ رہا تھا۔ "عبداللہؒ! ہرن کے پاس ڈول رسی نہیں تھی اس لیے اس کے لیے پانی کی سطح اونچی کر دی گئی تھی۔ لیکن تو نے ڈول رسی کا سہارا لیا، تو اب رو کیوں رہا ہے؟ گریہ و زاری کیوں کر رہا ہے؟ رسی میں ڈول پھنسا اور بھر لے پانی ہم سے شکوہ کیوں کر رہا ہے؟"

آپؒ نے بڑی ندامت محسوس کی اور ڈول رسی پھینک کر آگے روانہ ہو گئے، بولے۔ "میں پیاسا رہ لوں گا لیکن اب ڈول رسی کا سہارا نہیں لوں گا۔"

ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ پھر آواز سنائی دی۔ "عبداللہؒ! کہاں جاتے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟"

عبداللہؒ بولے۔ "اے اللہ! کیا کسی بندے میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے آقا سے ناراض ہو جائے۔"

آواز آئی۔ "پھر تو پانی پیے بغیر ہی کیوں چل پڑا جبکہ میں جانتا ہوں کہ تو بہت زیادہ پیاسا ہے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "مجھے میری غیرت اور ندامت نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ یہ پانی ہرگز نہ پیوں۔"

جواب ملا۔ "نہیں چشمے پر واپس جا اور پانی پی لے۔ اس طرح تیرے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ چشمے پر واپس جا اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھا۔"

آپ چشمے پر دوبارہ واپس پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا کہ پانی کی سطح اتنی ہی اونچی ہو چکی ہے جتنی ہرن کے پانی پینے کے وقت تھی۔ آپ نے ہاتھ کو چلو بنا کے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پیتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ جب خوب شکم سیر ہو کر پانی پی چکے تو اس پانی سے وضو بھی کیا۔

آپؒ حج سے فارغ ہو کر جب بغداد واپس آئے تو آپ نے اس عہد کے سب بڑے صوفی جنید بغدادیؒ سے ملاقات کی اور ان کے سامنے پانی والا واقعہ دُہرا دیا۔ جنیدؒ نے جواب دیا۔ "عبداللہؒ! اگر تم ذرا سا صبر اور کر لیتے تو چشمہ تمہارے قدموں میں بہنے لگتا۔"

آپ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد فرمایا۔ "جنیدؒ! اگر تمہارے جیسا مشیر اور دوست اس وقت مجھے میسر آجاتا تو آج میں اس سعادت سے بھی ہمکنار ہو چکا ہوتا۔"

☆☆☆

کچھ دن بغداد میں رہنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا۔ "عبداللہؒ! تم کیا مراقبہ کرو گے! میں نے مصر میں ایک نوجوان کو کچھ ایسا مراقبے میں دیکھا کہ حیران رہ گیا۔ اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں۔"

آپ نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا تو مجھے اس شخص کا پتا بتا سکتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟"

اس کے بعد اس شخص نے آپ کو اس نوجوان کا پتا بتا دیا۔ آپ اسی وقت مصر روانہ ہو گئے۔ کافی دنوں بعد سفر کی صعوبتیں اور پریشانیاں جھیل کر جب آپ مصر میں اس نوجوان کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ اس کے آس پاس لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے مگر اس نوجوان کے خضوع وخشوع، انہماک اور مراقبے میں کوئی فرق نہیں آرہا۔

عبداللہؒ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور بہ آواز بلند سلام عرض کیا لیکن اس نوجوان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ عبداللہؒ نے اسے پھر سلام کیا اور نوجوان نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار بھی سلام کیا مگر اس بار بھی جواب سے محروم رہے۔

آپ نے چوتھی بار سلام کیا اور ساتھ ہی کہا۔ "اے نوجوان! ایسا بھی انہماک اور مراقبہ کس کام کا کہ میں سنت رسول ﷺ ادا کر رہا ہوں اور تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا۔"

نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ سے جواب دیا۔ "اے خفیف! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بڑا وقت ہے اور تم اپنے اہم کاموں کو انجام دے کر فرصت حاصل کر چکے ہو حالانکہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے تھا کہ دنیا بہت قلیل اور عمر بہت مختصر ہے۔ اگر تم چاہو تو اس قلت میں سے کثرت حاصل کر لو لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم نے میرے جیسے بےکار آدمی سے ملنے کی خاطر مصر تک کا سفر کیا اور بار بار سلام کر کے اپنا ہی نہیں بلکہ میرا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔"

اتنا کہہ کر اس نے عبداللہؒ کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

جب یہ اس نوجوان کے پاس پہنچے تھے تو ان کا بھوک سے بہت برا حال تھا لیکن نوجوان کے جواب نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ "اے نوجوان! میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔"

دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کی۔ آپ نے اس نوجوان کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری خواہش پوری کی اور دو نمازیں میرے ساتھ ادا کیں۔ اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دے۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "کون سی خواہش؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نصیحت کرے۔"

نوجوان نے کہا۔ "خفیف! جو شخص خود ہی گرفتار بلا ہو، اس کی زبان اس لائق کہاں کہ کسی کو نصیحت کرے۔ میں تو خود ہی ایک عرصے سے یہ امید لگائے ہوئے ہوں کہ کوئی مجھے نصیحت کرے۔"

عبداللہؒ نے کہا۔ "اے شخص! میں کوئی نصیحت سنے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔"

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "خفیف! اس وقت تمہارے اصرار پر میں ایک ہی نصیحت کروں گا، وہ یہ کہ تم ہمیشہ ایسوں کی صحبت اختیار کرو، جن سے خدا کی یاد تازہ رہے اور یہ لوگ ایسے ہوں جو خدا کی یاد کی زبانی تلقین نہ کرتے ہوں بلکہ صحیح معنوں میں عمل کر کے تمہیں اس کا عامل بنا دیں۔"

آپ اس نصیحت پر زار وقطار روئے اور کہا۔ "آہ، میں ایسے دوست کہاں پاؤں گا جو اپنے عمل سے مجھے خدا کی یاد پر ڈال دیں جبکہ میں خود بھی اس راہ کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں۔"

آپ نے واپسی میں ایک جنگل سے گزرتے ہوئے، ایک لاش پڑی دیکھی۔ اس لاش کے آس پاس آہستہ آہستہ لوگ آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے اور پوچھا۔ "یہ کس شخص کی لاش ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "یہ ہمارا راہب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی خدا کی یاد میں گزار دی۔"
آپ نے دریافت کیا۔ "اب اس لاش کا تم لوگ کیا کرو گے؟"
جواب ملا۔ "اس راہب نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی تھی۔ ہم لوگ اسی پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔"
آپ نے تعجب سے پوچھا۔ "اس نے کیا وصیت کی تھی؟"
جواب دیا گیا۔ "اس نے کہا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے دفن کرنے کے بجائے جلا دیا جائے اور میری راکھ کو محفوظ کر لیا جائے اور یہ راکھ ان لوگوں کی آنکھوں میں سرمے کے طور پر لگائی جائے جن کی آنکھیں خراب ہوں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی ہو۔"
آپ نے کہا۔ "لیکن اس عمل کا فائدہ؟"
کسی نے جواب دیا۔ "اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ خراب آنکھ ٹھیک ہو جائے گی اور کور چشم بینا ہو جائیں گے۔"
آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ آپ وہیں کھڑے ہو کر لاش کے جلنے کا منظر دیکھنے لگے۔ لوگوں نے واقعی راہب کی راکھ کو اپنی اپنی شیشیوں میں محفوظ کر لیا۔ آپ ان کی خوش عقیدگی پر افسوس کرتے رہے۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں کو واقعی یقین ہے کہ اس راکھ سے خراب آنکھیں درست اور نابینا بینا ہو جائیں گے؟"
ایک کٹر مسیحی نے طنزاً کہا۔ "تم مسلمان ہو اس لیے تمہیں ہماری باتوں پر یقین نہیں آرہا لیکن میں تمہیں اس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ کرا دوں۔"
وہ مسیحی آپ کو اپنے گھر لے گیا اور میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد اس نے بستی کے ان آدمیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا جن کی آنکھیں خراب تھیں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی۔ بہ مشکل اس نے چار آدمی تلاش کر لیے۔
ان میں تین کی تو آنکھیں خراب تھیں اور ایک اندھا تھا۔
اس مسیحی نے ان چاروں کو عبداللہؒ کے سامنے کھڑا کر دیا، کہا۔ "حضرت! ان چاروں کی آنکھیں ملاحظہ فرمالیں۔ ان میں سے تین کی تو آنکھیں خراب ہیں اور ایک نابینا ہے۔ اب میں اس راکھ کا اثر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"
آپ دم بخود حیرت زدہ یہ تماشا دیکھنے لگے۔
اس مسیحی نے یکے بعد دیگرے خراب آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیریں اور انہیں ایک تاریک کمرے میں جا کر چھوڑ دیا، بولا۔ "جب تک میں بلاؤں نہ، تم تینوں اندر ہی رہو گے۔"
یہ تینوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر میں اس نے نابینا کی آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیر کر انہیں پٹی سے باندھ دیا اور کہا۔ "تم یوں ہی بیٹھے رہو، یہ پٹی میں خود ہی کھولوں گا۔"
عبداللہؒ حیرت سے یہ سب دیکھتے رہے۔ وہ شخص آپ کو لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں ان کی اقامت کا انتظام کر دیا تھا۔ آپ نے شام تک کا وقت بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزارا۔ مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن کی سپیدی کو رات کی چادر نے لپیٹ کر انسانی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس رات آسمان پر بارھویں کا چاند چمک رہا تھا اور چاند کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دمک کمزور کر چکے تھے۔ مسیحی، عبداللہؒ سے باتیں کرتے کرتے اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا۔ "شاید اب وقت آگیا ہے کہ میں ان چاروں کو آپ کے پاس لے آؤں اور راہب کی راکھ کے کرشمے دکھا دوں۔"
آپ نے پوچھا۔ "کیا تیرا یہ خیال ہے کہ وہ فضول راکھ اپنا کام کر چکی ہوگی؟"
مسیحی نے کہا۔ "جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر آپ اس مقدس راکھ کو فضول نہ کہیں۔"
آپ نے آہستہ سے کہا۔ "اگر میری اس بات نے تیرے دل کو دکھ پہنچایا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔"
مسیحی ان تینوں کو کمرے سے باہر لے آیا۔ ان تینوں نے ابھی تک اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مسیحی نے ایک شخص کو عبداللہؒ کے قریب کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا۔ "اے شخص! آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول اور ہمیں بتا کہ اس راکھ نے کوئی اثر کیا یا آنکھیں اب بھی خراب ہیں؟"
اس شخص نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنا شروع کر دیں اور جب اس کی دونوں آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو وہ خوشی میں چیخ اٹھا۔ "آہ، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری آنکھیں بالکل درست ہو چکی ہیں۔"
آپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس شخص سے کہا۔ "اے شخص! تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے یا اپنے مذہب

اور عقائد کی طرفداری میں ایسی بات کررہا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے اور ایسی بات کیوں کررہا ہے لیکن میں اب مسیح علیہ السلام کی قسم کھا کر تجھے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، تو اس کی صداقت پر شک و شبہ نہ کر۔"

اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شخص کی آنکھیں بھی کھلوائی گئیں اور ان دونوں نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی پہلا شخص کرچکا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں ٹھیک ہو چکی تھیں۔

آپ نے اس مسیحی سے کہا۔ "بھائی میں حیران ہوں اور مجھے ان تینوں کی باتوں پر یقین نہیں آرہا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مردے کی راکھ دوا کا کام دے۔"

مسیحی نے جواب دیا۔ "اے مسلمان درویش! مردے کی راکھ کہہ کر ہمارے مقدس بزرگ کی بے حرمتی نہ کیجیے۔ اگر وہ مقدس نہ ہوتا تو کبھی بھی اس کی راکھ میں یہ اثر نہ ہوتا۔"

آپ نے کہا۔ "اب اس نابینا کی پٹی کو کھول کر دکھاؤ۔ اس اعتبار سے وہ گویا بینا ہو چکا ہوگا۔"

"بے شک۔" مسیحی نے جواب دیا۔ "مجھے اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں۔"

اس کے بعد وہ مسیحی اس نابینا کو لے آیا اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹانے لگا۔

ایک آنکھ پر سے ذرا سی پٹی ہٹا کر اس نے کہا۔ "اے شخص! اپنی آنکھ کے گوشے سے دنیا دیکھنے کی کوشش کر، کیا تجھے کچھ نظر آیا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "ہاں، میں اپنی آنکھ کے کھلے ہوئے گوشے سے بادلوں کا جھنڈ دیکھ رہا ہوں یا پھر ایسا ہے کہ میں کہر آلود فضا میں کھڑا ہوں۔"

مسیحی نے پٹی ذرا سی اور کھسکا دی، پوچھا۔ "اور اب؟"

"بادل بدستور موجود ہے، کہر آلود فضا۔"

اس کے بعد مسیحی نے پوری پٹی ہٹا دی۔ نابینا کی بینائی واپس آچکی تھی۔ عبداللہؒ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا مسیحی حق پر ہیں؟ کیا ایک راہب اپنی موت کے بعد بھی مخلوق کے لیے اتنا مفید اور فائدہ رساں ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات انہیں پریشان کرتے رہے۔ رات کو جب یہ سو گئے تو خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

"اے خفیف! تم الجھنوں کا شکار کیوں ہو گئے ہو؟ اس راہب کی راکھ نے تمہیں اتنا پریشان کیوں کردیا ہے؟ ان باتوں سے تمہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے، صدق ریاضت سے باطل دین والوں میں بھی یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر دین حق والے بھی صدق و ریاضت سے کام لیں تو ان میں اس راہب سے زیادہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدق و دیانت، ریاضت اور خلوص، یہ کہیں بھی ہوں، ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔"

آپ کے دل کو قرار آگیا اور کچھ دن اس مسیحی کے مہمان رہ کر روانہ ہو گئے۔

آپ نے ایک بار پھر رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے عبداللہؒ سے فرمایا۔ "اے خفیف! اگر راہ طریقت کا واقف بھی اس راستہ پر گامزن نہ ہوگا تو محشر میں یہی شخص عذاب کا سب سے زیادہ مستحق قرار پائے گا۔"

آپ پر اس قول کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ نے اتباع سنت ﷺ میں انگوٹھوں کے بل پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ آپ نے زار و قطار روتے ہوئے عرض کیا۔ "یارسول اللہ ﷺ! میں نے تو بڑی کوشش کی کہ آپ ﷺ کی اتباع میں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز پڑھوں لیکن میں اس میں ناکام رہا۔ اب آپ ﷺ ہی فرمایئے کہ میں راہ طریقت پر کس طرح چلوں کہ محشر میں مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

آپ نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ فرمارہے ہیں کہ "اے خفیف! انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات میری ذات تک مخصوص تھی۔ تجھے اس معاملے میں میری اتباع نہیں کرنا چاہیے۔"

ایک بار آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے۔ ہر طرف نفسانفسی کا بازار گرم ہے۔ لوگ حیران و سرگرداں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ پل صراط پر لوگوں کا ہجوم ہے اور اس پر سے گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس عالم میں آپ نے دیکھا ایک چھوٹا سا بچہ کسی طرف سے نمودار ہوا اور ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ "ابا جان! آپ یہاں کھڑے کیا کررہے ہیں؟ ادھر آیئے میرے ساتھ تاکہ میں آپ کو پل صراط کے اس پار پہنچا دوں۔"

اس شخص نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکے نے اسے نہایت آسانی سے پل صراط کے اس پار پہنچا دیا۔ سامنے ہی جنت تھی، لڑکے نے کہا۔ ''ابا جان! آیئے میرے ساتھ، میں آپ کو جنت میں داخل کرا دوں۔''

چنانچہ اس لڑکے نے اپنے باپ کو جنت میں پہنچا دیا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔

آپ نے بیدار ہوتے ہی کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ ماہ بعد گھر میں ایک حسین بچہ پیدا ہوا جو چند گھنٹے زندہ رہ کر چل بسا۔ بیوی چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ آپ بھی بہت اداس تھے، آہستہ، آہستہ چل کر بیوی کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''بی بی! تم اتنا مت رو، خدا کی مشیت میں کوئی کس طرح دم مار سکتا ہے۔ رضائے الٰہی پر تمہیں اپنا سر جھکا دینا چاہیے کیونکہ اللہ اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے۔''

بیوی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ میرے پاس اس قسم کی باتیں کر کے دل دکھانے آئے ہیں۔ میں کس طرح صبر کر لوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے یا میرے کسی رویے میں تمہارے لیے تکلیف اور اذیت کا محرک پایا جاتا تھا۔ میں نے تو تم سے کسی اور ہی مقصد سے شادی کی تھی۔ آج وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لیے مجھے اجازت دیجیے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں کیونکہ لڑکے کی پیدائش اور اس کی فوری موت نے میرے مسائل حل کر دیے۔ اب میں اس فکر سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''میں نے طلاق لینے کے لیے یہ شادی نہیں کی تھی۔ یہ طلاق کیوں لوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تم اب بھی میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔''

بیوی کا دل گداز اور کمزور تھا۔ شوہر کو اداس اور ملول دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں دو ایسے بھی تھے جن کا نام احمد تھا۔ آپ نے ان دونوں میں تمیز کی خاطر ایک کا نام احمد کہہ اور دوسرے کا نام احمد مہ رکھ دیا لیکن آپ کو احمد کہہ سے بڑی انسیت تھی۔ حالانکہ عبادت اور ریاضت میں احمد مہ کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ دوسرے مرید جب یہ دیکھتے کہ ایک دیندار کے مقابلے میں دوسرے کمتر درجے کے دیندار کو زیادہ سراہا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ایک دن ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں ایک بات معلوم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر اس کا صحیح جواب مل جائے گا تو میں نہایت خشوع و خضوع سے یادِ الٰہی میں مشغول رہ سکوں گا۔''

آپ نے کہا۔ ''وہ کیا، پوچھو۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''آپ کے دونوں مرید احمد کہہ اور احمد مہ میں جو زیادہ عبادت گزار اور متقی ہے آپ اس کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہتے ہیں جو نسبتاً کم عبادت گزار ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے سوال کا جواب کسی خاص وقت پر دوں گا۔ اس کے لیے تجھے انتظار کرنا ہوگا؟''

مرید چپ ہو گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔

آپ ایک بڑے اجتماع سے مخاطب تھے۔ آپ کے دلکش انداز وعظ گوئی نے مجمع پر سحر سا کر رکھا تھا۔ وعظ کے خاتمے پر آپ نے احمد مہ سے کہا۔

''احمد مہ! میرا ایک کام تو کر دے۔''

احمد مہ نے ادب سے عرض کیا۔ ''ارشاد، ایک کیا دس کا ارشاد فرمایئے میں دل و جان سے اس کی تعمیل کروں گا۔''

آپ نے کہا۔ ''میرے اونٹ کو، جو باہر بندھا ہوا ہے، ذرا اوپر چھت پر باندھ دے۔''

احمد مہ آپ کی صورت دیکھنے لگا، آپ نے پوچھا۔ ''میری صورت کیا دیکھ رہا ہے، میں نے جو کام تیرے سپرد کیا ہے اسے انجام دے۔''

احمد مہ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے اس پر غور بھی فرمایا ہے کہ کیا حکم دے رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیا ہے، اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ دے۔''

احمد مہ نے کہا۔ ''حضرت! ذرا غور تو فرمایئے، اونٹ کوئی بکری یا بھیڑ کا بچہ تو ہے نہیں جسے میں گود میں لے کر چھت پر

پہنچادوں۔"

آپ نے احمد کبہ کو آواز دی۔ "احمد کبہ! ذرا میرے قریب تو آنا۔"

احمد کبہ بھاگا بھاگا آپ کے روبرو آن کھڑا ہوا۔ "ارشاد!"

آپ نے فرمایا۔ "ذرا میرے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ تو دے۔"

احمد کبہ نے گردن جھکا کر بصد ادب عرض کیا۔ "بہتر ہے، ابھی لے لیجیے۔"

احمد کبہ فوراً اٹھا اور اونٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اونٹ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہاتھ اگر اونٹ کی پچھلی ٹانگ پر تھا تو دوسرا اونٹ کے نصف حصے تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھالے لیکن ناکام رہا۔

آپ اپنے چند مریدوں کو ساتھ لے کر احمد کبہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں وہ مرید بھی شامل تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال کیا تھا کہ آپ عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں نسبتاً کم عبادت گزار احمد کبہ کو کیوں زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کے ساتھ یہ تماشا دیکھا کہ احمد کبہ پسینے میں تربہ تر اونٹ کو اٹھا لینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا ہے لیکن اونٹ کو جنبش تک نہیں دے پا رہا۔ آپ نے احمد کبہ سے کہا۔ "اب بس کر اگر اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھتا تو مت اٹھا، میرا منشا پورا ہو چکا۔"

مرید حیرت سے آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ احمد کبہ نے عرض کیا۔ "حضرت! میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا حکم بجالاؤں۔"

آپ نے کہا۔ "میرا حکم تو تو بجالایا اب مزید ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔"

جس مرید نے کچھ عرصے پہلے اعتراض کیا تھا، اس نے کہا۔ "آپ کو خود بھی اس کا پہلے ہی علم ہوگا کہ اونٹ اس کے اٹھائے نہیں اٹھے گا پھر اسے خوانخواہ ہلکان فرمایا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تجھے اور تیرے جیسے دوسروں کو یہ بتانے کے لیے کہ میں عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار احمد کبہ کو کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "اس طرح اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بات اب بھی نہیں آئی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے ایک ہی حکم دونوں کو دیا۔ ان میں جو زیادہ عبادت گزار تھا، وہ اپنی عبادت پر نازاں رہا اور میرے حکم کی بجا آوری کے بجائے یہ عذر پیش کر دیا کہ اونٹ کو چھت پر لے جانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برعکس احمد کبہ، جو تم سب کی نظروں میں احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار ہے، میرا زیادہ فرماں بردار ہے۔ چنانچہ جب میں نے اسے یہ حکم دیا کہ اونٹ کو چھت پر باندھ دے تو اس غریب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ تعمیل حکم کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ایسا ہی انسان زیادہ پسند ہے جو حکم کی بجا آوری میں احمد کبہ جیسا ہو۔"

معترض مرید اور اس جیسے دوسرے مریدوں کو اپنے اپنے شک و شبہات کا جواب مل چکا تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

☆☆☆

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ کھانا تناول فرمانے کی سعادت عطا فرمائیں۔

آپ نے پہلے تو تامل سے کام لیا لیکن جب اس کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور ارشاد فرمایا۔ "مجھے کھانے کے وقت اپنے ساتھ لے جانا۔"

وہ شخص چلا گیا اور کھانے کا اہتمام کرنے لگا۔ جب کھانا پک چکا تو وہ آپ کو بلانے آ گیا۔

آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پہلے ہی لقمے پر کچھ کراہت سی محسوس ہوئی۔ آپ کو گوشت میں کچھ خرابی محسوس ہوئی۔ صاحب خانہ نے پوچھا۔ "حضرت! کوئی خاص بات؟"

آپ نے اس کی پردہ پوشی کی۔ "نہیں تو، کوئی خاص بات نہیں۔"

اس شخص نے نہایت عقیدت اور محبت سے عرض کیا۔ "حضرت! میں ایک سعادت اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

اس نے عرض کیا۔ "میں لقمے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے، بولے۔ "تو اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے۔"

اس شخص نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے وہ لقموں کو چباتے تھے انہیں گوشت کی خرابی اور سڑاند کا

احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ آپ کے چہرے سے نظریں ہٹالیتا تو آپ کے چہرے پر کراہیت کی شکنیں نمودار ہو جاتیں اور جب وہ دیکھنے لگتا تو آپ ضبط و احتیاط سے کام لیتے کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہو جائے لیکن آخر کار صاحب خانہ کو اس کا احساس ہو گیا کہ گوشت صحیح نہیں ہے اور اس میں سڑاند محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے شرمندگی سے منہ چھپالیا۔ آپ نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے اچھی طرح نادم ہونے کا موقع دیا۔

اسی سال آپ ایک بار پھر حج پر روانہ ہو گئے۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے، وہ قادسیہ پہنچ کر راستہ بھول گیا یہ اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے لگے۔ پاس کھانے کو جو کچھ تھا، ختم ہونے لگا۔ آس پاس کوئی بستی بھی نہ تھی۔ یہ کئی دن تک بھٹکنے کے بعد اپنا کھانے پینے کا سامان تک ختم کر بیٹھے اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے کھانے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن بڑی مایوسی رہی اور بھوک حد سے تجاوز کرتی رہی۔

آخر وہ لوگ اضطراری حالت کو پہنچ گئے جہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔

بھوک نے ان سب کو جاں بہ لب کر رکھا تھا۔ قافلے کے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ آبادی کی تلاش میں پریشان اور سر گرداں تھے۔

اس وقت آپ کو وہ شخص یاد آ رہا تھا جس نے آپ کی دعوت کی تھی کہ گوشت کی سڑاند کا علم ہو جانے کے بعد شرمندہ اور نادم ہو کر ایک طرف جا بیٹھا تھا اور آپ نے اس کی ندامت دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی تھی۔ آپ کو اچانک احساس ہوا کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس عذاب میں ہو رہا ہے۔ آپ کو اس شخص کی ندامت اور دل شکنی کا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔ شاید یہ اسی بات کی سزا ہے۔

☆☆☆

آپ نے آخری عمر میں بادشاہ کے دربار میں جانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اس تغیر پر حیران تھے لیکن آپ بڑی پابندی سے دربار جانے لگے تھے۔ آپ کے مرید اس پر معترض تو تھے لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ کسی نے احمد کبیر کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ آپ سے پوچھے کہ آپ نے بادشاہ کی درباداری کیوں شروع کر دی ہے؟

لیکن احمد کبیر نے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔ آپ دربار جا رہے تھے اور آپ کے مرید گومگو بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں ہر شخص اس تبدیلی کو بڑی ناگواری سے محسوس کر رہا تھا۔ جب آپ دربار چلے گئے تو آپ کی عدم موجودگی.... میں دو درویش نہایت دور دراز سے سفر کر کے آپ سے ملاقات کو حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''عبداللہ خفیفؒ کہاں ہیں؟''

کسی مرید نے جواب دیا۔ ''وہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔''

درویشوں نے حیرت سے کہا۔ ''عبداللہ خفیفؒ اور بادشاہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شاہی دربار میں باقاعدگی سے حاضری دے رہے ہیں۔''

ایک درویش نے اپنے ساتھی درویش سے کہا۔ ''یہ کیسے بزرگ ہیں جو شاہی دربار میں جایا کرتے ہیں۔ حالانکہ درویشوں کو شاہوں اور ان کے درباروں سے کیا تعلق؟''

دوسرے درویش نے جواب دیا۔ ''خدا عالم الغیب ہے، وہی چھپی باتوں اور دلوں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔''

دونوں درویش آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ عبداللہ خفیفؒ کا کہاں انتظار کیا جائے؟ ان کی خانقاہ میں یا کہیں اور پھر دونوں نے یہ طے کیا کہ شیراز کے بازاروں میں گھوم پھر لیا جائے۔ یہ طے کر کے دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ اچانک ان کی نظر ایک درزی پر پڑی۔ ایک درویش کے خرقے کی جیب پھٹی ہوئی تھی اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے وقت غنیمت ہے، کیوں نہ میں اپنے خرقے کی جیب سلوا لوں۔''

دوسرے درویش نے تائید کی، بولا۔ ''بے شک، وقت غنیمت ہے۔''

دونوں درزی کی دکان پر بیٹھ گئے اور ایک درویش نے اپنا خرقہ اتار کر درزی کے حوالے کیا اور کہا۔ ''او بھائی درزی! ذرا میری یہ پھٹی ہوئی جیب تو سی دے۔''

درزی نے خرقہ لیا اور جیب سینے لگا۔ اسی دوران اسے قینچی کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس نے اپنے سامان میں قینچی

تلاش کی لیکن وہ نہیں ملی۔ اس نے ان درویشوں کی طرف دیکھا۔ کوسوں کی مسافت طے کیے ہوئے یہ درویش پراگندہ و پریشان عجیب بے اعتبار سے محسوس ہوئے۔ درزی نے ان سے پوچھا۔ ''تم دونوں نے میری قینچی تو نہیں دیکھی؟''

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''بابا! ہم دونوں اس شہر میں نو وارد ہیں اور بھلا ہمیں تیری قینچی کا کیا علم؟ یہ سوال تو ان سے کر جو تیری دکان پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔''

درزی کا شک اور بڑھا۔ ''سیدھی طرح بتا دو کہ میری قینچی کہاں ہے ورنہ میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔''

ایک درویش نے کہا۔ ''تو دوسرا نہیں تیسرا طریقہ اختیار کر، جب ہمارے پاس تیری قینچی موجود نہیں تو تیرا دوسرا یا تیسرا طریقہ اسے کہاں سے فراہم کر دے گا۔''

درزی نے کہا۔ ''تم دونوں ہی میری دکان پر آئے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا بھی تھا؟''

ایک درویش نے جواب دیا۔ ''ہم دو ساتھی ہیں، بہت دور سے ہی آئے ہیں اور تیری دکان میں ہم دونوں ہی آئے ہیں، تیسرے ساتھی سے تیری کیا مراد ہے؟''

درزی نے کہا۔ ''تم دونوں کا کوئی تیسرا ساتھی ضرور ہوگا اور تم دونوں نے میری قینچی اس کے حوالے کر کے اسے چلتا کر دیا ہوگا۔''

دونوں درویشوں کو غصہ آ گیا، ایک نے ذرا جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''تیرا دماغ تو صحیح ہے، تو ہم دونوں کو چور ٹھہراتا ہے۔ تجھے شرم آنی چاہیے۔ ہم درویشوں کو چوری چکاری سے کیا تعلق؟''

درزی نے کہا۔ ''میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا۔ بس سیدھی طرح میری قینچی فراہم کر دو، ورنہ میں پولیس بلالوں گا۔''

ایک درویش نے عاجزی سے کہا۔ ''بھائی! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے۔ جو ہم کو چور بناتا ہے، کچھ تو خدا کا خوف کر۔''

درزی نے جواب دیا۔ ''میں خدا کا خوف کیوں کروں؟ تم چوری کر کے بھی خدا سے ڈر نہیں رہے اور مجھے خدا سے ڈراتے ہو، کمال کے ہو تم دونوں۔''

دوسرے درویش نے کہا۔ ''بھائی! یہ تکرار بعد میں کر لینا، پہلے میرے خرقے کی جیب تو سی دو۔''

درزی نے خرقہ اٹھا کر دکان کے اندر پھینک دیا، کہا۔ ''اب یہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تم دونوں میری قینچی نہیں دو گے۔''

ایک درویش نے اپنا سر پکڑ لیا، پیشانی دباتا ہوا بولا۔ ''بھائی! تو نے تو کمال ہی کر دیا۔ ہم دونوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے اور خدا کے غضب سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔''

درزی نے جھنجلا کر کہا۔ ''دیکھو مجھے بار بار خدا کے غضب سے مت ڈراؤ۔ میں بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک پولیس آ چکی ہوتی۔''

درویش نے کہا۔ ''دیکھ تنگ نہ کر، ہم چور نہیں ہیں۔''

درزی نے کہا۔ ''تم چور اگر نہیں تو پھر میری قینچی کہاں چلی گئی؟''

درویش نے گرم ہو کر کہا۔ ''ہم کیا جانیں تیری قینچی کہاں چلی گئی؟''

درزی نے کہا۔ ''واہ جناب! ایک تو میری قینچی غائب کر دی، دوسرے مجھی کو آنکھیں بھی دکھاتے ہیں۔''

ایک درویش نے نرمی سے کہا۔ ''بابا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہم تمہیں کس طرح یقین دلائیں کہ ہم نے تمہاری قینچی نہیں لی۔''

درزی نے جواب دیا۔ ''تمہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ میں یقین کرنے کو تیار ہی نہیں۔ مجھے یا تو میری قینچی واپس کر دو ورنہ میں سپاہیوں کو بلاتا ہوں۔''

درویش نے کہا۔ ''تم ہمیں برابر سپاہیوں کی دھمکی دیے جا رہے ہو۔ اگر تم واقعی ہماری بے گناہی پر یقین نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں پھر وہی کرو جس پر تمہارا دل راغب ہے۔''

درزی نے اسی وقت سپاہیوں کو بلا لیا اور ان دونوں درویشوں کو قینچی چرانے کے جرم میں گرفتار کرا دیا۔ سپاہیوں نے انہیں حکمران کے دربار میں پیش کر دیا۔ وہاں عبداللہ خفیفؒ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آپ نے دونوں درویشوں کو دیکھا اور مسکرا دیے اور ان سے سوال کیا۔ ''درویشو! میں تمہیں بتاؤں کہ میں بادشاہ کے دربار میں کیوں آتا ہوں؟''

دونوں درویش بہت پریشان تھے، بولے۔ ''اس وقت تو ہم دونوں مصیبت میں گرفتار ہیں، اس سے نجات ملے تو کچھ

عرض کریں۔"

عبداللہ خفیفؒ نے بادشاہ سے کہا۔ "تیرا میری بابت کیا خیال ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں آپ کو انتہائی بزرگ سمجھتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "میں سچا ہوں یا جھوٹا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "آپ سچے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تو مجھے سچا سمجھتا ہے تو میری بات کا یقین کر، یہ دونوں درویش دور دراز سے میری ملاقات کو آئے تھے۔ یہاں بے وجہ چوری کے الزام میں گرفتار کر کے، تیرے دربار میں لا کھڑے کیے گئے۔ ان بے گناہوں کو چھوڑ دے۔"

بادشاہ نے ان دونوں کو اسی وقت رہا کر دیا۔ آپ ان دونوں کو لے کر دربار سے باہر نکلے اور سیدھے درزی کے پاس پہنچے۔ درزی سے پوچھا۔ "کیا تو ان دونوں کو چور سمجھتا ہے؟"

درزی بہت ڈرا سہا تھا، اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "تیری قینچی ملی یا نہیں؟"

درزی نے جواب دیا۔ "مل گئی، وہ کپڑوں میں بندھ گئی تھی۔"

آپ نے کہا۔ "تب پھر تو نے اپنے کپڑوں میں پہلے ہی اسے اچھی طرح کیوں نہیں تلاش کر لیا تھا؟"

آپ نے دونوں درویشوں سے کہا۔ "میں شاہی دربار کیوں جاتا ہوں؟ یہ تو تم دونوں کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا۔ آج اگر میں دربار میں موجود نہ ہوتا تو تم دونوں کا معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔" پھر درزی سے کہا۔ "کیا ان کے خرقے کی جیب سل گئی؟ اگر سل گئی ہے تو وہ دے دے۔"

درزی نے خرقہ آپ کے حوالے کر دیا، کہا۔ "اسے تو میں نے سب سے پہلے سی دیا تھا۔"

آپ نے اس کی سلائی دریافت کی، لیکن درزی نے سلائی نہیں لی۔ آپ دونوں درویشوں کو اپنی خانقاہ لے گئے۔ وہاں ان دونوں نے اپنی بدگمانی کی معافی مانگی۔

☆☆☆

ایک مسافر نے آپ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہ بہت تھکا ہارا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ناقص کھانے یا شیراز کے پانی کی ناموافقت سے اپنے پیٹ میں گڑبڑ محسوس کی۔ پھر اجابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ اس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ اس کی حالت نازک ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر تک اسے پچاس بار رفع حاجت کے لیے جانا پڑا۔ رات کے آخری حصے میں آپ کی آنکھ لگ گئی، مہمان کو ایک بار پھر رفع حاجت کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس نے آپ کو آواز دی لیکن نیند اتنی گہری تھی کہ آپ کی آنکھ نہیں کھلی۔ اس نے پھر آواز دی لیکن آپ سوتے رہے۔ مہمان پر کمزوری اتنی غالب تھی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہو چکا تھا۔ اس نے آپ کو پوری قوت سے پکارا اور جب یہ محسوس کیا کہ آپ بیدار نہیں ہوئے تو اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ "او شیخ! تجھ پر خدا کی لعنت، کہاں چلا گیا؟"

مریدوں نے آپ سے کہا۔ "حضرت! آپ نے اس کے گستاخانہ کلمات سنے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے اس کے کلمات رحمت سن لیے۔"

اس کے بعد آپ مہمان کو بیت الخلاء لے گئے۔ جب واپس آئے تو مریدوں نے کہا۔ "گستاخانہ کلمات کو کلمات رحمت کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "خدا نے مجھے خراب بات سننے کے لیے کان نہیں دیے۔"

میں نے تو اسے یہ کہتے سنا کہ 'او شیخ! تجھ پر خدا کی رحمت، کہاں چلا گیا؟'"

مریدوں نے عرض کیا۔ "آپ اس گستاخ کی بے جا طرف داری فرما رہے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اپنے منصب کا حق ادا کر رہا ہوں۔"

مریدوں نے خاموشی اختیار کی۔

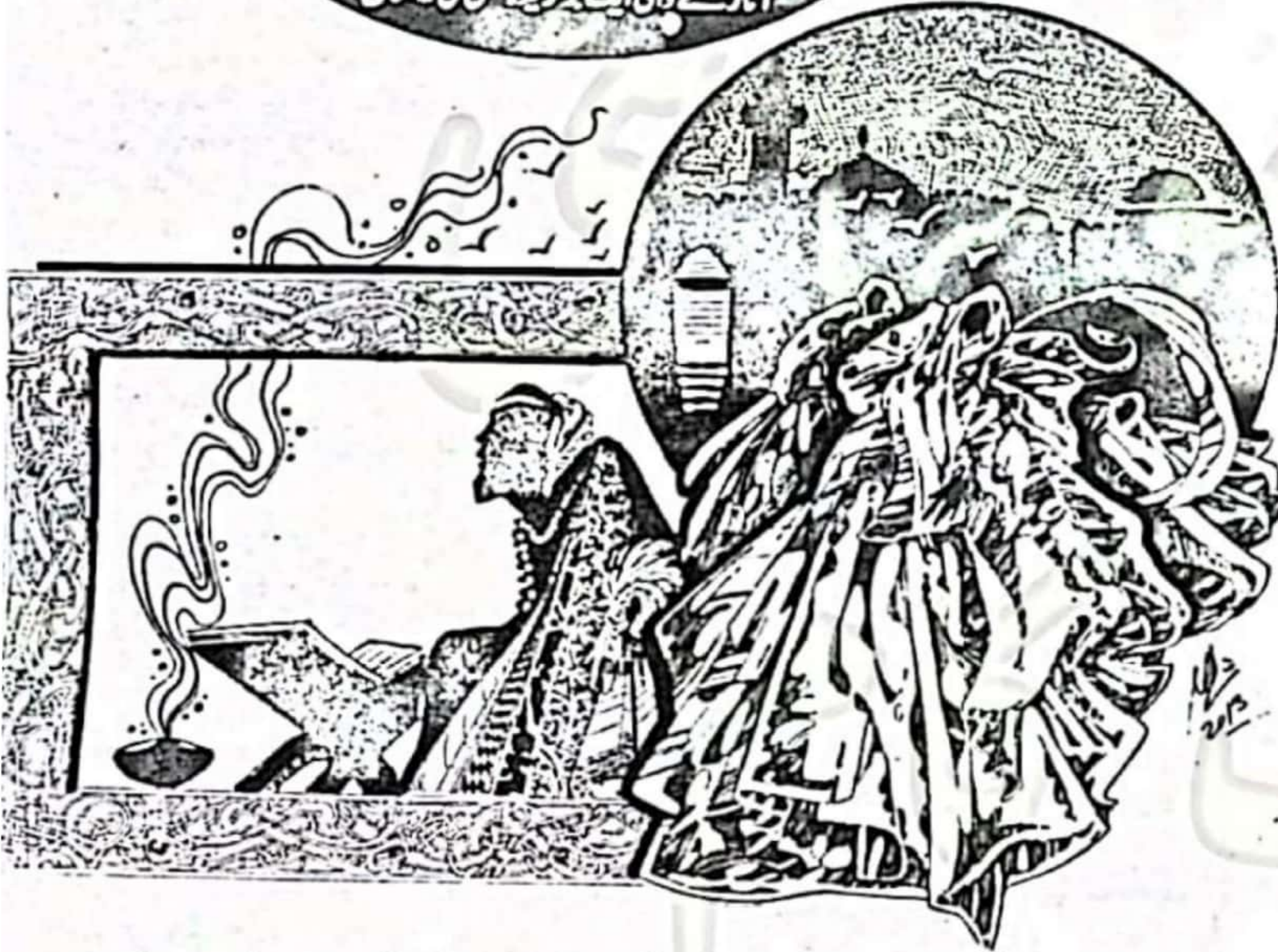
☆☆☆

شیخ سماء الدین

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان کو اللہ نے اتنی قدرت دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لیے رستوں کا انتخاب کرسکتا ہے لیکن ہدایت کا یہ تحفہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے... آپ کا شمار بھی انہی خوش نصیب لوگوں میں ہوا جن کی کرامات و برکات سے بنی نوع انسان نے فیض حاصل کیا... کم عمری میں ہی آپ کی ذات میں پوشیدہ وہ تمام اشارے نظر آنے لگے تھے جن کی بدولت آپ کا شمار ولیوں میں ہونے لگا۔

فانی دنیا اور باقی آخرت کے فلسفے کو دل میں اتارنے والی ایک برگزیدہ ہستی کی داستان



ملتان کے شیخ سماء الدین کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی کہ ہر ایک پر یہ بات واضح اور ثابت ہوگئی کہ لڑکا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے اور روحانی اور باطنی فیوض و برکات میں بے مثل ہے۔ صغر سنی ہی سے عبادت اور ریاضت میں انہماک اس طرح ظاہر ہو چکا تھا کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضرور فرماتے۔ پاکی و طہارت کا خاص خیال رکھتے۔ اب شیخ سماء الدین کی ماں اور بھائی شیخ اسحاق اس فکر میں رہنے لگے تھے کہ اس باکمال شخص کو کس پیر کامل کی مریدی میں دیا جائے۔

ورنہ اس جوہرِ کامل کی تربیت میں کوتاہی کے خطاکار ٹھہریں گے۔

جب شیخ کے والد کو اپنی زندگی کے بارے میں شک و شبہ ہونے لگا تو انہوں نے ایک شب، جبکہ یہ نصف گزر چکی تھی..... انہیں..... بستر سے اٹھایا اور کہا۔ ''بیٹے سماء الدین! آ میرے ساتھ چل۔''

سماء الدین چپ چاپ اٹھ کر باپ کے ساتھ ہولیے۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گئے اور فرمایا۔ ''بیٹے سماء الدین! میں کچھ دنوں کے لیے دہلی جانا چاہتا ہوں۔ وہاں کسی سرائے میں قیام کروں گا اور کوشش کروں گا کہ وہیں کسی مضافات میں زمین لے کر باغ لگاؤں، کاروبار کروں اور سامانِ عیش و عشرت مہیا کروں۔''

سماء الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ دہلی میں کتنے دن قیام کریں گے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''چند ہفتے یا پھر ماہ ڈیڑھ ماہ۔''

سماء الدین کو ہنسی آگئی، بولے۔ ''بابا جان! آپ مجھ سے مذاق تو نہیں فرما رہے؟''

باپ نے پوچھا۔ ''اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''جب آپ ہفتوں یا ماہ ڈیڑھ ماہ کے لیے دہلی جائیں گے اور وہاں کی کسی سرائے میں قیام فرمائیں گے تو پھر یہ زمین اور باغات کی آپ کو کیا سوجھی؟ کاروبار اور عیش و عشرت کے منصوبے کیسے؟''

باپ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''بیٹے! میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، میرے نزدیک اس کے لیے یہ بہترین پیرایہ بیان تھا۔ یہ دنیا چاہے کتنی لمبی عمر رکھتی ہو مگر انسان لمبی عمر لے کر..... نہیں آتا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ اس سرائے میں چند روزہ قیام کا یقین رکھنے کے باوجود اگر انسان ایسے منصوبے بنائے گویا اسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے تو یہ اس کی حماقت نہیں تو اور کیا کہلائے گی۔ میں نے اس دنیا میں سرائے کے مسافر کی طرح قیام کیا ہے۔ تمہیں بھی یہی کرنا ہے۔ جب تک زندہ رہو اپنے رب کو مت بھولو اور انسانوں کے کام آؤ کیونکہ انسان کے ذمے دو قسم کے حقوق واجب الادا ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ کا تعلق اللہ اور انسان کے درمیان ہے اور حقوق العباد کا تعلق انسان اور انسان کے درمیان ہے۔ اگر تم نے محض حقوق اللہ پر زور دیا اور حقوق العباد کو فراموش کر دیا تو واللہ تم بہت خسارے میں رہو گے اور ناقابلِ تلافی نقصان اٹھاؤ گے۔ اس لیے کامیاب انسان وہی ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد میں بھی پورا اترتا ہے۔''

باپ کی پُراثر باتوں نے سماء الدین کو بہت متاثر کیا، دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہوگئیں، پوچھا۔ ''بابا جان! پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''کسی مرشدِ کامل کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کی راہنمائی میں اپنی منزلِ مراد کو پہنچو۔''

سماء الدین کی ابھی عمر ہی کیا تھی، پھر بھی انہوں نے اپنے ماحول میں کسی مرشدِ کامل کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ان کی نظرِ انتخاب اس عہد کے مشہور صوفی شیخ المشائخ شیخ اسماعیل پر پڑی۔ شیخ اسماعیل صدر الدین راجو قتال کے ولی عہد تھے۔ صدر الدین راجو قتال ان کی ماں کے پیر و مرشد تھے۔

سماء الدین کسی کو وسیلہ بنائے بغیر شیخ اسماعیل کی خدمت میں پہنچ گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا۔ ''حضرت! میں بڑی امیدیں لے کر حاضر ہوا ہوں، امید ہے کہ آپ اس پر ضرور غور فرمائیں گے اور مجھ کو مایوس نہیں کریں گے۔''

شیخ اسماعیل روشن ضمیر تھے، بولے۔ ''شاید تو یہ چاہتا ہے کہ میں شفقت اور مہربانی سے تیری پرورش کروں اور اپنی نصیحتوں سے تیری پریشانیاں دور کر دوں۔''

سماء الدین نے جواب دیا۔ ''بیشک میرا یہی مدعا ہے اگر آپ سے مجھے فیض پہنچے گا تو اس سے آپ کے کمالات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

شیخ اسماعیل نے فرمایا۔ ''میرے بھائی شیخ فضل اللہ بڑے اہلِ کمال اور صاحبِ حال ہیں اگر تم رضامندی ظاہر کرو تو میں ان کے پاس پہنچا دوں گا اور ان سے خرقہ بھی دلوا دوں گا۔''

سماء الدین نے سکوت اختیار کیا اور شیخ اسماعیل کے پاس ہی رہنے لگے۔

چند دنوں بعد سماء الدین نے پھر وہی درخواست کی اور شیخ اسماعیل نے پھر وہی جواب دیا اور وہی پیشکش دہرائی۔

سماء الدین نے بڑی عاجزی اور محبت سے عرض کیا۔ ''آقا! پیری مریدی اور ارادت کا جہاں تک تعلق ہے، ان کا معاملہ دل اور محبت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں، میں نے جب بھی اپنے دل کو ٹٹولا وہاں آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ملا، اس لیے اگر آپ میری پرورش اور تربیت کی ذمے داری قبول فرمائیں گے تو خیر ورنہ میں اسی طرح زندگی بھر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔''

شیخ اسماعیل نے بے ساختہ اٹھ کر انہیں سینے سے لگا لیا اور اپنے حجرے میں لے گئے۔ وہاں کچھ دیر ذکر کی تلقین کرتے رہے اس کے بعد دوگانہ ادا کرایا اور خرقۂ خاص عطا فرمایا۔ سماء الدین نے محسوس کیا جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔ ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو جتنا چاہے دے دے۔''

یہ اپنے پیر کی صحبت میں رہنے لگے اور ان کی پوری توجہ صفائی قلب اور باطنی علوم کی تحصیل پر رہنے لگی۔ اگر کسی لمحہ ظاہری علوم کی تحصیل کا خیال بھی آیا تو یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ فی الحال اس کو ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔

ایک دن شیخ اسماعیل نے سماء الدین کو اپنے حجرے میں بلا کر پوچھا۔ ''سماء الدین! کیا بات ہے، تم بار بار اپنے دل سے علوم ظاہری کا خیال کیوں نکال دیتے ہو؟''

سماء الدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! جس کو باطنی علوم حاصل ہو جائیں اسے ظاہری علوم کی کیا ضرورت؟''

شیخ اسماعیل نے فرمایا۔ ''سماء الدین! یہ کیسا خیالِ خام دل میں سمایا ہے۔ شرع کی بنیاد اور دین کی اساس علومِ ظاہری پر ہے۔ میری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم لوگوں کو علوم ظاہری اور علوم باطنی سے یکساں فائدے پہنچاؤ مگر تم، معلوم نہیں کیوں اس سے گریز کر رہے ہو۔''

سماء الدین سخت شرمندہ ہوئے اور اس دن سے علومِ ظاہری کی حصولیابی میں بھی کوشاں نظر آنے لگے۔

☆☆☆

سماء الدین کو رات کی تاریکی میں کھلے آسمان تلے کھڑا کر دیا گیا۔ ان کے والد نے ایک خاص ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سماء الدین! اس خاص ستارے اور اس کے محلِ وقوع کو پہچان لو۔ یہ جب بھی تمہیں اس جگہ نظر آئے تم یہ سمجھ لینا کہ اب تہجد کا وقت ہو چکا ہے۔''

سماء الدین نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے حجرے میں چلے گئے۔ چند دنوں بعد نہیں معلوم کس نے یہ اطلاع دی کہ سماء الدین تہجد والے ستارے کو دیکھے بغیر ہی نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

''میں تہجد کے ستارے کو اپنے حجرے میں سے ہی دیکھ لیتا ہوں۔ بس اس لیے تہجد کی نماز پڑھنے لگتا ہوں۔''

جب لوگوں نے اس کا تجربہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سماء الدین نے تہجد کا ستارہ حجرے ہی میں سے دیکھ لیا تھا اور وہ یہیں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید لوگوں کو پہلی بار ان کے کشف اور بزرگی کا علم ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ سماء الدین کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی اور انہیں بھی ان کے ارادت مندوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔

دہلی اور اس کے مضافات کے لوگ ان کا غائبانہ ذکر سن سن کر بلانے لگے۔ آخر انہیں بیانہ جانا پڑا۔ بیانہ کے لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے مرید ہونے لگے۔ بیانہ کے بعد آپ ناگور چلے گئے اور وہاں بھی آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے دلوں میں جگہ دی۔ ایک نیک اور پارسا عورت نے آپ سے درخواست کی کہ اسے کچھ خدمت کا موقع دیا جائے۔

آپ نے پوچھا۔ ''تو میری کیا خدمت کرنا چاہتی ہے؟''

عورت نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرے پاس ایک گائے کے سوا کچھ بھی نہیں، چنانچہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس کا کچھ دودھ آپ کو پہنچا دیا کروں لیکن آپ کی اجازت اور منظوری سے۔ اس کے بغیر نہیں۔''

آپ نے اجازت دے دی۔ ''اچھا جب تک میں ناگور میں ہوں تجھ کو اجازت ہے کہ مجھے دودھ پہنچا دیا کرو۔''

اس کے بعد وہ عورت آپ کی بندۂ بے دام ہو گئی۔ آپ کچھ دن بعد گجرات تشریف لے جانے لگے۔ اس عورت کو

بڑا قلق ہوا اور روہانسی ہو گئی۔ پوچھا۔ ''حضرت! آپ پھر...... میرا مطلب ہے آپ دوبارہ کب تشریف لائیں گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''جب خدا حکم دے گا تو آجائیں گے۔''
چنانچہ آپ کچھ عرصہ ناگور میں رہے اور یہاں سے گجرات چلے گئے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد عورت کی گائے کوئی چرا کر لے گیا۔ یہ بہت پریشان ہوئی اور اس پریشانی میں اس کی نیند اڑ گئی۔ عورت نے تین شب و روز اس کرب میں گزارے، اس کے بعد وہ سکون کی خاطر نوافل ادا کرنے لگی۔
ایک دن وہ نوافل ادا کرنے کے بعد آنکھیں بند کر کے پڑ رہی۔ کچھ دیر بعد نیند نے اسے مدہوش کر دیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا گویا شیخ سماء الدین اس کے پاس کھڑے ہیں اور پوچھ رہے ہیں۔ ''عورت! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''آپ مجھ سے میری پریشانی کا سبب پوچھ رہے ہیں حالانکہ آپ روشن ضمیر ہیں۔''
آپ نے اصرار کیا۔ ''اگر تو اپنی پریشانی خود اپنی زبان سے بیان کر دے گی تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔''
عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ ''حضرت! جس گائے کا دودھ اور دہی وغیرہ میں آپ کو پہنچایا کرتی تھی، آپ کی عدم موجودگی میں کوئی اس کو چرا کر لے گیا۔ بتایئے اب میں کیا کروں؟''
آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''بس اتنی سی بات نے تجھ کو اداس کر رکھا ہے؟''
عورت نے کہا۔ ''حضرت! یہ اتنی سی بات نہیں ہے، یہ بہت بڑی بات ہے میرے لیے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''مت اداس ہو، وہ گائے تجھے واپس کی جارہی ہے۔ اس کو سنبھال کے رکھ۔''
عورت کی فرطِ خوشی میں آنکھ کھل گئی۔ وہ بے چینی سے کھڑی ہو گئی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں نے گائے کی آواز سنی۔ اس کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا لیکن گائے برابر بولتی رہی۔ عورت مکان کے اس حصے میں گئی جہاں گائے باندھی جاتی تھی۔ وہاں اس نے گائے کو بندھا ہوا دیکھا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے گائے کی پشت اور پیٹ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ وہ حیران تھی کہ آخر یہ گائے آئی کہاں سے۔ وہاں کوئی آس پاس ایسا شخص بھی نہیں تھا جو اس کی کسی بات کا جواب دے سکتا۔ آخر اس نے گائے سے سوال کیا ''تجھے کون لے گیا تھا؟''
گائے نے بڑی معصومیت سے عورت کی طرف دیکھا اور جگالی کرنے لگی۔
عورت نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور اب تجھے لایا کون ہے؟''
گائے نے جگالی کرتے ہوئے گردن ہلا کر سر کی مکھی اڑائی اور بھیں بھیں کرنے لگی۔
عورت نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں تجھے یہاں کون لایا ہے؟ اس میں یقیناً حضرت شیخ سماء الدین کا ہاتھ ہوگا۔ ان کے سوا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' اتنے میں کسی شخص نے دستک دی۔ عورت نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''
باہر سے کسی نے جواب دیا۔ ''بی بی! ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک شخص کو گائے کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک باہر واپس نہیں آیا۔''
عورت حیران تھی کیونکہ اندر کوئی شخص بھی نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''بھائی یہاں تو کوئی بھی نہیں، حالانکہ میری گمشدہ گائے موجود ہے۔''
یہ معما بھی حل نہیں ہو سکا کہ وہ مرد کون تھا۔

☆☆☆

شیخ سماء الدین کو جو لوگ ملے تھے ان میں حامد بن فضل اللہ جمالی کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ جمالی بذاتِ خود عالم تھے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزارا تھا مگر جب شیخ سماء الدین سے ملے تو انہی کے ہو رہے۔ آپ جمالی سے بے حد محبت کرتے تھے۔ آپ بیانہ میں قیام کے دوران حاضرین اور معتقدین کے سامنے وعظ فرمایا کرتے تھے اور جب نماز کا وقت آتا تھا تو خود یا کسی اور کو امامت کے لیے کھڑا کر دیتے۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب کا وقت آیا تو آپ نے حاضرین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور بیانہ کے حاکم قاضی بدر الدین کو حکم دیا کہ مغرب کی نماز پڑھائیں۔
قاضی صاحب نے انکساری سے کام لیا، بولے۔ ''حضرت! آپ کی موجودگی میں، میں امامت کروں۔ واللہ یہ

کتنی عجیب سی بات ہے جو سنے گا کیا کہے گا؟''
آپ نے نرمی سے فرمایا۔'' قاضی بدرالدین! آج تو آپ ہی امامت کریں گے۔''
جمالی نے عرض کیا۔'' حضرت! قاضی صاحب بجا فرماتے ہیں۔ آپ کی موجودگی میں کوئی اور امامت کیوں کرے؟''
قاضی صاحب کو شہ ملی تو پھر بولے۔'' حضرت! میں ایک عاجز اور گناہ گار بندہ آپ کی موجودگی میں کس طرح امامت کر سکتا ہوں۔''
آپ نے جمالی سے کہا۔'' جمالی! کیا تو میری مخالفت کر سکتا ہے؟''
جمالی نے عاجزی سے عرض کیا۔'' کوئی سوال نہیں پیرو مرشد۔''
آپ نے فرمایا۔'' پھر تو خاموش رہ۔'' اس کے بعد پھر قاضی کو حکم دیا۔'' آپ نماز پڑھائیں۔''
قاضی صاحب مزید انکار نہیں کر سکے۔ امامت کے لیے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے بہ آواز بلند آیات قرآنی پڑھنا شروع کر دیں۔ قاضی علم تجوید سے نابلد تھا اس لیے آپ کے عالم مرید جمالی کو قاضی کی قرأت پسند نہیں آئی۔ جمالی کو ایسا لگا گویا کوئی شہسوار گھوڑا بھگائے چلا جارہا ہے۔ آواز کی سختی اور لہجے کی درشتی، قرأت کی تیز رفتاری نے سب سے زیادہ جمالی کو بدمزہ کر دیا تھا چنانچہ جیسے ہی نماز ختم ہوئی اور قاضی نے سلام پھیرا، جمالی نے کھڑے ہو کر قاضی کو ڈانٹ دیا، پوچھا۔'' اے قاضی! کیا اس طرح نماز پڑھائی جاتی ہے؟''
قاضی نے کہا۔'' کیوں، میری قرأت اور تلاوت میں تمہیں کیا خامی یا خرابی نظر آئی؟''
جمالی نے جواب دیا۔'' اے مخدوم! عجب صف شکن امام ہو کہ اپنے تیز رفتار قرأت کے گھوڑے کو اتنا تیز بھگا دیا کہ نمازیوں اور مقتدیوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔''
قاضی شرمندہ ہوگیا اور کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔
جمالی کا یہ انداز تخاطب شیخ سماء الدین کو ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر اس وقت جمالی سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوسرے دن صبح جمالی کو اپنے حجرے میں طلب کیا اور سوال کیا۔'' جمالی! تو عالم ہے اس لیے یہ ضرور جانتا ہوگا کہ دل آزاری کتنا بڑا گناہ ہے۔''
جمالی نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔'' ہاں میں دل آزاری کے گناہ سے واقف ہوں۔''
شیخ نے فرمایا۔'' کل تو نے قاضی کا بڑا دل دکھایا۔ میں تو اسی وقت لرز گیا تھا۔''
جمالی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اگر مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوگیا تھا تو آپ مجھ کو ڈانٹ سکتے تھے۔ اسی وقت ٹوک دیتے، میں ہرگز برا نہ مانتا۔''
شیخ نے جواب دیا۔'' جمالی! میں صرف اس لیے خاموش رہا کہ تو خود جس گناہ کا مرتکب ہوا تھا میں اس کا ارتکاب کیوں کروں۔ اگر میں تجھ کو سب کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ دیتا تو، تو بہتوں کے سامنے ذلیل ہو جاتا۔ تو نے قاضی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''
جمالی نے پوچھا۔'' حضرت! پھر اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
شیخ نے جواب دیا۔'' یہ کہ آؤ ہم دونوں قاضی کے پاس چلیں اور اس سے معافی مانگیں۔ اگر وہ ہمیں معاف کر دے گا تو خدا بھی ہمیں معاف کر دے گا لیکن اگر اس نے معاف نہ کیا تو تمہیں روز قیامت بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''
جمالی کو رونا آ گیا۔ شیخ سماء الدین کی باتوں نے جمالی کو رلا دیا تھا۔ وہ دونوں اٹھے اور قاضی کے گھر پہنچ گئے جب قاضی کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ سماء الدین اپنے مرید جمالی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں تو وہ نہایت مؤدبانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پوچھا۔'' حضرت! آپ نے زحمت کیوں کی؟ مجھ کو بلوا لیا ہوتا، میں خود آ جاتا۔''
شیخ نے جمالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' قاضی صاحب! کل اس نے آپ کی شان میں جو گستاخی کی تھی اور جس طرح شرمندہ کیا تھا، آپ کو اس کا پورا پورا حق پہنچتا ہے کہ اس کو بھرے مجمع میں اسی طرح شرمندہ کریں۔''
قاضی نے کہا۔'' حضرت! میں غلطی پر تھا، میں قاضی ہوں اور بیانہ کی حکومت پر بھی فائز ہوں، مجھ کو علم تجوید سے واقف ہونا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ میں نہیں جانتا۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''وہ کچھ بھی سہی مگر جمالی کو اس لب و لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں اس کے ساتھ اس لیے آیا ہوں کہ تم سے معافی دلواؤں، خدا کے لیے تم اس کو معاف کر دو ورنہ اس کی آخرت برباد ہو جائے گی اور یہ کہیں کا بھی نہیں رہ جائے گا۔''

قاضی نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ جمالی عالم ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ انہیں معاف کروں اور پھر یہ کہ بھائی جمالی سے کوئی غلطی بھی تو ہوئی ہو۔''

شیخ نے اصرار کیا۔ ''قاضی! اگر معاف نہیں کرو گے تو میں جمالی کے ساتھ یہیں تمہارے در پر پڑوں گا اور اس وقت تک پڑا رہوں گا جب تک کہ تم معاف نہیں کر دو گے۔''

قاضی نے تنگ آکر کہا۔ ''اچھا جناب میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔'' اس کے بعد پوچھا۔ ''اب تو آپ خوش ہوئے اور ہمیں معاف کیا۔''

شیخ نے کہا۔ ''ہاں اب میں خوش ہوں، بے حد خوش۔''

آپ جمالی کے ساتھ گھر چلے گئے اور راستے بھر یہی سمجھاتے رہے کہ خبردار آئندہ کسی کی دل آزاری نہ کرنا۔ اگر کرو گے تو بھگتو گے۔

جمالی نے بھی وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں سرزد ہوگی۔

☆☆☆

آپ نے بیانہ بھی چھوڑ دیا اور دہلی چلے گئے۔ یہ جگہ آپ کو بہت اچھی لگی اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں آپ نے شادی بھی کر لی۔ جمالی یہاں بھی موجود رہے۔ انہیں اپنے پیر کی لمحہ بھر کی جدائی بھی گراں گزرتی تھی۔ ان دنوں گجرات میں شیخ وجیہہ الدین گجراتی کا بڑا چرچا تھا۔ ان کی بابت یہ مشہور تھا کہ صاحب کشف بزرگ ہیں۔ شیخ سماء الدین نے سوچا، چلو ان سے ملاقات کر لو چل کر۔

شیخ سماء الدین نے ایک عام اور غیر معروف آدمی کی حیثیت سے گجرات کا سفر کیا اور پوچھتے پوچھتے شیخ وجیہہ الدین کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت شیخ مذکور اپنے ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی شیخ سماء الدین کو دیکھا ادب سے کھڑے ہو گئے اور بے اختیار ان کی طرف بڑھے اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔ شیخ سماء الدین نے اس ایک سو تیس سالہ بزرگ کو سینے سے جو لگایا تو ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوئی اور سینہ طمانیت سے لبریز ہو گیا۔

شیخ سماء الدین نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے مجھ کو پہچانا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''اے دین کے آسمان تجھ کو کون نہیں پہچانے گا۔ میں تجھ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب تو اس خاکدان میں آیا بھی نہیں تھا۔''

وجیہہ الدین نے سبحان اللہ سبحان اللہ کا نعرہ لگایا اور شیخ سماء الدین کے ساتھ بیٹھ گئے۔ آخر میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے۔ پھر تو ان دونوں کی ملاقاتیں ہر روز ہی ہونے لگیں۔

ایک دن شیخ سماء الدین نے شیخ وجیہہ سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کی بابت کچھ باتیں مشہور ہیں، میں انہیں آپ کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔''

شیخ وجیہہ الدین نے پوچھا۔ ''کون سی باتیں؟'' وہ مسکرا رہے تھے۔

شیخ سماء الدین نے جواب دیا۔ ''یہ کہ آپ نے اس کوچے میں کس طرح قدم رکھا تھا؟ اور وہ کون سے غیر معمولی واقعات تھے جن کے زیر اثر آپ نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی؟''

شیخ وجیہہ الدین نے نظریں جھکا لیں۔ فرمایا۔ ''اب میں اپنے فسق و فجور کے ماضی کو کیا دہراؤں۔''

شیخ سماء الدین نے کہا۔ ''حضرت! اس میں بڑی عبرتیں ہیں۔ اگر سنا دیں گے تو میں ان سے عبرت پکڑوں گا اور ان غلطیوں سے بچ جاؤں گا جن سے آپ بچ کر نکل آئے۔''

شیخ وجیہہ الدین ذرا سی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ پھر فرمانے لگے۔ ''سماء الدین! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ملک اختیار الدین کا بیٹا ہوں اور ملک موصوف فیروز شاہ تغلق کے رشتے دار تھے۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میں

اٹھارہ سال کا ان کا واحد فرزند تھا۔ میرے باپ کی ساری جائداد میرے قبضے میں آ گئی۔ ان دنوں میرے حسن کا بڑا چرچا تھا اور میں جدھر سے بھی گزرتا، لوگ مجھ دید ہو جاتے۔ عورتیں اور لڑکیاں میری راہ روک کر کھڑی ہو جاتیں اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگتیں۔ ان دنوں میں شراب بھی بہت پیا کرتا تھا۔ عورتیں، شراب اور جوا، یہی میرے مشغلے تھے۔

ان دنوں صوفی بابو اسحاق کا بھی بڑا چرچا تھا۔ ایک دن میں اپنے گھوڑے پر سوار بابو اسحاق کی خانقاہ کے پاس سے گزرا۔ اس وقت بابو اسحاق خانقاہ کے در پر اپنے مریدوں میں گھرے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے جو دیکھا تو بولے تو کچھ بھی نہیں، بس ایک ننھا منا سا ڈھیلا اٹھا کر میرے رسید کر دیا۔ اس ڈھیلے کی چوٹ نے مجھ کو بے ہوش کر دیا اور میں اپنے گھوڑے سے گر گیا۔ بابو اسحاق میرے پاس آئے اور میرے کان میں کہا۔ ''وجیہہ! یہ فسق و فجور کب تک؟ آخر تو اس طرح کب تک بھٹکتا رہے گا، میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے یہ آواز خواب و خیال کی طرح سنی اور کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے چنانچہ جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ پر بابو اسحاق کو جھکا ہوا دیکھا۔ وہ مجھے نصیحتیں کر رہے تھے اور یہ نصیحتیں میرے دل و دماغ میں خون کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔ ''بابا! میں تائب ہوا۔ میں نے توبہ کی اور آئندہ آپ یا کوئی بھی مجھ کو فسق و فجور میں مبتلا نہیں دیکھے گا۔''

اس کے بعد انہوں نے مجھے سہارا دیا اور اپنے حجرے میں لے گئے اور اپنے کسی مرید سے پانی طلب کیا۔ تھوڑا سا پانی خود پی لیا اور بقیہ مجھے پلا دیا۔ بس یہ جھوٹا پانی مجھ میں انقلاب کا سبب بن گیا۔ مجھ کو دنیا اور مال و دولت سے نفرت سی پیدا ہو گئی۔ میں کئی دن تک ان کی خانقاہ میں پڑا رہا۔ آخر ایک دن میں نے ان سے اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔

بابو اسحاق نے پوچھا۔ ''گھر جا کر کیا کرو گے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''بابا! میں ان تمام چیزوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں، جنہوں نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔''

میں اپنے گھر گیا اور اپنا سارا مال و اسباب لا کر بابو اسحاق کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ کہا۔ ''بابا! آپ اس کو اپنے ہاتھوں سے مستحقین میں تقسیم فرما دیں۔''

بابا نے اسے تقسیم کر کے مجھے مبارک باد دی کہ اب میں اس لائق ہوں کہ مجھ پر اعتبار کیا جائے۔

شیخ سماء الدین نے اپنے بزرگ صوفی کی پُر اثر آپ بیتی سنی تو بے حد خوش ہوئے اور انہیں ان کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ شیخ وجیہہ نے کہا۔ ''بابا سماء الدین! مجھ سے زیادہ خوش قسمت تو تم ہو کہ کسی تلقین اور تبلیغ کے بغیر ہی اپنی منزلِ مراد پالی، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔''

شیخ سماء الدین نے فرمایا۔ ''یہ اللہ کا فضل ہے جس کو جتنا چاہے دے دے۔''

شیخ سماء الدین واپس دہلی پہنچے تو وہاں ایک ہجوم کو اپنا منتظر پایا۔ یہ پٹھان فرماں روا بہلول لودھی کا زمانہ تھا۔ آپ کی خانقاہ میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سلطان بہلول کے فرمان نویس شہاب خان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

آپ نے اس سے پوچھا۔ ''تو یہاں کیوں آیا ہے؟''

شہاب خان نے جواب دیا۔ ''حضور سے ملاقات کرنے، حضور کی زیارت کی خاطر۔''

آپ نے بیزاری سے فرمایا۔ ''او بدبخت تو یہاں جاسوسی اور مخبری کی خاطر آیا تھا۔ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کر ورنہ خوا مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا۔''

شہاب خان نے جواب دیا۔ ''حضرت! جو چاہیں فرما دیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں مخبری کے لائق نہیں ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بہر حال شہاب خان! اگر تو ایسا کرے گا تو بہت برا کرے گا۔''

شہاب خان آپ کے پاس کچھ دیر رہا۔ اس کے بعد اٹھ آیا۔ اس نے مخبری اور جاسوسی کے لیے ایک ایسے نوجوان کا انتخاب کر لیا کہ ادھر کسی کی نظر کسی قسم کی چغلی کھائے گی اور شہاب خان کا بیٹا اس کو لے کر اپنے باپ کے پاس چلا جایا کرے گا۔

آپ نے اس سے پوچھا۔ ''نوجوان! تیرا نام کیا ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''بندے کو محمد کہتے ہیں۔''
آپ نے منہ بنا کر کہا۔ ''تجھے یہ متبرک نام نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اس کے آگے پیچھے بھی کچھ ہونا چاہیے تھا۔''
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
ایک مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! اس کو اس کے باپ شہاب خان نے بھیجا ہے۔ فقرا کی محفل میں جاسوسوں اور مخبروں کا کیا کام؟''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، ایسا نہ کہو۔ اس کو محفل میں رہنے دو یہ ہمارا کیا لے گا۔''
جمالی نے غصے میں کہا۔ ''حضرت! یہ کوئی اچھا نوجوان نہیں ہے، میں اس کو یہاں نہیں دیکھ سکتا۔ ابھی نکال باہر کرتا ہوں۔''
آپ نے جمالی کو روکا، فرمایا۔ ''جمالی! صبر، صبر، جلد بازی اور جوش سے مت کام لے۔''
جمالی نے سوچا، ذرا دیر بعد جب شہاب خان کا بیٹا یہاں سے جانے لگے گا تو یہ باہر نکل کر اس سے وہ سب چھین لیں گے جس میں جاسوسی اور مخبری کی باتیں لکھی ہوں گی۔
آپ نے جمالی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''جمالی! اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ ایک کام سے میں نے تمہیں روک دیا تو اب اسے دوسری طرح سے کرنے کا ارادہ کیوں؟''
جمالی نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے توبہ کی اور باز آیا مگر آپ اس کو بھی تو کچھ کہیے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ہر جگہ اپنے محبوب کا طالب موجود ملے گا وہ ہوشیار ہو یا مست، اسی طرح ہر جگہ، مقامِ عشق ہے، وہ مسجد ہو یا کلیسا۔''
شہاب خان کے بیٹے محمد کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ وارفتہ واز خود رفتہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں میں گر گیا، رو رو کر بولا۔ ''حضرت! مجھے معاف کر دیجیے میں بہت شرمندہ ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''تو اپنا کام کر، میں نے تو تجھے نہیں روکا۔''
محمد نے جواب دیا۔ ''اب اور کیا کیجیے گا، میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے، ورنہ میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا اب چپ چاپ بیٹھ جا اور توبہ و استغفار کر، خدا بہتر کرے گا۔''
اس نے توبہ کی تو اسے سکون ملا، وہ یہاں سے اٹھ کر باپ کے پاس گیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ شیخ سماء الدین کا مرید ہو چکا ہے۔ اس لیے ان خدمات کی بجا آوری کی اس سے امید نہ کی جائے جو اب تک انجام دیتا رہا ہے۔ اب وہ تائب ہو چکا ہے۔
شہاب خان کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے سلطان بہلول لودھی کو بھی سماء الدین کے حلقہ بگوشوں میں دیکھا۔ آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے اور انہیں نصیحتیں فرما رہے تھے۔ اسی دوران ایک مرید باہر سے اندر داخل ہوا اور عرض کیا۔ ''سلطان بہلول لودھی اذنِ باریابی چاہتا ہے، کیا حکم ہے؟''
آپ اٹھ کر اپنے حجرے میں جاتے ہوئے بولے۔ ''اس کو میرے پاس بھیج دو۔''
کچھ دیر بعد مریدوں اور ارادت مندوں نے دیکھا۔ سلطان نہایت عاجزی و انکساری سے اندر داخل ہوا اور آپ کے حجرے میں چلا گیا۔ سلطان نے خود کو شیخ سماء الدین کے قدموں میں گرا دیا۔ لیکن آپ نے اس کو اٹھا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پوچھا۔ ''کیا بات ہے سلطان۔ تو پریشان تو نہیں؟''
سلطان نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نادم ہوں کہ اتنی قربت ہونے کے باوجود میں حضور کی خدمت میں حاضری دینے سے قاصر رہا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اس کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ پھر بھی اگر اس میں تیری کوئی منشا ہو اور تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچ

سکتا ہوتو میں حاضر ہوں۔"

سلطان نے کہا۔" حضرت! میں آپ کی شفقت اور محبت کا امیدوار ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔" عدل سے حکومت کر اور اللہ کے خوف سے دل کو آباد رکھ، پھر دیکھ اللہ تیرے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔"

سلطان نے عرض کیا۔" حضرت! میں نے یہ سن رکھا ہے کہ یہ دنیاوی حکمراں بادشاہ نہیں ہوتے اصل بادشاہ تو درویش ہوتے ہیں اور دنیا کے بادشاہ درویشوں کی صورت کے ریزہ چیں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟"

آپ نے فرمایا۔" سلطان! بادشاہ کو چاہیے کہ اگر وہ اندر سے درویش نہیں ہے تو ظاہر میں درویش کی وضع قطع اختیار کرے کیونکہ یہ وضع قطع اس کو برائیوں سے بچائے گی۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا۔" سلطان! تین قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اول وہ بوڑھا، جو بوڑھا ہونے کے باوجود گناہ آلود زندگی گزارے۔

" دوسرا وہ جوان جو توبہ پر یقین رکھتا ہو اور اس امید پر گناہ میں گرفتار ہو کہ جب چاہے گا توبہ کرلے گا اور نیک بن جائے گا۔

" تیسرا وہ بادشاہ جو اپنی ہر مراد کی حصولیابی پر قادر ہو مگر پھر بھی اپنی سلطنت کے چراغ کو جھوٹ کی آندھی سے گل کردے۔"

سلطان نے عاجزی سے عرض کیا۔" اب حضور والا اس کی وضاحت بھی فرمادیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

آپ نے فرمایا۔" میں گناہ گار بوڑھے کو حکم دوں گا اور سرزنش کروں گا کہ اے سفید بالوں والے سیاہ باطن! اس انحطاط پذیر اور روبہ زوال دور میں تو کس امید پر گناہ کررہا ہے۔ کیا تو یہ امید کرسکتا ہے کہ تیرے بڑھاپے کی دیوار کسی طرح مضبوط ہوسکے گی؟ جب یہ امید نہیں ہے تو پھر تو غفلت میں پھنس کر گناہوں کی قوت سے اس کی قوت کو کیوں کھوئے دے رہا ہے۔

" میں جوان کو اس طرح سرزنش کروں گا کہ اے غافل اور ناتجربہ کار نوجوان! موت اور زندگی کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اور موت کا کوئی وقت نہیں پھر تو اس امید میں کہ جوانی میں گناہ کرکے بڑھاپے میں توبہ کرلی جائے گی؟ بلاوجہ کیوں صحرائے معصیت میں گھوم رہا ہے۔ تو اپنے انجام پر نظر رکھ اور اس فریب میں مت جتلا رہ کہ تو واقعی کبھی بوڑھا بھی ہوگا۔

" غافل بادشاہ کو اس طرح متنبہ کیا جائے کہ اے غافل بادشاہ! جھوٹ کا تعلق اور اس کا فائدہ محض اس دنیا تک ہے۔ کام وہ کر جو آخرت میں بھی ساتھ دے، اپنے اعمال کی کھیتی میں دروغ کا بیج ڈالنے والا احمق ترین انسان ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اچانک سلطان بہلول لودھی کو مخاطب کیا۔" اے سلطان! تجھ کو بڑھاپے میں سلطنت ملی ہے اس لیے تو اپنے دل کو اللہ کے خوف سے آگاہ رکھ۔ اور حتی الامکان حد تک خدا کا شکر ادا کرتا رہ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں تمہیں زیادہ عطا کروں گا۔ برخلاف اس کے اگر تو نے غفلت اختیار کی اور گناہوں میں مشغول ہوگیا تو اس کے لیے بھی خدا کا ڈراوا موجود ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے کفر کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔"

سلطان کے دل پر آپ کی نصیحتوں کا اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ رونے لگا۔ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔" اے حضرت مخدوم! گناہوں سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی درویشوں کی محبت میرے دل میں آہستہ آہستہ ترقی کررہی ہے شاید یہی بات میری بخشش اور نجات کا سبب بن جائے۔"

شیخ کے مریدوں کو باہر بڑی بے چینی ہورہی تھی کہ اندر پیرومرشد اور سلطان بہلول میں معلوم نہیں کس قسم کی باتیں ہورہی ہیں۔ مریدوں نے ایک ساتھ آپ کے حجرے میں داخلے کا منصوبہ بنایا اور اجازت کے بعد اندر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سلطان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ اس طرح رورہا تھا کہ اس کے دونوں ہونٹ بری طرح تھرتھرا رہے تھے اور اس نے اپنی آنکھیں بند کررکھی تھیں۔

آپ نے سلطان کو حکم دیا۔" اے نیک دل سلطان! جا اور اسی طرح خشیت الٰہی سے حکومت کرتا رہ۔"

کچھ دیر بعد سلطان چلا گیا۔

جونپور کا فرماں روا سلطان حسین شرقی دہلی پر نظریں لگائے پورے ہندوستان کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سازش کا بھی سہارا لیا اور سلطان بہلول لودھی کے امرا میں سے بعض کو توڑ لیا اور یہ حرص وطمع میں سازشیں کرنے لگے۔ لودھی دربار کا امیر سلطان احمد جلوانی سازشی اور غدار امرا کا روح رواں تھا۔

ایک دن سلطان احمد جلوانی شیخ سماءالدین کی خدمت میں مؤدب کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ سبھی کے کام آتے ہیں، میری بھی مدد فرمائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سلطان احمد! تو، تو خود لودھی دربار کا اتنا بڑا امیر ہے کہ دوسروں کے کام آسکتا ہے میں تیری کیا مدد کروں۔''

سلطان احمد جلوانی نے آپ کے مریدوں کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کچھ تخلیہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر قلب میں کسی قسم کی کھوٹ نہیں ہے تو اس کا اظہار سب کے سامنے بھی ہو سکتا ہے لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔'' اس کے بعد آپ نے مریدوں کو اشارے سے حکم دیا کہ باہر چلے جائیں۔

جب بالکل تخلیہ ہو گیا تو سلطان احمد جلوانی نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں عرض کیا۔ ''حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ جونپور کا فرماں روا سلطان حسین شرقی خاصا طاقت ور اور دبدبے کا فرماں روا ہے۔ اس وقت اس کی طاقت کا کوئی دوسرا حکمراں نہیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ وہ بلا کا مردم شناس بھی ہے۔ اس نے اپنے اردگرد نہایت لائق آدمی جمع کر رکھے ہیں۔ اب اس کا ارادہ ہے کہ پورے ہندوستان پر حکومت کرے۔ اس نے لودھی دربار کے امرا کو یقین دلایا ہے کہ انہیں شایانِ شان مناصب دیے جائیں گے چنانچہ لودھی دربار کے بیشتر امرا نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سلطان حسین شرقی کی مدد کریں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ پورے ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تو اسلام کی بڑی خدمت کرے گا اور دین کے لیے جاگیریں وقف کر دے گا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''مگر تو یہ تو بتا کہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

جلوانی امیر نے جواب دیا۔ ''آپ سے سلطان حسین شرقی کے حق میں فتح ونصرت کی دعائیں۔''

آپ نے دوسرا سوال کیا۔ ''اچھا جلوانی امیر میرے ایک سوال کا اور جواب دے دے پھر میں فیصلہ کروں گا کہ تیری مدد کروں یا نہ کروں۔''

جلوانی امیر نے پوچھا۔ ''کیجیے سوال۔ میں، اللہ نے چاہا تو ضرور جواب دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بہلول لودھی نے اب تک اسلام کے خلاف کتنے کام کیے ہیں؟''

جلوانی امیر نے جواب دیا۔ ''شاید ایک بھی نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس نے کبھی کسی کو نقصان پہنچایا؟''

جلوانی نے جواب دیا۔ ''شاید نہیں، لیکن وہ ترقیاں جلدی جلدی نہیں دیتا۔ ہم لوگ کب تک اس کا انتظار کریں گے۔''

آپ نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے جلوانی امیر کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ فرمایا۔ ''سلطان احمد جلوانی! تو نے اور تیرے باپ نے لودھی دربار کا نمک کھایا ہے اس لیے اپنے آقا کے خلاف اس طرح سوچنا اور اس کے دشمن کا ساتھ دینا نمک حرامی اور غداری ہے۔ جو کسی شریف شخص کو زیب نہیں دیتی۔ جاؤ اور سلطان بہلول لودھی کا ساتھ دو کیونکہ لوحِ محفوظ میں سلطان حسین شرقی کی شکست اور بہلول لودھی کی فتح تحریر ہے پھر ایسے شخص کا ساتھ کیوں دیا جائے، جس کا خدا خود ساتھ نہیں دے رہا۔''

چنانچہ آپ بہت دیر تک جلوانی امیر کو سمجھاتے رہے اور پیش آمدہ واقعات کی خیالی اور قیاسی نظر کشی کرتے رہے، آخر میں فرمایا۔ ''جلوانی! تو یہ بات یاد رکھ کہ دور کے ڈھول سہانے، سلطان حسین شرقی تجھ سے کیے ہوئے وعدے میں سے ایک پر بھی پورا نہیں اترے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجھے اور تیرے ساتھی امیروں کو غداری کے جرم میں قتل کرا دے کیونکہ جو لوگ اپنوں کا ساتھ نہیں دیتے، ان پر دنیا کے فاتح بھی اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے میرا مخلص مشورہ یہ ہے کہ تم

سب سلطان بہلول لودھی کا ساتھ دو اور جو کچھ بھی لینا ہے اس سے لو۔''
سلطان جلوانی خاموش ہو گیا۔ آپ نے اس کو ایک بار پھر سمجھایا اور اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھادی کہ اس جنگ میں سلطان بہلول لودھی حق پر ہے اور خدا اس کے ساتھ ہے۔
چنانچہ جلوانی مان گیا اور دوسرے سازشی اور باغی امرا نے بھی جلوانی امیر کا ساتھ دیا اور آپ نے ان سب کے حق میں بڑی دعائیں کیں۔ جب تک سلطان بہلول لودھی زندہ رہا، اس کو اس سازش کا حال نہیں معلوم ہو سکا۔

☆☆☆

ایک دن آپ تخت پر بیٹھے کھچڑی کھا رہے تھے۔ اس وقت ان کے مرید خاص جمالی بھی وہاں پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں مسکرا کر دیکھا اور مزاج پرسی کی، پھر پوچھا۔ ''جمالی! میرے ساتھ کھانا پسند کرو گے؟''
جمالی نے عرض کیا۔ ''اس سے زیادہ میری خوش قسمتی کیا ہوگی کہ میں آپ کا الش کھاؤں نہ کہ یہ آپ کے ساتھ تناول کروں۔ زہے قسمت، زہے نصیب۔''
آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''میں جو کچھ کھا رہا ہوں، اگر تم بھی اسے کھاؤ گے تو اس کے لیے ریاضت درکار ہے۔''
جمالی نے جواب دیا۔ ''میں ہر قسم کی ریاضت کے لیے تیار ہوں۔''
آپ نے ایک بار پھر مسکرا کر فرمایا۔ ''جمالی! سوچ لو میں تو پابندی کی بات کر رہا ہوں۔''
جمالی نے پھر وعدہ کیا۔ ''میں وعدہ جو کر رہا ہوں ریاضت کا۔''
آپ نے کھانے میں جمالی کو شریک کر لیا۔ جمالی نے جیسے ہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا، منہ بنانے لگے۔ کچی مریضوں والی کھچڑی، پھکی بھی تھی اور بودار بھی۔ کھچڑی میں جو روغن استعمال ہوا تھا، وہ تلخ تھا جمالی نے منہ بنا کر باورچی کو آواز دی۔ ''سازوار (خانساماں) کدھر چلا گیا، ذرا ادھر تو آنا۔''
سازوار بھاگا بھاگا آیا اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ''ارشاد۔''
جمالی نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ''او بدبخت یہ کھانا تو نے پکایا ہے؟''
اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں، کیوں، کوئی خاص بات؟''
جمالی نے کہا۔ ''ذرا چکھ کر تو دیکھ۔''
اس نے جواب دیا۔ ''مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ پیر و مرشد کی اجازت کے بغیر ان کے آگے سے لقمہ لوں۔''
جمالی نے غصے میں کہا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، ذرا چکھ کے تو دیکھ۔''
شیخ سماء الدین نے مسکرا کر پوچھا۔ ''جمالی! کیا بات ہے؟ تو اتنا ناراض کیوں ہے؟''
جمالی نے کہا۔ ''حضرت! جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، آپ جانتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اس کو ڈانٹا کیوں نہیں۔ سرزنش کیوں نہیں کی۔''
آپ نے پوچھا۔ ''لیکن میں اس کو کیوں ڈانٹوں؟''
جمالی نے کہا۔ ''حضرت! اس ذلیل انسان نے کھچڑی جو پکائی ہے۔ اس کے چاول کچے ہیں اور جو روغن استعمال کیا ہے وہ تلخ ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''کیا میں نے تجھ سے یہ پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ اس.... کھانے کے لیے تجھ کو ریاضت کرنا پڑے گی۔ تو نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر یہ وعدہ خلافی کیوں؟''
جمالی نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے کون سی وعدہ خلافی کی۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''صبر و تحمل اور غصے سے مجتنب رہنا بھی عبادت ہے۔ میں نے اسی ریاضت کی تجھ سے بات کی تھی۔ اسی کا وعدہ لیا تھا۔''
جمالی نے شرم و ندامت سے سر جھکا لیا اور خانساماں سے کہا۔ ''بھائی واقعی میں نے وعدہ خلافی کی ہے اور میں بہت نادم ہوں۔ مجھ کو معاف کر دو۔''
خانساماں بہت شرمندہ تھا مگر جمالی کے عجز و اصرار نے اسے مجبور کر دیا اور اس نے معاف کر دیا۔

☆☆☆

اسی دوران جمالی کی طبیعت خراب رہنے لگی، بھوک جاتی رہی اور صحت گرنے لگی، جمالی کو کسی طبیب کی ضرورت تھی۔

ایک دن شیخ کے مرید نے جمالی کو بتایا کہ بنگال سے ایک طبیب آیا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ تمہارے مرض کا علاج کروں گا۔ جمالی نے اشتیاق ظاہر کیا کہ اس طبیب سے ملاقات کرائی جائے۔

چنانچہ اس طبیب کو جمالی سے ملوا دیا گیا۔ طبیب نے ان کا حال پوچھا اور پارے کا ذرا سا کشتہ کھانے کے لیے دیا۔ طبیب نے جمالی کو یقین دلایا۔ ”جناب پارے کا یہ ذرا سا کشتہ آپ کو تندرست و توانا کردے گا۔“

جمالی نے کہا۔ ”کیا اور کشتہ بھی مل جائے گا؟“

طبیب نے جواب دیا۔ ”اس کا اثر تو دیکھ لو اور بھی مل جائے گا مگر یوں نہیں، اگر ضرورت محسوس کی تو۔“

جمالی نے ایک ہفتے کے اندر یہ فرق محسوس کیا کہ پورے جسم میں توانائی کی لہری دوڑ گئی۔ بھوک کھل کر لگنے لگی اور صحت سنبھلنے لگی۔ جمالی نے طبیب سے دوبارہ ملاقات کی اور رازداری سے کہا۔ ”طبیب صاحب! میں سمجھتا ہوں اگر آپ مجھ کو ایک خوراک اور مرحمت فرما دیں تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

طبیب نے کہا۔ ”جناب! میں سمجھتا ہوں، بس ایک ہی خوراک کافی ہے زیادہ نقصان کر جائے گا۔“

جمالی نے کہا۔ ”اچھا تب پھر مجھ کو پھونکنے کا نسخہ ہی بتا دیجیے کیونکہ آپ اگر بنگال چلے گئے تو میں یہ نسخہ خود ہی تیار کرلوں گا۔“

طبیب نے جواب دیا۔ ”میں دو چار دن میں پارے کو پھونکنے کا عملی مظاہرہ کروں گا بس اس سے سیکھ لینا۔“

جمالی کا شوق فزوں تر ہونے لگا۔ ”اس میں دو چار دن کی کیا بات ہے، ابھی آج ہی کیوں نہیں۔“

طبیب نے کہا۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں۔ میں نسخہ لکھوا بھی دوں گا اور عملی ترکیب بھی بتا دوں گا۔“

اس بات کو کئی دن گزر گئے اور چار پانچ دن کے بعد یہ طے پایا کہ جب طبیب اپنے وطن جانے لگے تو جمالی کا کام کردے گا لیکن اس آخری دن سے پہلے ہی شیخ نے جمالی کو طلب کرلیا۔ پوچھا۔ ”جمالی! تیری طبیعت کا کیا حال ہے؟“

جمالی نے جواب دیا۔ ”بحمد اللہ بالکل صحیح ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”پھر مزید کشتے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟“

جمالی کو حیرت ہوئی کہ یہ بات پیر و مرشد کو کس طرح معلوم ہوئی کیونکہ طبیب نے یہ بات ہر ایک سے چھپائی تھی۔ یہاں تک کہ جس مرید نے طبیب کو جمالی سے ملوایا تھا، اس کو بھی کشتے کی بات نہیں معلوم تھی کیونکہ طبیب اس کا چرچا نہیں چاہتا تھا۔

جب جمالی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شیخ نے انہیں سمجھانا شروع کردیا۔ ”جمالی! تو نہیں جانتا۔ اس طبیب کا کشتہ کچا رہ جاتا ہے اس لیے اگر تو نے اس کا پھونکا ہوا کشتہ کھایا تو تیرے جسم کو سخت نقصان پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس سے نسخہ حاصل کرکے خود پھونکا تو وہ اور زیادہ کچا رہ جائے گا اور تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا جائے گا اس لیے میرا کہنا مان اور کشتوں کے چکر میں نہ پڑ۔“

جمالی نے دبی زبان میں عرض کیا۔ ”حضرت! میری صحت خراب جو رہتی ہے، اس کا میں کیا کروں؟“

آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”خدایا! میں جمالی کو بہت عزیز رکھتا ہوں یہ بیمار رہتا ہے، اس کو صحت یاب کردے، یہ پریشان رہتا ہے اس کو سکون بخش دے، خدایا! جمالی تیرا نیک بندہ ہے اور عالم بھی ہے۔ اس کے علم سے انسانوں کو فائدے پہنچتے ہیں اور آئندہ بھی پہنچتے رہیں گے۔ اس پر اپنی نظر کرم رکھ اور صحت و توانائی عطا فرما۔“

جمالی کو سخت حیرت تھی کہ آپ کی دعائیں طمانیت، سکون اور صحت و تازگی بن کر ان کے جسم و روح میں حلول کر رہی تھیں۔ جمالی نے چند دنوں کے اندر ہی خود کو بالکل صحت یاب اور توانا پایا۔

بنگالی طبیب اپنے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے جمالی سے ملنے گیا، اس نے جمالی کے چہرے پر شگفتگی اور تازگی

محسوس کی تو پوچھا۔ "کیا بات ہے جمالی! کیا میرا کشتہ اب بھی اثر دکھا رہا ہے؟"
جمالی نے جواب دیا۔ "میاں! کیسی دوا اور کہاں کا کشتہ، یہ تروتازگی اور شگفتگی حضرت پیرومرشد کی دعاؤں کے طفیل ہے، جب سے انہوں نے میرے حق میں دعا کی ہے میں بہت خوش اور صحت مند ہو رہا ہوں۔"
اس وقت بنگالی طبیب کو حضرت شیخ کے مقام اور مرتبے کا کسی قدر اندازہ ہوا، وہ حضرت شیخ کے پاس پہنچا اور ان سے درخواست کی کہ اس کے حق میں دعا فرمادیں۔
آپ نے فرمایا۔ "تو اللہ کی مخلوق کو اپنے تجربوں کی نذر نہ کر۔ جب تو ایسا ہو جائے گا کہ لوگ تیری شکایتیں نہ کر سکیں، اس وقت میں تیرے حق میں ضرور دعا کروں گا۔"
بنگالی طبیب مایوس ہو کر اپنے وطن واپس چلا گیا۔

☆☆☆

شیخ سماءالدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ جمالی حج کو جا رہے ہیں تو انہیں تاکید کر دی کہ جلدی واپس آجانا۔
جمالی حج کے لیے گئے تو ایک مدت تک ان کی خیریت ہی نہیں معلوم ہو سکی۔ شیخ سماءالدین ان کے لیے بے چین رہنے لگے۔ ادھر جمالی واپسی میں بہت پریشان ہوئے، یہاں تک کہ قافلے سے بچھڑ گئے اور ادھر ادھر بھٹکنے لگے، شہروں، ویرانوں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔
جمالی ایک دن صحرا میں کھڑے حد نظر تک پھیلے ہوئے ریت کے تودوں اور سمندر کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس پانی کا جو ذخیرہ تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ان کی وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟
جمالی نے مصلیٰ بچھایا اور سجدے میں گر کر گڑگڑائے کہ "خدایا! میں نے حج کر لیا اور مدینہ منورہ کی زیارت بھی کر لی۔ اب میں اپنے پیرومرشد کی خدمت میں پہنچنا چاہتا ہوں، میری مدد کر اور میرے دل سے خوف اور شک و شبے کو دور فرما۔"
جمالی مصلیٰ پر گرے یہ دعا کر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک گھڑسوار آیا اور ان کے پاس رک کر گھوڑے سے اترا اور جمالی کے ہاتھ میں ایک مشکیزہ تھما دیا کہا۔ "حضرت! جب تک آپ کو وافر مقدار میں پانی نہیں ملتا میرا مشکیزہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس سے کام نکالیے، پھر دیکھا جائے گا۔"
جمالی نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور بعد میں اپنی اس غلطی پر خاصے شرمندہ ہوئے کہ وہ اس شخص کا نام اور پتا نہیں معلوم کر سکے۔
جمالی نے اس مشکیزے کو دوران سفر ہمیشہ اپنے پاس رکھا مگر پھر معلوم نہیں اس کو کس نے غائب کر دیا۔ ایک مدت بعد جمالی نے سورت کی بندرگاہ پر قدم رکھا اور دہلی جانے کا منصوبہ بنایا۔ یہاں انہیں بارہا ایسا محسوس ہوا گویا وہ اپنے پیرومرشد کے پاس کھڑے ہیں اور وہ انہیں بڑی نرمی سے ڈانٹ رہے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں۔ "جمالی! کیا بات ہے؟ اتنا وقت کہاں ضائع کر دیا؟ میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔"
جمالی نے فوراً رختِ سفر باندھا اور دہلی روانہ ہوئے۔ جب وہ اپنے پیرومرشد کی خدمت میں پہنچے تو شیخ سماءالدین کے ایک بیٹے نے جمالی کو بتایا کہ ابھی چند دن پہلے والد بزرگوار آپ کو بہت یاد کر رہے تھے اور وہ دعا ان کی اجابت قبولیت کو پہنچی اور آپ یہاں آگئے۔
جمالی نے اپنا سر شیخ کے قدموں میں رکھ دیا اور کچھ دیر روتے رہے۔
اب شیخ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ جمالی کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔ "جمالی! میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ کیا تجھ کو پتا ہے کہ میں نے کیا دیکھا؟"
جمالی نے نفی میں گردن ہلا دی اور مؤدبانہ عرض کیا۔ "نہیں، کچھ بھی نہیں۔ آپ ہی بتائیں گے تو خواب کا علم ہو جائے گا۔"
شیخ نے کہا۔ "میں نے دیکھا۔ میں سلطان شمس الدین التمش کے ساتھ حوضِ شمسی کے کنارے کھڑا ہوں۔ سلطان

التمش حوض کے پاس کی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں۔

''شیخ سماء الدین! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری آخری آرام گاہ یہ ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا، آپ فرماتے ہیں تو یہی میری آرام گاہ ہوگی۔''

جمالی نے یہ خواب سنا تو انہیں رونا آگیا۔ زاروقطار رونے لگے۔ شیخ نے انہیں تسلی بھی نہیں دی۔

ایک دن شیخ نے کہا۔ ''جمالی! میرا ایک بیٹا ہے عبداللہ بیابانی۔ اس نے نوعمری میں گھربار چھوڑ دیا اور اللہ کی تلاش میں بن کی راہ لی، پتا نہیں کہ اب وہ کہاں ہوگا؟''

جمالی نے عرض کیا۔ ''پیرومرشد! اگر آپ کو اپنے بیٹے کی یاد ستا رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ..... کہ کہیں نہ کہیں وہ موجود ضرور ہے اور خیریت سے ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''جمالی! تو نہیں جانتا یہ میرا آخری زمانہ ہے پتا نہیں کب میرے مالک کا بلاوا آجائے اور میں جھکے ہوئے جواری کی طرح کچھ کہے سنے بغیر ہی اس سفر پر روانہ ہو جاؤں۔''

جمالی نے آہستہ سے کہا۔ ''پیرومرشد! آپ مایوسی کی باتیں نہ کیجیے، ابھی آپ ہم میں بہت دنوں تک رہیں گے۔ آپ اداس نہ ہوں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''جمالی! یہ ساری تسلی دلاسے کی باتیں ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔''

اس گفتگو کے بعد شیخ نے ہر کسی سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ استغراق اور محویت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک دن مغرب کی نماز پڑھ کر جمالی کو طلب کر لیا اور ان سے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ''جمالی! میرے نہ ملنے سے تو اداس تو نہیں ہوا؟''

جمالی نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! میں اداس تو بہت ہوا مگر اس میں آپ کی رضا دیکھ کر یہ اذیت بھی جھیل گیا۔''

شیخ نے کہا۔ ''اچھا اب کہیں نہ جانا۔ پتا نہیں کب جدائی کی گھڑی آجائے۔''

جمالی کو رونا آگیا۔ لیکن شیخ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر عشا سے پہلے اٹھے اور جمالی سے کہا۔ ''جمالی! میں وضو کرنا چاہتا ہوں۔''

جمالی نے عرض کیا۔ ''حضرت! مغرب کا وضو تو آپ کر چکے ہیں۔ کیا وہ کافی نہیں ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں۔ میں نے دستور بنا لیا ہے کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضرور کرلوں، چنانچہ اس پر میں بڑی سختی سے عمل کر رہا ہوں۔''

عشا کی نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ اپنے بستر پر لیٹ گئے اور جمالی سے کہا۔ ''جمالی! تو میں چلا، میرا وقت پورا ہو چکا اور وہ خالق حقیقی میرا منتظر ہے۔''

جمالی نے کچھ کہنے کے لیے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ شیخ کی روح پرواز کر گئی۔

وصال کی خبر آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی اور لوگوں کے پرے کے پرے آنے لگے۔ جنازے میں دور دور تک سر ہی سر نظر آرہے تھے اور جمالی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ شیخ کو حوضِ شمسی کے قریب وہیں دفن کیا گیا جس جگہ کو وہ سلطان التمش کے ساتھ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔

جمالی نے ان کی تاریخ وصال کہی

مرشد انس و ملک شاہ سماء الدین چو رفت
اے جمالی بر سر عرش آمد گام او
ہشت خلد آمد بنام او اگر پرسد کے
سال تاریخش بگو (ہشت) آمدہ بر نام او
۷۰۵+۱۹۶=۹۰۱ھ



اذکار ابرار، محمد غوثی شطاری۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع۔ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی۔ حضرت بوعلی قلندر، اقبال صلاح الدین

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے

آگرے کا مجذوب — روشن چراغ دہلی

اشرف الاولیاء — سرخ شمشیر

امام ابوالعباس — سرمد شہد

جہانیاں جہاں گشت — سید عبداللہ ولی

چوتھے قیوم — سیدی مولہ

حکیم الاولیاء — شمع صوفیاں

خلیفہ ابوالقاسم — شیخ المشائخ

دیو محل کا قلندر — شیخ سماء الدین